سنسنی خیز موضوعات پر دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

۸
۱۸ رات کی بات
۳۰ آخری سین
۴۶ صدیوں کا بنیا
۶۹ بے گور و کفن
۸۳ گمشدہ رات
۹۶
ٹیلیوژن
معیاری انٹرنیشنل
کوالٹی
آسان کنٹرول
۲۰
ریڈیو اینڈ جنرل اپلائنسز لمیٹڈ

کراچی میں گزشتہ دنوں کے دوران ٹریفک کے پے در پے جان لیوا حادثات پیش آئے اور ان پر بعض حلقوں کی طرف سے جو اشتعال پسند ردِعمل ہوا، ان سے ہر دردمند اور امن پسند شہری متوحش ہو گیا ہوگا۔

حادثات کی وجوہ اور نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن خبریں جس انداز سے پھیلتی یا بسا اوقات اخبارات میں چھپتی ہیں، اس سے حادثے کے ذمہ دار افراد کی بے حسی زیادہ اور احتجاج کرنے والوں کی زیادتی کم نظر آتی ہے۔ ہر چند دونوں ہی باتیں ناقابلِ برداشت ہیں۔ ایک طالبہ بس سے اترتے ہوئے گر گئی اور بس کے پہیوں نے اسے روند ڈالا۔ ایک اسکوٹر سوار دو تیز رفتار بسوں کے درمیان پس گیا اور کچلا گیا۔ اسی طرح بسوں اور منی بسوں کی وجہ سے جان جانے کے واقعات شب و روز پیش آتے ہیں۔

راہگیر یا حادثے کا شکار ہونے والوں سے متعلقہ افراد المیہ کا ایک ہی پہلو دیکھتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک انسان دوسرے انسان کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن گیا۔ وہ اسے اس دوسرے انسان کی سنگدلی اور سفاکی سمجھتے ہیں۔ ان کی انسانی ہمدردی جاگ اٹھتی ہے اور وہ اس انسان کو سزا کا مستحق سمجھتے ہیں یہاں تک تو بات بڑی حد تک جائز اور مناسب نظر آتی ہے کہ کسی فرد کو لاپروائی، غفلت اور بے حسی سے کسی دوسرے فرد کی جان لینے کا حق نہیں ہے قصوروار کو سزا ملنی چاہیے۔ انسانی ہمدردی ایک فعال معاشرے کے لئے لازمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک فرد یا افراد کو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہ کوئی معاشرہ دیتا ہے، نہ ملکی قانون۔ انسانی ہمدردی بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

ایک بس ڈرائیور کی لاپروائی، سنگدلی یا انسان دشمنی ہی کہہ لیجیے، کی یہ کیا سزا ہوئی کہ بس پر پتھراؤ کر کے دوسرے بے گناہ انسانوں کے سر پھوڑ دیئے جائیں۔ بلا امتیاز کہ ان میں خواتین بھی ہوں اور بچے بھی۔ یا اس بس کو نذرِ آتش کر دیا جائے جس سے بس کے ناکردہ گناہ مالک کی پونجی راکھ ہو جائے! اس اشتعال انگیز ردِعمل سے بس ڈرائیور کو سزا ملی تو ملی، بعض اوقات وہ جان بچا کر بھاگ بھی نکلتا ہے، لیکن گیہوں کے ساتھ گھن بھی تو پس گیا۔ یہ کیسی انسانی ہمدردی! کیسا احتجاج ہے۔؟

سوچنے کی بات ہے کہ ردِعمل کے طور پر احتجاج، اشتعال اور قانون شکنی کا رُخ کیوں اختیار کر لیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ لوگ خواہ مخواہ چلتی بسوں پر پتھراؤ تو شروع نہیں کر دیتے یا محض دل لگی کے طور پر کسی بس کو جلا نہیں دیتے یا یوں ہی شوقیہ طور پر کسی بس ڈرائیور یا کنڈکٹر کو زدوکوب کرنا شروع نہیں کر دیتے۔ آخر ان باتوں کی بنیاد کچھ تو ہوتی ہے! یہ ناپسندیدہ اقدامات کسی ناپسندیدہ حرکت کا ردِعمل ہوتے ہیں! بنیاد یہی ہے کہ ڈرائیور حضرات ٹریفک کے قواعد اور اصولوں کو پرِکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ سڑک پر اپنی من مانی کرتے ہیں، انسان کو کیڑے مکوڑوں کے برابر سمجھتے ہیں۔ ملکی قوانین کا احترام نہیں کرتے۔ تیز رفتاری کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ نشہ کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ضرورت ان باتوں کا سدِباب کرنے کی ہے اور اس سلسلے میں واحد مشینری ٹریفک پولیس ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ٹریفک پولیس بھی ڈرائیوروں کو بے جا تنگ کرنے اور ان سے رشوت لینے کے لئے بدنام ہے، اور پھر یہ بھی تو ہے کہ پولیس والوں کی اپنی بسیں اور منی بسیں وغیرہ ہیں جن کے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ ہے۔

دراصل یہی باتیں لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہیں۔ جب وہ کسی بس پر پتھراؤ کرتے یا اسے آگ لگاتے ہیں تو ان کے تصور میں محض ایک بس یا ایک بس ڈرائیور نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک طبقہ ہوتا ہے جسے وہ انسانی دشمن، بالادست، منافع خور، راشی، نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ اس طبقے کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور غم و غصے کا زہر پنپتا رہتا ہے اور نکاسی کا متلاشی رہتا ہے۔ جوں ہی کوئی اندوہناک واقعہ پیش آتا یا زہرہ گداز سانحہ ہوتا ہے، یہ زہر لاوا بن کر پھوٹ نکلتا ہے۔ افہام و تفہیم کے معنی سمجھ بوجھ کی لغت سے یکسر خارج ہو جاتے ہیں اور انسان، انسان نہیں رہتا۔ وحشی درندہ بن جاتا ہے۔

ان ہی افہام و تفہیم کے معنی کو سمجھ بوجھ کی لغت میں برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس کی ذمہ داری ارباب اختیار پر زیادہ اور عوام الناس پر کم آتی ہے۔ ٹریفک کے اصولوں اور قوانین کا احترام ہر قیمت پر کروانے کی اشد ضرورت ہے اور یہ کام ارباب اختیار کا ہے عوام کا نہیں۔ عوام تو بہرحال۔ عوام ہی ہیں۔

سکون کے تاجر — شگفتہ صدیقی — ۸۵

قبر کا سوداگر — ۸۹

آخری گواہ — ۹۶

واپسی کے بعد — ساجدہ سراج — ۱۰۰

دریا برد — منصور — ۱۱۰

مفرور — ۱۱۴

قناعت پسند — ۱۲۸

قتل

کے ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے اپنے آبائی قصبے ڈنیکر جانا پڑا۔ ایک دولت مند ڈاکٹر کی بیوی اور اس کے بوائے فرینڈ نے مل کر ایک شکاری حادثے کی آڑ میں ڈاکٹر کو قتل کر دیا تھا مگر ان کی حماقت کی وجہ سے حادثے کی آڑ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور انہیں پولیس نے قتل عمد کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ وہ چاہتے تھے (اور اس حیثیت میں سبھی تھے) کہ اسٹیٹ کا سب سے بہترین فوجداری وکیل ان کی طرف سے صفائی کے لئے پیش ہو۔ چنانچہ انھوں نے میری۔ راجر اسپنسر کی خدمات اس سلسلے میں حاصل کریں۔ میری فیس بہت زیادہ تھی لیکن یہ وجہ نہیں تھی۔ مجھے صرف اپنی ریاست ہی میں نہیں پورے امریکہ میں شہرت حاصل تھی۔ چونکہ وہ واقعی مجرم تھے اس لئے انہیں ایک ایسے وکیل صفائی کی ضرورت تھی جو کمرہ عدالت میں قانونی معجزہ دکھا سکے اور شاید یہ کام میں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایک طویل مدت کے بعد ڈنیکر کا رخ کرنا پڑا۔

ڈنیکر گزشتہ تیس سال میں... جبکہ میں وہاں سے رخصت ہوا تھا بہت ہی کم تبدیل ہوا تھا۔ میں اپنی نئی کار میں قصبے میں داخل ہوا اور اس کی مین اسٹریٹ پر آہستہ رفتار سے چلنے لگا۔ اس سڑک سے میرے بچپن کی ہزاروں یادیں وابستہ تھیں۔ بوڑھے ہیسٹر کی دواؤں کی دکان اب ایک شاندار ڈرگ اسٹور میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بیجو کے اسٹور کا بیرونی حصہ دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا اور اب اس کا نام بھی بدل دیا گیا تھا لیکن ان چند تبدیلیوں کے علاوہ باقی دکانوں کی حالت تقریباً وہی کسمپرسی والی تھی جو میرے بچپن کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کے باشندوں کو جینے کی کوئی خاص امنگ نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی اداسی اور گہری پژمردگی نے پورے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور سدا کے لئے ڈیرہ جما کر بیٹھ گئی ہے۔ مجھے یہ عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ اگر میں اس وقت باربر شاپ میں جھانک کر دیکھوں تو شاید وہاں دیوار پر ۱۹۳۰ء کا کیلنڈر لٹکا ہوا نظر آئے گا۔

پھر جب میں اس موڑ سے گزرا جہاں فرسٹ نیشنل بینک ہوا کرتا تھا (اب بھی تھا) تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہیں بہت دور سے بنجو بجانے کی آواز آ رہی ہے لیکن وہ آواز میری یادداشت کی صدائے بازگشت تھی کیونکہ یہ ڈ موڑ تھا جہاں بوڑھا مسٹر بنجو ایک لکڑی کے بکس پر بیٹھ کر ڈمی اور نکل (امریکی سکے) کے بدلے بینا بنجو سنایا کرتا تھا۔ ان تمام برسوں کے بعد بھی میں اپنے تصور میں اسے بہت واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا بوڑھا اور اندھا آدمی تھا۔ جس کے ساتھ اس کا وفادار کتا ریسکل بھی بکس کے پاس پڑا رہتا تھا۔ دفعتاً ان پرانی یادوں نے میرے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ میں نے کانپتے ہوئے کار کی رفتار کچھ تیز کر دی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے بنجو کی آواز سڑک کے آخر تک میرا پیچھا کرتی رہی۔ میں نے کار اس نئے ہوٹل کے سامنے روک دی جہاں میں نے فون کر کے اپنی روانگی سے پہلے ہی ایک کمرہ ریزرو کرا لیا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں بے حد مصروف رہا۔ اپنے موکلان اور ان کے مقامی وکیل صفائی سے ملاقاتیں کرتا رہا اور مقدمے کی سماعت کے پہلے دن جس دن جیوری کا انتخاب ہونا تھا... کے بارے میں صلاح مشورے کرتا رہا۔ سہ پہر کے تقریباً چار بجے میں کورٹ ہاؤس سے باہر آ رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی میری طرف بڑھا۔ "مسٹر اسپنسر... راجر... مجھے پہچانتے ہو؟"

میں نے اپنے چہرے پر پیشہ ورانہ... تعلقات عامہ والی مسکراہٹ پیدا کی۔ "کیوں نہیں... میرا خیال تو ہے... ذرا مجھے سوچنے دو..." (حقیقت یہ تھی کہ مجھے اپنی یادداشت میں کہیں دور دور تک اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی)۔

"مجھے ڈک فریزر کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے... کہ... کہ ہم سب ہی اتنے بدل چکے ہیں کہ پہلی نظر میں پہچاننا خاصا مشکل کام ہے۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ جیسے وہ میرے نہ پہچاننے پر شرمندگی محسوس کر رہا ہو۔

دفعتاً میرے ذہن میں پرانی یادوں کا ایک سیلاب سا امنڈ پڑا۔ مجھے اپنے رگ و پے میں ایک سنسنی سی محسوس ہوئی اور میں نے اپنے سامنے کھڑے ادھیڑ عمر شخص کو پہچان لیا۔

"ارے... ڈک تم؟ اب مجھے یاد آ گیا۔" میں نے گرمجوشی سے کہا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ "ہم لوگ بچپن میں گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔ اور اسکول سے چھٹی لینے کے بعد جنگلی بطوں اور خرگوشوں کا شکار کرتے پھرتے تھے۔"

"ہمیں شکار کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں غذائی اشیاء مشکل سے

اطہر ندیم

• معجزہ دکھانے والے ایک ذہین اور ایک آنکھ سے محروم وکیل کا فکر انگیز قصہ

ہاتھ آتی تھیں: اس نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ یاد ہے کہ گلہریاں اور خرگوش ہی نہیں بلکہ ہم سانپ بھی پکڑ کر انہیں فروخت کیا کرتے تھے۔

"اب ان دنوں کی یاد مت دلاؤ۔" میں نے کچھ کانپتے ہوئے کہا۔ جیسا کہ تم نے کہا اس زمانے میں روپیہ بڑی محنت کے بعد کمایا جاتا تھا۔ تو تم اب بھی یہیں رہتے ہو؟"

"ہاں۔ میں قصبے کا اخبار نکالتا ہوں۔ جو اب بھی ہمیشہ کی طرح ہفت وار شائع ہوتا ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد مجھے ہی اخبار کا کام سنبھالنا پڑا۔ سنو، کیا تمہارے پاس چند منٹ کا وقت ہے کہ میرے ساتھ کافی پی سکو۔ میں اس ہفتے کے ایڈیشن کے لئے تمہارے بارے میں ایک مضمون شائع کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اپنے بچپن کے دوست ڈک فریزر کے لئے اتنا تو کر ہی سکتا تھا۔ پورے قصبے میں وہ میرا واحد دوست تھا جس کے ساتھ میرا بیشتر وقت گزرتا تھا۔ میں قصبے سے اس طرح رخصت ہوا تھا کہ اپنے باپ کی تدفین کے وقت بھی واپس نہیں آیا تھا۔ والد کی بہن، میری پھوپھی سنتھیا نے تار کے ذریعے مجھے انتقال کی اطلاع دی تھی۔ "آج رات گیارہ بجے تمہارے والد کا انتقال ہوگیا۔" اور اس وقت میرا دل یہ تیار چاہتا تھا کہ واپس جواب میں لکھوں: "تو پھر میں کیا کر دوں؟" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب اپنے ضمیر کے معاملے میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے قصبے کے تجہیز و تدفین کرنے والے ادارے کو کئی ہزار ڈالر بھیج دیئے۔ اور انہیں لکھ دیا کہ وہ میرے والد کی تدفین بہترین انداز میں کر دیں۔ میں نے صرف ایک ہی شرط عائد کی تھی کہ میرے والد کی لاش کے ساتھ قبر میں سستی قسم کی بربن شراب کی ایک بوتل بھی رکھ دی جائے۔"

شاید کیفے میں کافی پیتے ہوئے ڈک نے کہا۔

"راجر، میرا خیال ہے کہ میں تمہارے بارے میں جو مضمون لکھنے والا ہوں، ایک حد تک تم بھی اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیا ہوگا۔ اس میں قصبے کے ایک نوجوان کی حیثیت سے تمہاری ترقی و کامیابی کا ذکر ہوگا۔ کیونکہ ہمارے اسکول کے تمام طلبا میں صرف تم ہی اتنے سمجھ دار ثابت ہوئے جس نے اس قصبے کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر زندگی کے وسیع میدان میں جدوجہد کر کے ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔ تمہیں کیٹی لوری یاد ہے۔ وہ لڑکی جو ہماری کلاس میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ ایک نہ ایک دن وہ براڈوے کی ممتاز ترین اسٹار بنے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی یہیں رہتی ہے۔ اور اس نے بچوں کو ڈانس سکھانے کے لئے ایک معمولی سا اسٹوڈیو قائم کر لیا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ناکارہ شوہر سیسل بلفورڈ کی پرورش بھی کر رہی ہے جو کبھی ہماری فٹ بال ٹیم کا کپتان ہوا کرتا تھا اور آج کل ایک سروس اسٹیشن کھول کر اپنی بیوی کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پرانے ساتھیوں میں سے کئی لوگ مر چکے ہیں....."

میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان سب کے مقابلے میں، جن کا مستقبل ان کے بچپن یا جوانی کے دور میں بڑا شاندار نظر آتا تھا، میں راجر اسپینسر جو کہ قصبے کے بدنام ترین شرابی کا بیٹا تھا، جس کی کامیابی کی توقع کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر کار میں ہی کامیاب ثابت ہوا جبکہ دوسرے تمام لوگ ناکام رہ گئے۔ لیکن شاید اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ زندگی اسی کا نام ہے اور یہاں کبھی کبھی ایسی بظاہر ناممکن باتیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔

ہم نے اپنی کافی ختم کی۔ درمیان میں بہت سی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ڈک اپنے مضمون کے لیے مختلف پوائنٹ نوٹ کرتا رہا لیکن ظاہر ہے کہ وہ وہی کہانی شائع کر سکتا تھا جو میں نے اسے بتائی تھی۔ اصل حقیقت جو کچھ بھی تھی اسے میرے اور دو تین دوسرے لوگوں کے علاوہ، جو اب مر کھپ گئے تھے، کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ میری زندگی کا وہ راز تھا جسے میں نے اپنی بیوی ایلین سے بھی پوشیدہ رکھا تھا۔

ہم دونوں کیفے سے ایک ساتھ باہر آئے اور اس پارکنگ پلاٹ کی طرف چلے جہاں میں نے اپنی کار پارک کی تھی۔ راستے میں ہم فرسٹ نیشنل بینک کے موڑ سے بھی گزرے۔

"اے راجر۔" ڈک اچانک بولا۔ "تمہیں وہ بوڑھا اندھا فقیر بھی یاد ہے۔ جو یہاں موڑ پر بینجو بجایا کرتا تھا؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے اپنی کار کی طرف جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت اچھی طرح یاد ہے۔"

"ہم لوگ اسے مسٹر بینجو کہا کرتے تھے۔" ڈک نے کہا۔ "وہ برسوں تک اس موڑ کی رونق کا مستقل حصہ بنا رہا اور تمہیں یاد ہے کہ پتہ نہیں کس نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ وہ ان کنجوس لوگوں میں سے ایک ہے جو بظاہر پھٹے پرانے کپڑے پہنے بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر حقیقت میں بہت مالدار ہوتے ہیں۔ اور اس بوڑھے فقیر نے بھی اپنی کثیر دولت اپنی جھونپڑی میں کہیں چھپا رکھی ہے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"کیا تم یقین کرو گے کہ اس کے غائب ہونے کے برسوں بعد تک قصبے کے کئی لوگ اس خزانے کی تلاش میں اس کی جھونپڑی کے چکر لگاتے رہے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ اور آتا بھی کیسے جبکہ وہ غریب ان پھٹے پرانے کپڑوں کے علاوہ جو اس کے جسم پر ہوتے تھے اپنے پاس کوئی چیز نہیں رکھتا تھا۔ مگر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آخر بوڑھے اندھے فقیر کا کیا انجام ہوا۔ جس طرح وہ ایک دن قصبے سے اس طرح غائب ہوگیا جیسے کبھی یہاں موجود ہی نہیں تھا۔"

"اچھا ڈک اب میں چلتا ہوں۔" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "مجھے ہوٹل پہنچ کر مقدمے کے کاغذات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اتنے برسوں بعد تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"میری طرف سے بھی یہی سمجھ لو۔" ڈک نے کار کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تمہاری کامیابی پر بڑی مسرت ہے۔ ایک مرتبہ پھر مبارکباد قبول کرو۔"

اس نے یہ بات بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہاں بہت سے لوگوں میں سے ایک ہے جو زندگی چونک کر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں اور

انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کا نصف سے زیادہ سفر طے کر چکے ہیں اور اب بہرحال اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا ہے کہ انھوں نے اپنی جوانی میں مستقبل کے جو خواب دیکھے تھے زندگی نے ان کی کوئی اچھی تعبیر پیش نہیں کی۔

"یہ سب کچھ انسان کی قسمت اور ان بہتر مواقع پر منحصر ہوتا ہے جو زندگی اسے دیتی ہے۔" میں نے کہا۔ اور یہ بالکل سچ تھا۔ میں محض اتفاق سے ان افراد میں شامل تھا جن پر قسمت مہربان ہو گئی تھی اور کوئی بات نہیں تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور میں کار چلاتے ہوئے پارکنگ پلاٹ سے باہر نکل آیا۔ ڈک اور میں بچپن میں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن یہ تیس چالیس سال پہلے کی بات تھی۔ اب اتنی مدت گزر جانے کے بعد کوئی ایسی بات نہیں تھی جو ہمارے درمیان مشترک ہوتی اور مجھے احساس تھا کہ اب میں شاید اس سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔ میں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ ماضی کو جہاں وہ ہے وہیں چھوڑ دینا چاہیے۔

میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ایک قد آدم شیشے میں مجھے میرا عکس نظر آیا۔ ایک ایسے آدمی کا عکس جو اب بھی وجیہہ اور خوبصورت تھا جس کے بال اگرچہ کنپٹیوں کے پاس سے سفید ہو چلے تھے۔ لیکن جو ایک ایسے صحت مند جسم کا مالک تھا جسے شہر کے بہترین جمنازیم میں جسمانی خوبصورتی اور تندرستی بحال رکھنے کی سہولت حاصل تھی جو اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے باقاعدہ گولف کھیلا کرتا تھا۔

میں نے اپنا قیمتی سوٹ اتارا۔ اپنے درآمد شدہ اطالوی جوتے اتارے، کلائی سے وہ قیمتی رسٹ واچ کھولی جس کے بارے میں گارنٹی دی گئی تھی کہ وہ دس سال میں دو سیکنڈ سے زیادہ تیز یا سست نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے ڈریسنگ ٹیبل پر اپنی بیوی ایلین اور اپنی اکلوتی بچی کی تصویروں کے پاس رکھ دیا۔ یہ تصویریں ہر سفر میں میرے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ پھر میں نے اپنے لئے ایک ڈرنک تیار کی اور فیتا اور انڈر ویئر پہنے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں اپنے ساتھ اپنا بینجو بھی لایا تھا۔ میں نے اسے کیس سے نکال کر یونہی اس کے تاروں کو چھیڑا۔ بینجو بجانا گذشتہ کئی سال سے میرا محبوب مشغلہ تھا۔ جسے میں کبھی کبھی کسی خیراتی تقریب میں بھی بجایا کرتا تھا۔ میں نے تجربے سے معلوم کیا تھا کہ اپنے پیشے سے متعلق ذہنی الجھنوں اور دماغی پریشانیوں کو دور کرنے میں بینجو ایک بہترین علاج ثابت ہوتا تھا۔

لیکن اس وقت اپنے آبائی قصبے کے ایک ہوٹل میں بستر پر بیٹھ کر یہ بینجو میرے ذہن میں بہت سی دھندلی یادوں کو اجاگر کرتا چلا گیا۔

اب سے تیس برس پہلے وِنسٹر کے قصبے میں زندگی گزارنا کس قدر مشکل تھا۔ مگر ہر نوعمر لڑکے اپنے اپنے طور پر زندگی سے کچھ مسرت بخش لمحات چرا لیا کرتے تھے۔ میرا سب سے قیمتی خزانہ ایک سنگل شاٹ کی ہوائی رائفل تھی۔ معلوم نہیں کس طرح اور کیسے ایک کرسمس کے موقع پر میرے شرابی باپ کو اتنا ہوش باقی رہ گیا تھا کہ اس نے مجھے یہ رائفل کرسمس کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ میرے شرابی باپ کا بیشتر وقت کسی نہ کسی شراب خانے میں گزرتا تھا جبکہ میں قصبے اور آس پاس کے دیہاتوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ جیسا کہ ڈک نے کہا تھا ہم اپنا زیادہ وقت دریا کے قریب گلہریوں اور خرگوشوں کا شکار کرنے میں بسر کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں نے چھوٹے پیمانے پر سانپوں کو پکڑنے اور انہیں لیبارٹری کے ایک کارخانے کے ہاتھ بیچنے کا کام شروع کر دیا تھا جو سربند ڈبوں میں گوشت فراہم کرتی تھی۔

اس آمدنی سے مجھے اپنی رائفل کے لئے چھرے اور اپنے لئے کپڑے خریدنے کی آسانی حاصل ہو جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اسکول کی پڑھائی بھی جاری تھی۔ اور اگرچہ شکار کے سلسلے میں مجھے اسکول سے ناغے بھی کرنا پڑتے تھے لیکن مجھے اپنی ماں کی طرف سے بہترین دماغ اور ذہانت ورثے میں ملی تھی۔ جو کہ مجھے چار سال کا چھوڑ کر دوسرے جہاں کو سدھار چکی تھیں۔ میں اسکول کی پڑھائی کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھا کرتا تھا اور اس لئے زیادہ تر وقت کھیل کود میں گزارنے کے باوجود ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔

مجھے موسیقی کا شوق اس اندھے فقیر کو دیکھ کر ہوا تھا جسے ہم لوگ مسٹر بینجو کہا کرتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ کسی سے سنا تھا کہ اس کا آخری نام جونس تھا۔ چنانچہ میں اسے بینجو جونس ہی کہتا تھا۔ مجھے کبھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصلی نام کیا تھا اور نہ کبھی اس نے مجھے بتایا۔ غالباً خود اسے بھی اپنا نام معلوم نہیں تھا۔ وہ قصبے سے باہر ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور روزانہ صبح کو بینک کے سامنے آکر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بینجو ہوتا تھا یا پھر اس کا کتا رسیکل جس کی رسی پکڑ کر وہ راستہ چلا کرتا تھا۔

بہت سے لڑکے جن میں ڈک اور میں بھی شامل تھا مسٹر بجو کی موسیقی کے بہت دلدادہ تھے۔ ہم لوگ اکثر اسکول سے واپس گھروں کو جاتے ہوئے بینک کے پاس رک جاتے تھے اور اسے اپنا بجو بجاتے سنا کرتے تھے اس کے لیے ہمیں صرف اتنا کرنا ہوتا کہ اس کے سامنے کے ڈبے میں ایک سکہ ڈال دیں۔ سکہ گرنے کی آواز سنتے ہی وہ اپنا بجو بجانا شروع کر دیتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے ریسٹورنٹ وغیرہ میں گراموفون رکھا ہوتا ہے اور لوگ اس کی مشین میں مقررہ سکہ ڈال کر اپنے پسندیدہ ریکارڈ سنتے ہیں۔ اگر کبھی اتفاق سے ہمارے پاس کوئی سکہ نہیں ہوتا تھا تو ہم اس کے ڈبے میں لوہے کا کوئی واشر وغیرہ پھینک دیا کرتے تھے۔ اور اندھا ہونے کی وجہ سے اسے ہماری اس شرارت کا علم نہیں ہوتا تھا اور وہ بجو بجانے لگتا تھا۔ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی بجو بجانا پسند کرتا ہے۔ ہر مرتبہ ڈرامائی محویت اور اس شغف کے ساتھ بجو بجاتا تھا جیسے ہم لڑکوں کے سامنے نہیں بلکہ کسی تھیٹر کے اسٹیج پر اپنے فن کا کمال دکھا رہا ہو۔

اس طرح رفتہ رفتہ بوڑھے بجو سے میری دوستی ہو گئی۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ہم دونوں ہی قصبے کے اچھوت یا یوں کہنا چاہیے کہ ذات برادری سے باہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ ایک فقیر تھا اور میں قصبے کے ایک رسوا زمانہ شرابی کا بیٹا تھا۔ قصبے کے بہت سے اچھے گھرانوں کے بچے جن میں کیٹی لوری بھی شامل تھی اور جس سے میں بے حد محبت کرتا تھا، مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے جہاں تک اندھے فقیر بجو کا تعلق ہے تو پورا قصبہ غالباً اس کے اندھے ہونے کی وجہ سے رحم کھاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اسے برداشت کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں ہر دیہات اور ہر قصبے میں ایک فقیر ضرور ہوتا تھا اور بجو ہمارے قصبے کا فقیر تھا۔

چونکہ میں اپنی رائفل لیے اکثر قصبے سے باہر کھیتوں اور میدانوں میں گھومتا رہتا تھا اس لیے کبھی گھومتے گھومتے قصبے کے کوڑا گھر کے قریب سے بھی گزرتا تھا جہاں سے کچھ ہی فاصلے پر بجو کی جھونپڑی تھی۔ کبھی کبھی اتوار کے دن جبکہ وہ قصبے جانے کے بجائے اپنی جھونپڑی میں ہوتا تھا، میری اس سے ملاقات ہو جاتی تھی وہ عموماً جھونپڑی کے باہر اپنے کتے رسیکل کے ساتھ باہر بیٹھا ملتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ میں تقریباً ہر اتوار کو باقاعدہ اس کی جھونپڑی جانے لگا۔ وہ ایک عجیب و غریب بوڑھا تھا۔ مجھے کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن بھی درست نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی باتیں پسند تھیں۔ وہ قصبے کے لوگوں سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا جس کی وجہ میرے نزدیک غالباً یہ تھی کہ وہ لوگوں سے خوفزدہ بھی تھا اور ان سے مشکوک بھی رہتا تھا لیکن وہ مجھ پر پورا اعتماد کرتا تھا گھنٹوں بیٹھا ہوا مجھے مختلف کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ڈیکر آنے سے پہلے پوری ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں گھوم پھر چکا ہے۔ وہ اکثر سان فرانسسکو، نیو آرلینز، میمفس جیسے بڑے شہروں کی باتیں سناتا تھا اور میرے جیسے لڑکے کے لیے جس نے کبھی اپنے قصبے سے باہر قدم نہ نکالا ہو، باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں خواہ ان میں بیشتر جھوٹ کی آمیزش ہی کیوں نہ ہو۔ اور میرا خیال ہے کہ شاید بوڑھے بجو کی زبانی یہ

کہانیاں سن سن کر ہی میرے دل میں یہ خیال بلکہ شوق پیدا ہوا تھا کہ میں بھی ڈیکر کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر دوسرے شہروں اور ملکوں کی سیر کروں۔

مجھے آج جو کچھ موسیقی کے بارے میں معلوم ہے یا آتا ہے، یہ سب بوڑھے بجو نے ہی مجھے سکھایا تھا۔ وہ میری انگلیاں اپنے پرانے ساز کے تاروں پر رکھ کر مجھے ان کے بارے میں بتاتا تھا کہ کس طرح انہیں چھیڑنے سے مختلف سُر اور مختلف گیت پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خود مجھے بھی فطری طور پر موسیقی سے لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بہت تھوڑی مدت میں اس کا بجو بجانا سیکھ لیا۔ اور غالباً وہ اس وقت تک مجھے اتنا پسند کرنے لگا تھا کہ مجھے اپنا ساز بجانے کے لیے دے دیتا تھا کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے کبھی میرے علاوہ کسی اور کو اپنے بجو کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون احمق تھا جس نے اس افواہ کو پھیلایا تھا کہ بوڑھا بجو اپنی جھونپڑی میں کوئی خزانہ چھپائے بیٹھا ہے۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ دور اتنا سخت تھا کہ لوگ روپے پیسے سے اتنے محتاج تھے کہ اس طرح کی کہانیوں پر یقین کرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ یہ افواہ غالباً اس وقت شروع ہوئی تھی جب کسی نے اخبار میں ایک گداگر کے بارے میں یہ خبر پڑھی کہ جب اس کا انتقال ہوا تو پولیس کو اس کے گھر میں بچھی ہوئی چٹائی کے نیچے ہزاروں ڈالر چھپے ہوئے ملے۔ ویسے اس طرح کی باتیں کبھی کبھی سچ بھی ہو کر رہتی تھیں۔ کئی لوگ ایسا اتنے کنجوس واقع ہوتے تھے کہ ساری زندگی پھٹے پرانے کپڑوں میں موٹا جھوٹا کھا کر گزارہ کیا کرتے تھے اور اس طرح ایک ایک پینی بچاتے تھے اور کسی محفوظ جگہ اس رقم کو جمع کرتے رہتے تھے کیونکہ انہیں اس زمانے کے بینکوں پر اعتماد نہیں تھا۔

البتہ بوڑھے بجو کے بارے میں یہ سوچنا حماقت ہی تھی کہ اس کے پاس اپنے کتے، اپنے پسندیدہ ساز اور اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا لیکن میں اکثر اس قسم کی افواہیں سنتا رہتا تھا۔ خاص طور سے قصبے کے باربر کی دکان میں ایسے لوگ جن کے پاس سوائے دوسروں کے بارے میں اندازے لگانے اور افواہیں پھیلانے کے کوئی اور کام نہیں ہوتا تھا بوڑھے بجو کی دولت کے متعلق بھی قیاس آرائیاں کرتے رہتے تھے اور قصبے میں اس بات کو ایک کھیل جیسی حیثیت حاصل ہو گئی تھی کہ آخر اس اندھے فقیر کے پاس کتنی رقم جمع ہو سکتی ہے۔

جب کبھی بوڑھا بجو اپنے وفادار کتے کی رسی پکڑے بینک کے موڑ کی طرف جا رہا ہوتا تھا تو قصبے کا کوئی نہ کوئی بے فکرا اپنے ہی جیسے کسی ساتھی کو مخاطب کر کے کہتا۔

"اس بوڑھے فقیر کو دیکھ رہے ہو وہ دن بھر بینک کے سامنے بیٹھا ڈالر اور ڈائم جمع کرتا رہتا ہے اور کبھی ایک سینٹ بھی خرچ کرتا نظر نہیں آتا سوائے مٹر کے چند ڈبوں کے جو وہ ہفتے کھانے کے لیے خریدتا ہے۔ وہ کنجوس بلکہ مکھی چوس ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے اب تک کتنے ہزار ڈالر جمع کر لیے ہوں گے۔"

پھر کوئی اور اس افواہ کی یہ کہہ کر تائید کر دیا کرتا تھا کہ اس نے بجو کو کاؤنٹی کی بس پر ایک بڑا سا بکس بغل میں دبائے سفر کرتے دیکھا تھا اور جب وہ واپس آیا تو بکس اس کے پاس نہیں تھا۔

ممکن تھا کہ یہ افواہیں بے ضرر ہی ثابت ہوتیں اگر شیرف بک میڈن اس سلسلے میں سنجیدہ ہونے کا فیصلہ نہ کر لیتا۔ اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبوں میں بک میڈن جیسے قانون کے محافظ بہت نظر آتے تھے جن کے پاس عقل تو کم ہوتی تھی مگر جسمانی طاقت کے اعتبار سے بہت کم لوگ ان کی ٹکر کے نکلا کرتے تھے۔ بک میڈن بھی ایک لمبا تڑنگا طاقتور آدمی تھا جو عقل کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی پیدل واقع ہوا تھا۔ قصبے میں ہر فرد اس سے خوفزدہ رہتا تھا اور اس کا قاعدے قانون برقرار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی کمر سے ایک بھاری بھرکم گولیوں والا ریوالور لٹکائے پھرتا تھا اور ڈانٹ ڈپٹ کر لوگوں کو اپنا احترام و تعظیم کرنے پر مجبور کرتا رہتا تھا۔

بک میڈن اس وقت شیرف بنا تھا جب قصبے کا نیک دل بوڑھا شیرف جو زبیمار ہو کر انتقال کر گیا اور اسے شیرف بنے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے بوڑھے بجو کو ستانا اور دھمکانا شروع کر دیا۔ میں نے ایک دن اسے بینک کے سامنے بجو سے باتیں کرتے دیکھا۔ دوسرے دن بجو اپنے مقررہ ٹھکانے سے غائب تھا اور یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں نے بوڑھے بجو کو اپنے ساز اور کتے کے ساتھ بینک کے سامنے لکڑی کے بکس پر بیٹھا نہیں دیکھا۔

میں اس کی جھونپڑی گیا۔ اس خیال سے کہ شاید وہ بیمار ہو گیا ہو اس لیے قصبے نہ آ سکا ہو لیکن وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور بہت فکرمند نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

"شیرف کہتا ہے کہ قصبے میں فقیروں کے خلاف قانون موجود ہے اور کہتا ہے کہ مجھے لائسنس حاصل کرنا پڑے گا مگر میں کوئی فقیر یا بھیک منگا تو نہیں ہوں۔ میں اپنا ساز بجا کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔"

"ایک لائسنس کتنے میں مل جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شیرف کہتا ہے کہ پہلے مجھے پچیس ڈالر دینا پڑیں گے اور اس کے بعد ہر ہفتے دس ڈالر ادا کرنا ہوں گے لیکن اس سے پہلے بوڑھے شیرف جوز نے جب تک وہ زندہ رہا، مجھ سے کبھی کسی لائسنس کا تقاضا نہیں کیا۔"

میں نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔ ۱۹۳۲ء کے اس زمانے میں یہ رقم کافی بڑی سمجھی جاتی تھی۔

"تو پھر کیا تم اسے ادا کرنے کے لیے تیار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیسے ادا کر سکتا ہوں؟" بجو نے جواب دیا۔ "اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں گا۔ سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں لیکن اس بڑھاپے میں اب میرے اندر جگہ جگہ بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کی ہمت نہیں ہے۔ میں نے تو ہمیشہ یہی سوچا کہ میں اپنی زندگی کے آخری دن اسی جگہ گزار دوں گا۔"

اس کے بعد کئی دن تک جب بھی میں بوڑھے بجو کی جھونپڑی جاتا اسے وہیں بیٹھا ہوا پاتا اور اس کی اندھی آنکھیں خلا کی جانب لگی ہوئی، جانے کیا دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ وہ اتنے روز سے قصبے میں نہیں گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کے پاس کچھ کھانے کے لیے بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک خرگوش کو مار کر اس کا کچھ گوشت پکایا اور اس کے کھانے کے لیے لے گیا۔ ایک سہ پہر کو جب میں اس کی جھونپڑی کے قریب پہنچا تو میں نے شیرف بک میڈن کی کار کو کھڑا دیکھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا کہ دیکھوں شیرف یہاں کیوں آیا ہے۔ میں نے جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا۔ بک میڈن بجو کے سر پر کھڑا چیخ رہا تھا اور بوڑھا بجو بے حد خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔

"تو نے اس پچیس ڈالر کا بندوبست کیا جس کے بارے میں میں نے تجھ سے کہا تھا؟" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پچیس ڈالر ہی کیا تیرے پاس اس سے کہیں زیادہ رقم موجود ہے۔"

بوڑھے بجو نے خوفزدہ اور التجائی لہجے میں کچھ کہا جو میں سن نہیں سکا۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ وہ رقم کی موجودگی سے انکار کر رہا ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے اوپر حفاظتی انداز میں اٹھا رکھے تھے۔ بک میڈن نے بار بار اس سے روپے کے بارے میں سوال کیا اور بجو نے ہر مرتبہ گردن ہلا کر انکار کیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔

بک میڈن کو غصہ آ گیا۔ اس نے پوری جھونپڑی کا سامان اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آج جھونپڑی کو زمین دوز کر کے چھوڑے گا۔ میں خوف کے مارے میں جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔

دروازے

مریض ایک بہت بڑے ڈاکٹر کے مطب میں داخل ہوکر جسمانی معائنہ کروانے۔ وہاں دو دروازے تھے۔ ایک پر لکھا تھا نفسیاتی، دوسرے پر جسمانی۔ وہ "جسمانی" دروازے میں داخل ہو گیا۔ خیال تھا کہ آگے ڈاکٹر بیٹھا ہوگا لیکن ڈاکٹر کی بجائے پھر دو دروازے نظر آئے۔ ایک پر "سرجیکل" اور دوسرے پر "نان سرجیکل" لکھا تھا۔ وہ دوسرے دروازے میں داخل ہوا کہ اب ڈاکٹر سے ضرور ملاقات ہو جائے گی لیکن اس کی بجائے دو دروازے اور پائے۔ ایک پر لکھا تھا، آمدنی پانچ سو روپے ماہوار سے زیادہ، دوسرے پر لکھا تھا آمدنی پانچ سو روپے سے کم۔ مریض کی آمدنی کم تھی چنانچہ وہ دوسرے دروازے سے گزرا تو اگلے ہی لمحے مطب سے باہر سڑک پر کھڑا تھا۔

ڈرتا تھا اور چاہتے ہوئے بھی بوڑھے بجو کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد بک میڈن بوڑھے بجو کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکلا وہ غصے اور جھنجلاہٹ میں بالکل پاگل معلوم ہو رہا تھا۔

"بڈھے احمق بتا تو نے وہ دولت کہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہے؟" وہ چیخ رہا تھا۔

"میرے پاس دولت ہے ہی کہاں جو چھپاؤں گا۔" بجو نے جواب دیا

"تو جھوٹ بول رہا ہے بوڑھے کنجوس۔ تو برسوں سے ڈمی اور نکل جمع کرتا رہا ہے۔ جلدی بتا تو نے انہیں کہاں دبا رکھا ہے؟"

مگر بجو صرف انکار میں اپنا سر ہلاتا رہا۔ بک میڈن نے ایک دم اسے پکڑا اور پوری طاقت سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یقیناً بوڑھے بجو کی ہڈیاں بھی چیخ اٹھی ہوں گی۔ کتا رسیکل بری طرح بھونک رہا تھا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ خالی بھونکنے سے کام نہیں چل سکتا تو اپنے مالک کو بچانے کے لئے بھرپور حملہ کر دیا اس نے جھپٹ کر بک میڈن کی ٹانگ اپنے منہ میں دبوچ لی۔ بک میڈن درد اور غصے سے چیخ اٹھا۔ اس نے ٹانگ کو جھٹکا دے کر کتے کو دور پھینکا اور پھر اپنا ریوالور نکال کر وفادار کتے کو گولی مار دی۔ رسیکل مر گیا۔ بوڑھا بجو روتا ہوا اپنے وفادار ساتھی کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی موت پر آنسو بہانے لگا مگر ابھی بک میڈن کا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے بجو کو ریوالور کے دستے سے مارنا شروع کر دیا مارتے مارتے تھک کر وہ رکتا تھا اور پھر پوچھتا کہ بتا تو نے وہ دولت کہاں دفن کی ہے۔ بوڑھا بجو انکار کرتا رہا۔ رحم کی بھیک مانگتا۔ مگر بک میڈن اسے دوبارہ مارنا شروع کر دیتا یہاں تک کہ بوڑھا فقیر لہولہان ہو گیا۔ آخر جب شیرف اسے مارتے مارتے عاجز آگیا تو اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تیرے پاس کوئی دولت نہیں ہے تب تجھے آوارہ گردی کے الزام میں جیل جانا ہو گا۔" اور یہ کہہ کر اس نے بوڑھے بجو کو دھکا دے کر اپنی کار میں بٹھا دیا۔

میں ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک جھاڑی کے پیچھے دبکا ہوا بیٹھا رہا۔ مجھے بجو کی حالت پر رحم بھی آ رہا تھا اور رونا بھی۔ آخر بڑی دیر کے بعد میں اٹھا اور ایک گڑھا کھود کر کتے رسیکل کی لاش اس میں دفن کر دی۔ اس کی قبر کو جتنا اچھا بنا سکتا تھا بنا دیا اور ایک پتھر بھی لا کر اس پر لگا دیا جس پر کتے کا نام لکھ دیا جھونپڑی کے اندر کوئی چیز صحیح و سالم باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بک میڈن نے تباہی کا رقص مچا رکھا تھا۔ بجو کے جو دو چار کپڑے تھے انہیں پھاڑ کر پھینک دیا تھا تمام چیزیں ادھر ادھر بکھری اور ٹوٹی ہوئی تھیں مگر خوش قسمتی سے اس کا پرانا ساز سلامت رہ گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ٹین کا وہ ڈبہ بھی جس میں بجو سکے جمع کیا کرتا تھا۔ میں ان دونوں چیزوں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔

دوسرے دن میں جیل گیا۔ شیرف کا دفتر جس کے ساتھ جیل کی دو کوٹھریاں بھی تھیں، ایک چھوٹی سی عمارت میں واقع تھا جو قصبے کے سرے پر بنی ہوئی [illegible] رہتے تھے۔ مجھے اس عمارت کا پتہ اس لئے معلوم تھا کہ میرے والد ہفتے کی رات عموماً جیل میں بسر کرتے تھے شراب پی کر ہنگامہ کرنے کے الزام میں۔ اور مجھے اکثر انہیں چھڑانے کے لئے وہاں جانا پڑتا تھا۔

بک میڈن اپنی گھومنے والی کرسی میں بڑے آرام سے میز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ ماچس کی ایک تیلی دانتوں سے چباتے ہوئے پولیس گزٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"تم کیا چاہتے ہو برخوردار؟" وہ بولا۔ "آج تو میں نے تمہارے باپ کو جیل میں بند نہیں کر رکھا ہے۔"

"میں بجو سے ملنے آیا تھا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا

"اس سے کوئی نہیں مل سکتا۔" بک نے اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیا

"وہ ایک خطرناک مجرم ہے میں نے اسے قید تنہائی میں رکھ چھوڑا ہے۔"

"مگر کس جرم میں؟" میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"ایک پولیس افسر پر حملہ کرنے، گرفتاری میں مزاحمت کرنے اور آوارہ گردی کرنے کے الزام میں۔"

"وہ کب تک جیل میں رہے گا؟"

"جب تک وہ جرمانے کی رقم ادا نہیں کرے گا۔"

"لیکن جرمانہ ادا کرنے کے لئے وہ رقم کہاں سے لائے گا؟"

"رقم اس کے پاس ہے۔ بہت زیادہ رقم جسے اس نے کہیں چھپا رکھا ہے مگر اتنا ڈھیٹ ہے کہ کسی کو بتاتا نہیں۔ چاہے جیل میں سڑ کر مر جائے۔ اچھا چلو اب نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"

"میں فوراً بجو ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔" میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ وہ جیل میں رہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کر لوں۔ ممکن ہے وہ مجھے بتا دے کہ اس نے رقم کہاں رکھی ہے۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتا ہے۔"

بک میڈن نے آہستہ آہستہ اپنا پولیس گزٹ میز پر ڈال دیا اور غور سے میری طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "ذرا اس سے معلوم کرو کہ اس نے اپنی دولت کہاں دبا رکھی ہے تاکہ وہ جرمانے کی رقم بھر سکے اور ہم اسے آزاد کر دیں۔"

"اس کا جرمانہ کتنا ہے؟" میں نے پوچھا

"اس کا انحصار کئی باتوں پر ہے۔" بک میڈن نے جواب دیا۔ "پہلے تم اس سے یہ تو معلوم کر لو کہ اس نے اپنی دولت کہاں رکھی ہے؟"

بک میڈن نے جیل کی کوٹھری کا دروازہ کھولا میں اندر گیا۔ بیچارہ غریب بجو ایک گندے سے ٹاٹ کے گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب دکھائی دے رہی تھی۔ سر سے نکلا ہوا خون خشک ہو کر اس کے بالوں اور چہرے پر جگہ جگہ جم گیا تھا اور یہ بات بھی صاف ظاہر تھی کہ اب تک کوئی طبی امداد فراہم نہیں کی گئی تھی اور غالباً اسے کچھ کھانے پینے کے لئے بھی نہیں دیا گیا تھا۔

"ہیلو بجو۔" میں نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"یہ میں ہوں۔ راجر۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔"

اس نے بڑی مشکل اور تکلیف سے اپنا چہرہ میری طرف کیا۔

"ہیلو راجر۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا

"میں تمہارا بجو بھی لیتا آیا ہوں۔" میں بولا۔ "میں نے سوچا کہ تم اسے پا کر خوش ہو گے۔ خوش قسمتی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔"

اور یہ الفاظ سن کر بجو میں پہلی مرتبہ کچھ زندگی کی حرارت محسوس ہوئی اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے پھیلا دیا میں نے ساز اس کے ہاتھ میں دے دیا اور جس طرح کوئی مدت سے بچھڑا ہوا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو کلیجے سے لگا لیتا ہے۔ بوڑھے بجو نے وہ ساز اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے میں نے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں بک میڈن ہماری باتیں تو نہیں سن رہا ہے۔ مگر وہ اپنے دفتر میں واپس جا چکا تھا۔ میں بجو کے لئے ایک کینڈی بار بھی لایا تھا اس نے بڑا شکریہ ادا کر کے کینڈی لے تو لی۔ مگر اسے ایک طرف رکھ دیا میرا خیال ہے کہ وہ اس قدر تکلیف میں تھا کہ اس کا دل کچھ کھانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

"شیرف کہہ رہا تھا کہ اگر تم جرمانہ ادا کر دو تو وہ تمہیں آزاد کر دے گا" میں نے کہا۔

"میرے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لئے روپیہ کہاں ہے۔" اس نے دیوار کی طرف منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں یہاں مرنے کے لئے آیا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی۔ آخر میں نے بک میڈن کو آواز دی جس نے آ کر مجھے کوٹھری سے باہر نکالا۔ میں نے جانے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ بجو اپنا عزیز ساز سینے سے لگائے دیوار کی طرف منہ کئے لیٹا تھا۔

"کیا اس نے تمہیں بتایا کہ اپنی دولت کہاں چھپا رکھی ہے؟" بک نے پوچھا

میں نے انکار میں سر ہلایا اور بک کی زبان سے گالیوں کا سیلاب امنڈ پڑا میں گھر واپس آگیا اور اپنی رائفل لے کر دریا کی طرف نکل گیا تاکہ کچھ سانپ وغیرہ پکڑ سکوں۔ میں بے حد دل گرفتہ تھا اور اس رات ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا قصبے میں کسی دوسرے سے اس کے متعلق کہنا سننا بیکار تھا کیونکہ کوئی بھی شخص شیرف بک میڈن کی ناراضگی مول لے کر ایک بوڑھے فقیر کی حمایت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بجو سچ مچ اس جیل کی کوٹھری میں مرنے کے لئے ہی گیا تھا جیسا کہ اس نے خود بھی کہا تھا۔

رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی جس سے کام لے کر میں بجو کو بچا سکتا تھا۔ میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں خوفزدہ بھی تھا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جسم پسینے میں نہایا جا رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اس بارے میں نہ سوچوں۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ آخر کار مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک میں اپنی سوچی ہوئی ترکیب پر عمل نہ کر لوں مجھے چین نصیب نہیں ہو سکتا۔

دوسرے دن میں اسکول نہیں گیا اس کے بجائے میں نے ایک چکر بجو کی جھونپڑی کا لگایا۔ اس کے بعد میں قصبے میں واپس آگیا۔ سہ پہر ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ میں ایک مرتبہ پھر شیرف کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم پھر واپس آگئے؟" بک میڈن نے مجھے گھورتے ہوئے کہا

"کیا میں ایک مرتبہ اور بجو سے مل سکتا ہوں؟" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک بار اور کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے آج وہ مجھے اپنی دولت کے بارے میں بتا دے۔"

"جب اس نے مجھے نہیں بتایا تو تمہیں کیا بتائے گا؟" بک میڈن نے ناگواری سے کہا۔ "اس سے زیادہ کنجوس آدمی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کہتے ہیں کہ چمڑی چلی جائے مگر دمڑی نہ جائے۔"

"مجھے ایک کوشش اور کرنے دو۔" میں نے پھر کہا۔ "وہ کل مجھے بتاتے بتاتے رہ گیا تھا۔"

بک میڈن نے مجھ پر ایک تیز اور مشکوک نظر ڈالی۔

دس تمہارے

ایک رئیس نہایت قیمتی لباس پہن کر ایک فلسفی کے پاس گیا۔ فلسفی نے نیچے سے اوپر تک اُسے دیکھا۔ رئیس فلسفی کے اس انہماک پر بہت خوش ہوا اور پوچھا "اگر آج میں خود کو تمہارے ہاتھوں بیچوں تو کیا قیمت ادا کرو گے؟"

فلسفی نے جواب دیا "چار سو دس روپے"

رئیس نے پوچھا "چار سو دس کس حساب سے؟"

فلسفی نے جواب دیا "چار سو روپے لباس کے اور دس تمہارے"

"میں تم پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں؟" وہ بولا: "اگر اس نے تمہیں وہ جگہ بتادی اور تم نے خود وہاں جاکر رقم نکال لی اور اپنے پاس رکھ لی تو کیا ہوگا؟"

"اس صورت میں میں بجو کو جیل سے کیسے آزاد کرا سکوں گا؟" میں نے جواب دیا: "جبکہ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرے یہاں آنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ میں اسے جیل سے رہائی دلانا چاہتا ہوں۔ اگر میں جلدی اسے باہر نہیں نکال سکا تو وہ مرجائے گا۔"

میرا خیال ہے کہ میں اس وقت بہت اچھی اداکاری کر رہا تھا کہ آخر اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

"بہرحال کوشش کرنے میں تو کوئی نقصان نہیں ہے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا: "لیکن میری بات ذہن نشین کرلو۔ اگر تم نے خود اس کی دولت پر قبضہ کرنے کی ہمت کی تو میں تمہیں اور تمہارے باپ دونوں کو جیل میں ڈال دوں گا۔"

وہ مجھے ایک بار پھر بجو کی کوٹھری میں لے گیا اور پہلے کی طرح ہمیں اکیلا چھوڑ کر واپس لوٹ گیا۔ بجو کی حالت کل سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہ نیم بے ہوشی میں پڑا تھا۔ میں نے اس پر جھکتے ہوئے اس کے کان میں کچھ سرگوشیاں کیں۔

پھر جب بک میڈن مجھے کوٹھری سے نکالنے آیا تو اس نے آتے ہی پوچھا: "کیا اس نے تمہیں بتا دیا۔۔۔؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ بک کی آنکھیں یوں چمکنے لگیں جیسے ان میں کوئی بلب روشن ہوگیا ہو۔

"تم سچ کہہ رہے ہو لڑکے۔۔۔؟" اس نے بےتابانہ لہجے میں سوال کیا

"یقیناً۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی دولت کہاں دفن ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر ٹھیک ہے۔ مگر میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔" بک میڈن نے کہا: "ہم دونوں وہاں ساتھ چلیں گے اور تم مجھے بتاؤ گے کہ اس کی دولت کہاں چھپی ہوئی ہے۔"

بک میڈن نے اپنا ہیٹ سر پر رکھا۔ ریوالور کمر سے بندھے ہوئے ہولسٹر میں ڈالا اور ہم دونوں اس کی فورڈ موٹر کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ شیرف اتنی تیزی سے کار چلا رہا تھا کہ ہمیں بجو کی جھونپڑی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو میں بک میڈن کی رہنمائی کرتا ہوا اس سمت چلا جہاں قصبے کا کوڑا گھر واقع تھا۔ یہاں مختلف بیکار و ناکارہ چیزوں کے علاوہ ایک ٹوٹی پھوٹی کار کا ڈھانچہ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس ڈھانچے کی طرف اشارہ کیا: "بجو نے اپنی دولت اس کے نیچے زمین میں دبا دی ہے۔" میں نے کہا

بک میڈن کے منہ سے خوشی کا ایک نعرہ نکلا۔

"تم یہیں ٹھہرو لڑکے۔" اس نے کہا اور پھر خود بھاگ کر کار کے ڈھانچے کے پاس پہنچا اور دیوانہ وار زمین کھودنا شروع کر دی۔ جلد ہی وہ اس ڈبے تک پہنچ گیا جو میں نے وہاں چھپا دیا تھا۔ ڈبے کو دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ بلند کیا اور بےتابی کے ساتھ اس کا ڈھکنا کھول کر بغیر دیکھے بھالے اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا۔

اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ننگے بازو سے وہ خوفناک چتکبرا سانپ لپٹا ہوا تھا جسے میں نے اس ڈبے میں بند کر کے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ سانپ کے دانت اس کی کلائی میں گڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک بار پھر خوف و تکلیف سے بری طرح چیخا۔ اس نے ایک جھٹکے سے سانپ کو الگ پھینک دیا اور اپنا ریوالور نکال کر لگاتار تین چار فائر کر دیے۔ سانپ مرگیا۔ مگر وہ اپنا کام پورا کر چکا تھا۔

میں جو دور کھڑا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا ایک دم بک میڈن کی کار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جلدی سے اس کے سوئچ سے چابی نکالی اور اسے مٹھی میں دبا کر جنگل کی طرف بھاگ نکلا۔ پیچھے میں نے بک میڈن کو چیختے سنا وہ گالیاں دیتے ہوئے مجھے ٹھہرنے کا حکم دے رہا تھا۔ اور میں جتنا بھی تیز بھاگ سکتا تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لرزا بھی جا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں فائرنگ نہ شروع کر دے اور یہی ہوا۔ میں کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ مگر خوش قسمتی سے اب جنگل قریب آگیا تھا۔ تین چار گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزری ہی تھیں کہ میں نے ایک جھاڑی میں چھلانگ لگا دی اور بک میڈن کی نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن بک نے صرف گولیاں چلانے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا وہ میرے تعاقب میں دوڑ بھی رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ درد و تکلیف سے کراہتا بھی جا رہا تھا۔

میں پھر اٹھ کر بھاگا۔ لیکن اب میں جھاڑیوں کی آڑ لیتے دریا کے کنارے کنارے بھاگ رہا تھا۔ بک میرے پیچھے لگا چلا آرہا تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ دوڑ کتنی دیر تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے پیچھے ایک دھماکے کے ساتھ اسے گرتے سنا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں کچھ دور آگے جا کر رک گیا اور پھر ڈرتے ڈرتے جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے واپس لوٹا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں کوئی چال نہ چل رہا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ بک میڈن پیٹ کے بل زمین پر گرا ہوا تھا اور اس کی کھلی ہوئی شیشے کی طرح چمکتی آنکھیں آسمان کو گھور رہی تھیں۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس کا ہاتھ سوج کر پھولنے لگا تھا اور جلد کی رنگت سیاہ پڑنے لگی تھی۔

اسے مرنے میں کافی دیر لگی۔ میں کچھ فاصلے پر وہیں بیٹھا ہوا اسے دم توڑتے دیکھتا رہا۔ آخرکار شام ہونے سے کچھ پہلے وہ ختم ہوگیا۔ میں نے مزید کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر سہمے ہوئے انداز میں اس کے قریب گیا اور بڑی ہمت کر کے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر جیل کی کوٹھری کی چابیاں نکال لیں اور پھر اس کی کار میں بیٹھ کر قصبے کی طرف واپس چل دیا۔ جب میں جیل پہنچا تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے پہلے یہ اطمینان کیا کہ وہاں کوئی موجود تو نہیں ہے اور پھر اندر جاکر کمرے کی بتی جلائی اور بجو کی کوٹھری کا قفل کھول دیا۔

"یہ میں ہوں راجر۔" میں نے اسے کندھے سے اٹھاتے ہوئے کہا: "میرے ساتھ چلو میں تمہیں یہاں سے آزاد کرانے آیا ہوں۔"

اب میرے سامنے دو باتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ مجھے جلد از جلد یعنی کہ اس سے پہلے کہ لوگ بک میڈن کی تلاش شروع کریں قصبے سے نکل جانا چاہیے تھا اور دوسرے بجو کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسے جلد ہی طبی امداد نہیں ملی تو وہ مرجائے گا۔

وہ اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ مجھے اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے کار تک لانا پڑا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے عزیز ساز کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور خود ڈرائیونگ وہیل سنبھال کر قصبے سے چل دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ شیرف بک میڈن کی لاش کا پتہ چلنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ازراہ احتیاط یہی بہتر سمجھا کہ قصبے سے جتنی بھی دور نکل جاؤں اتنا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ میں تمام رات چلتا رہا یہاں تک کہ صبح کے وقت دوسری ریاست کی حدود میں داخل ہوگیا پھر پہلا بڑا قصبہ جو مجھے راستے میں ملا وہاں میں نے لوگوں سے ہسپتال کا پتہ پوچھا اور پھر جلد ہی قصبے کے کاؤنٹی ہسپتال کے خیراتی وارڈ میں ایک ڈاکٹر بوڑھے بجو کا معائنہ کر رہا تھا۔

میں نے بوڑھے بجو کو ہسپتال میں چھوڑا اور خود ناشتہ کرنے چل دیا۔ واپسی میں میں نے بک میڈن کی کار کو قصبے سے باہر لے جاکر ایک ویران مقام پر چھوڑ دیا اور پیدل ہسپتال کی طرف روانہ ہوا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو نرسوں نے وہاں کے عملے نے بجو کو نہلا دھلا کر صاف کر دیا تھا اور وہ ہسپتال کے فراہم کردہ کپڑوں میں خاصا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت آرام سے سو رہا تھا۔ اس کے چہرے سے درد و تکلیف کی تمام علامتیں مٹ چکی تھیں۔ ایک نرس نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اسے آرام کی نیند سلانے کے لیے خواب آور اور مسکن دوا کا انجکشن دیا ہے۔

میں تمام دن ہسپتال میں ہی چکر لگاتا رہا۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ بجو میرا چچا ہے وہ گھوڑے کی سواری کر رہا تھا کہ اچانک گر پڑا۔ گرتے ہوئے اس کا پیر رکاب میں پھنس گیا اور گھوڑا اسے دور تک زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے گیا۔ میں نے اس قسم کا واقعہ ایک کہانی میں پڑھا تھا جو مجھے یاد رہ گیا تھا۔ بجو کی چوٹیں کچھ اس قسم کی تھیں کہ ہسپتال کے لوگوں کو میرے بیان پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا۔

میں نے وہ رات قصبے کے ایک پارک کی بینچ پر سو کر گزاری۔ اگلی صبح جب میں اس کی خیریت معلوم کرنے ہسپتال پہنچا تو دیکھا کہ اس کا بستر خالی ہے۔ اسی وقت ایک ڈاکٹر نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے پاس بلایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بجو رات میں کسی وقت سوتے ہوئے آرام و سکون کی موت مرگیا۔

"ہم جو کچھ کر سکتے تھے اس کے لیے کیا۔ مگر وہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا اس حادثے کو برداشت نہیں کر سکا۔" ڈاکٹر نے کہا

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے پاس کچھ رقم ہے۔ میں نے بتایا کہ ہم لوگ بہت غریب ہیں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے مجھے اطمینان دلایا اور کہا کہ وہ کاؤنٹی کی طرف سے بوڑھے بجو کی تدفین کا انتظام کر دے گا۔ اس کے بعد ہسپتال والوں نے مجھے ایک بنڈل دیا جس میں بجو کے وہ خون آلود کپڑے تھے جو وہ پہنے ہوئے تھا اور ساتھ ہی اس کا بجو بھی تھا۔ میں ہسپتال سے نکل کر پارک کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔

اس کے بعد میں نے بجو کے کپڑے تو پھینک دیے اور اس کا ساز لے کر قصبے سے چل دیا۔ اس زمانے میں غربت بہت عام تھی اور اکثر بیکار نوجوان مختلف قسم کے کیمپوں میں یا تیل کے کارخانوں میں کام کرتے تھے ۱۹۲۶ء میں میں بھی... ٹیکساس کے ایک شہر ہیسی گوٹن کے قریب تیل کے کارخانے میں ملازم تھا لیکن میں جہاں بھی جاتا تھا بجو کا پرانا ساز ہمیشہ میرے ساتھ رہتا تھا۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں بجو پر ایک نئی دھن بجانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ساز کا بالائی حصہ ٹوٹ گیا۔ میں اسے روشنی میں یہ دیکھنے کے لیے لے گیا کہ آیا میں اسے جوڑ سکتا ہوں یا نہیں۔ دراصل وہ ٹوٹا نہیں تھا بلکہ اپنے ایک جوڑ سے کھل گیا تھا اور اسے دوبارہ جوڑنا اتنا آسان تھا کہ ایک اندھا آدمی بھی اسے بخوبی جوڑ سکتا تھا۔ میں اسے جوڑ ہی رہا تھا کہ میری نظر اس کے کھوکھلے حصے کے اندر گئی اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک کاغذ میں بڑی احتیاط سے تہہ کیے ہوئے ایک ایک ہزار ڈالر کے پانچ نوٹ رکھے ہوئے تھے۔

یہ اس زمانے میں ایک بہت بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ اتنی زیادہ کہ میں نے اپنی ملازمت چھوڑ کر دوبارہ اسکول میں نام لکھا لیا اور یہ رقم نہ صرف اسکول کی تعلیم کے دور میں بلکہ اس کے بعد بھی اس وقت تک میرے کام آتی رہی جب میں نے یونیورسٹی سے اپنی قانون کی ڈگری حاصل نہیں کر لی۔

اس کے بعد سے بجو میرا محبوب ترین ساز بن گیا تھا

پیٹروینس

کی کرنل لُفت سے پہلی ملاقات ایک چھوٹے سے گارڈن کیفے میں ہوئی تھی۔ پیٹر وہاں اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ نہایت مطمئن انداز میں بیئر پی رہا تھا۔ سگار کے کش لے رہا تھا اور گزرتی ہوئی ٹریفک کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تازگی اور بے فکری نظر آ رہی تھی۔

جس جگہ وہ بیٹھا تھا وہاں سے کچھ فاصلے پر مشہور زمانہ برینڈن برگ گیٹ واقع تھا۔ مشرقی و مغربی برلن کو جدا کرنے والی دیوار کو مغربی برلن کے لوگ شرم کی دیوار کہتے ہیں۔

دفعتاً ایک پستہ قد اور فربہ اندام شخص ذیلی راستے سے نکل کر کیفے کے اندر داخل ہوا۔ اس کا سر چوکھائی سر گنجا تھا۔ پیٹر اس کی عمر کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں کر سکا۔ وہ پیٹر کی میز کے قریب لگی ہوئی مشین کے سامنے رک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

پھر اس نے جیب سے ایک سکہ نکال کر مشین کے اندر ڈالا۔ اندر گھرر... کی آواز پیدا ہوئی اور پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹا ہوا ایک رومال باہر آ گیا۔ پستہ قد شخص پلاسٹک کی تھیلی میں سے رومال کو آزاد کرنے کی کوشش

طویل عرصے بعد پیش کی جانے والی ایک سپائی کہانی

عبدالقیوم شاہ

کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مشین کے اندر سے نسوانی آواز میں "بہت بہت شکریہ" کی آواز آئی۔ یہ آواز اندر لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر سے آئی تھی۔

پستہ قد شخص گھوم کر چاروں طرف پھیلی ہوئی میزوں کا جائزہ لینے لگا تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ پھر اس نے پیٹر کے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔

پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر مزید کہا: "بہت مہربانی۔" اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیٹر اسے یہ بتانے ہی والا تھا کہ وہ اپنی بیوی کا انتظار کر رہا ہے۔

لیکن اس شخص نے اپنے موٹی ناک کو نئے رومال میں پکڑ کر ایک زوردار آواز پیدا کی۔ پھر اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ رومال کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور شوخ نظروں سے پیٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام لُفت ہے۔ کرنل لُفت۔"

تاہم اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ پیٹر نے اندازاً اپنا تعارف کرایا۔ "کیا تم مجھ پر ایک چھوٹی سی مہربانی کر سکتے ہو؟" کرنل نے کہا۔

غالباً تمہاری روزی کا دارومدار سیاحوں کے مال پر ہے۔ پیٹر نے دل میں کہا۔ پھر بلند آواز سے پوچھا: "کیسی مہربانی؟"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ لے لو۔" کرنل نے کہا۔ "میں تمہیں ایک پرزہ کاغذ نکال کر دوں گا۔ تم اس پر ایک نظر ڈالنا۔ تمہارے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آنی چاہیے۔ پھر تم اس پرزے کو اپنی جیب میں رکھ لینا۔ نہایت ہی آسان کام ہے۔"

بڑی بے ہودہ سی بات تھی۔ پیٹر عجیب نظروں سے کرنل کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس شخص سے چھٹکارا پانے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔

"عام طور پر میں اس قسم کے بے ہودہ کام نہیں کرتا لیکن اگر ایک کاغذ لینے سے کسی پر مہربانی ہوتی ہو تو کبھی کبھی ایسا احمقانہ کام بھی کر لیتا ہوں۔ لاؤ کون سا کاغذ ہے؟"

کرنل نے نہایت احتیاط کے ساتھ جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور آگے جھک کر اسے پیٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دینے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ادھر اُدھر کے لوگوں کی نظر اس پر نہ پڑے۔ پیٹر نے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اس پر صرف دو الفاظ درج تھے "آپ کا شکریہ۔"

پھر اس نے نظریں اٹھا کر کرنل کی طرف دیکھا۔ جو جانے کے لئے کھڑا ہو چکا تھا کرنل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے پیٹر کو آنکھ ماری اور تیز قدموں سے چلتا ہوا فٹ پاتھ پر چلنے والے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

"دیوانہ!" پیٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کاغذ کو مروڑ کر پھینکنے لگا اچانک اُسے خیال آیا کہ کرنل نے کاغذ جیب میں رکھنے کی تاکید کی تھی بس اُس نے کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے وہ خاصی الجھن محسوس کر رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد وہ کرنل لُفت کو بالکل بھول گیا۔

شام کو اُس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو فلم دیکھنے کے لئے بھیج دیا اور خود ہوٹل میں آ گیا۔ تاکہ اپنے نئے ناول پر کام کر سکے۔ ہوٹل کے داخلی ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بے آواز چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے آ کر رک گیا اور جیبوں میں چابی تلاش کرنے لگا تھا کمرے کے اندر سے ایک چھناکے کی آواز سنائی دی۔ پیٹر ایک دم چونک گیا اور دانے کو گھورتے ہوئے سوچنے لگا۔ غالباً کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے اور ہوا کے زور سے کوئی گلدان وغیرہ گر پڑا ہے۔ پھر اس کا خیال چور کی طرف گیا۔

لیکن اُس نے فوراً اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ زیادہ ڈرامائی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔ اس نے خود سے کہا۔ ممکن ہے کہ کوئی خادمہ اندر صفائی کر رہی ہو۔ تو بھی وہ دروازہ کھولنے میں خاصا متامل تھا۔

وہ بہت باریکی سے سوچتا تھا۔ اسی وجہ سے اس میں جرأت کی کمی بھی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے خوف کو ظاہر کرنے کی بجائے مر جانا بہتر سمجھتے تھے اس لئے وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ڈیسک کلرک کے پاس جا کر یہ کہتا کہ اُس کے کمرے سے مشتبہ آوازیں آ رہی ہیں۔

بالآخر اس نے دروازے میں چابی گھمائی اور اُسے تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا۔

ٹیبل لیمپ جل رہا تھا اور میز کے سامنے ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا اس کے ناول کا ادھورا مسودہ پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسا منہمک تھا کہ پیٹر کی آمد سے آگاہ نہ ہو سکا۔ پیٹر نے دروازہ پورا کھول دیا اور ذرا سا کھنکھارا۔ وہ شخص شپٹا کر پیچھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر زبردست خوف نظر آ رہا تھا۔

"اوہ... اوہ... معاف کرنا جناب۔" اس نے کہا۔ "شاید میں غلط کمرے میں داخل ہو گیا ہوں۔" اس نے اپنی چونچ نما ناک پر چشمہ درست کیا۔ اور تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر خفیف مسکراہٹ کے ساتھ پیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" پیٹر نے کہا: "تم غلط کمرے میں گھس آئے ہو۔"

عمر رسیدہ شخص نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل بات یہ ہے جناب کہ اندر داخل ہونے کے فوراً بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں فوراً ہی واپس جانے لگا لیکن اچانک میری نظر میز پر رکھے ہوئے مسودے پر پڑ گئی۔ آپ کا ناول کچھ اتنا دلچسپ تھا کہ میں اسے پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ اور مسٹر پیٹر" اس نے پیٹر کو نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میں آپ کی تحریروں کو نہایت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ میرے پسندیدہ مصنف ہیں میں آپ کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ چکا ہوں۔"

کسی مصنف یا شاعر کو بے وقوف بنانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اس کے "کلام بلاغت نظام" کی تعریف شروع کر دی جائے۔

"اچھا!" پیٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ بڑے میاں سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ قبلہ محترم آپ مقفل دروازے میں سے کس طرح اندر داخل ہوئے ہیں۔

"بالکل بالکل!" بوڑھے نے چہکتے ہوئے کہا اور دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کا یہ ناول بھی کتابوں کی طرح بہت مقبول ہو گا۔ وہ آپ کے تمام ناولوں میں سب سے اچھا..."

دفعتاً کمرے کے اندر ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی بوڑھے نے مٹھیاں بھینچ لیں اور فرش کی طرف جھکتا چلا گیا۔

پیٹر حیرانی سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اور پھر آہستگی کے ساتھ قالین پر لڑھک گیا۔

بالکونی میں کھلنے والی کھڑکی کے پردے میں تھوڑی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ پیٹر سر موڑ کر اُس طرف دیکھنے لگا۔ پہلے اس نے خیال کیا کہ کھڑکی کا پردہ ہوا کے جھونکے سے ہلا ہے لیکن فوراً ہی اُس کی نظر ایک سائلنسر لگے ہوئے پستول پر پڑی جو پردے کے عقب سے نمودار ہو گیا تھا۔ پھر اس پستول کو پکڑنے والا ہاتھ اور پھر پورا جسم سامنے آ گیا۔

وہ کرنل لُفت تھا۔ وہ کھڑکی پر سے کود کر کمرے میں پہنچ گیا اور مسکراتے ہوئے پیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"گڈ ایوننگ۔" اس نے چہک کر کہا: "صورتحال خاصی پریشان کن ہے مسٹر پیٹر۔ مہربانی کر کے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تم خاصے پریشان نظر آ رہے ہو۔ میں

تمہارے لئے ایک برانڈی کا گلاس بنا کر لاتا ہوں۔"

پیٹر نے سوچا کہ اس کے لئے کرسی تک پہنچنا خاصا مشکل ہے۔ اگر اس نے حرکت کی تو یقیناً فرش پر گر جائے گا۔ اسے اپنی ٹانگوں پر کوئی بھروسہ نہیں رہا تھا۔

"تت... تم نے اسے قتل کر دیا!" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اسے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "تم نے اس کی پشت میں گولی مار دی۔"

"ہاں ہاں۔" کرنل نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور دروازہ بند کر دیا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریقہ امریکہ کی ٹی وی فلموں کے بالکل برعکس ہے۔ ان فلموں کے ہیرو ہمیشہ پیچھے سے اپنے دشمن کو جا لیتے ہیں، لیکن فائر نہیں کرتے۔ بلکہ پہلے اسے ہوشیار، خبردار کرتے ہیں۔ تب وہ ایک دم گھوم کر ہیرو صاحب اور پستول کا دیدار کرتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ ہیرو دانت پیس کر اسے مختلف القابات سے نوازتا ہے اور پھر اس کے سینے میں گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ نہایت بے ڈھنگا طریقہ ہے۔ کیوں بھئی؟ حقیقت میں نہایت ظالمانہ بھی۔ کم از کم میں اپنے لئے یہ طریقہ پسند نہیں کروں گا۔ موت سے زیادہ موت کا تصور ہیبت ناک ہوتا ہے۔"

"تم نے اسے قتل کر دیا!" پیٹر نے احمقانہ طریقے پر دہرایا۔ "بے چارہ سیدھا سادا اور شریف آدمی تھا۔"

"مجبوراً قتل کرنا پڑا۔" کرنل نے کہا۔ اور جیب سے رومال نکال کر دروازے کا ہینڈل صاف کر دیا۔ "یہ کمیونسٹ ایجنٹ تھا۔ یقیناً معمولی حیثیت کا تھا تاہم خاصا خطرناک تھا اور اتنا بوڑھا اور بے ضرر نہیں جتنا نظر آتا تھا۔ یہ میک اپ اس نے اپنی اصلیت چھپانے کے لئے کر رکھا تھا۔ یہ جوڈو کا ماہر تھا۔ تمہیں اور تم جیسے تین اور آدمیوں کو کھڑکی سے باہر پھینک سکتا تھا۔"

یہ کہتا ہوا وہ لاش کے قریب بیٹھ گیا۔

"اب دیکھتے ہیں کہ اس کے پاس سے کیا برآمد ہوتا ہے؟" اس نے بائیں ہاتھ سے اس کی جامہ تلاشی لینا شروع کر دی۔ اس کی موٹی اور بھدی انگلیاں نہایت تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں سبز رنگ کی چھوٹی سی نوٹ بک تھی۔ وہ جلدی جلدی نوٹ بک کے صفحات پلٹنے لگا۔

"ہونہہ۔ یہ بات ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسی بات کا خدشہ تھا۔ یہ شخص میری حرکات کا پورا پورا ریکارڈ رکھ رہا تھا۔"

"کرنل یہ سب کیا معاملہ ہے؟" پیٹر نے چیخ کر کہا۔ "تم کون ہو اور تمہارا مقصد کیا ہے؟"

کرنل نے پستول کی نالی اپنی کنپٹی سے لگا دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خودکشی کرنے لگا ہے۔ پھر نال سے کان کھجلاتے ہوئے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ آج مجھے ایک چھوٹا سا کام درپیش ہے جس کے لئے خاصی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ہیکس میری نگرانی کر رہا ہے۔ تاہم یہ بات قدرے تاخیر سے معلوم ہوئی۔ پس میں ہیکس کو گارڈن کیفے میں لے گیا۔ وہاں میں نے سب سے پہلے نظر آنے والے ٹورسٹ کو منتخب کیا۔" اس نے خوشگوار انداز میں مسکرا کر پیٹر کی طرف دیکھا۔ "اتفاق سے وہ ٹورسٹ تم تھے۔ میں نے تمہیں کاغذ کا ایک فضول سا ٹکڑا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہیکس کی محدود عقل اس بات سے کیا نتیجہ اخذ کرے گی۔ اس نے فوراً یہ اندازہ لگایا کہ میں نے تمہیں کوئی اہم کاغذ دیا ہے اور یہ کہ تم میرے لئے کام کر رہے ہو۔ لہٰذا یہ تمہارے پیچھے لگ گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ تم اور تمہاری فیملی سینما ہال میں ہو اور فلم سے لطف اندوز ہو رہے ہو تو یہ تمہارے کمرے میں آ گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کون ہو اور کیا کام کر رہے ہو۔"

"لیکن تم نے اسے شوٹ کیوں کیا؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ شخص میرے بارے میں ضرورت سے زیادہ باتیں جانتا تھا اور مزید خطرناک بات یہ تھی کہ اس نے میرے متعلق بہت کچھ اس ڈائری میں نوٹ کر رکھا تھا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری باتوں پر یقین کروں گا؟" پیٹر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہاری کہانی قطعی ناقابل یقین ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک عادی مجرم اور قاتل ہو؟"

کرنل نے مصنوعی دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "اس کام کے بدلے خطابات بھی دیئے جاتے ہیں۔"

"خطابات؟ قاتل کے علاوہ تمہیں اور کیا خطاب دیا جا سکتا ہے؟"

کرنل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مثلاً غازی، فاتح اور ہیرو وغیرہ۔ تاہم سردست اتنا ہی بتانا کافی ہو گا کہ بندہ سی آئی اے کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ ادارہ تمہارا یعنی اہل برطانیہ کا زبردست حامی ہے۔"

"سو مسٹر لگٹ" پیٹر نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم کرنل ورنل کچھ بھی نہیں۔ تم انتہائی بے ہودہ قسم کی باتیں میرے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اس کوشش میں بالکل کامیابی نہیں ہو گی۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے اور میں پولیس کو فون......"

"نہیں... تم ایسا نہیں کرو گے۔" کرنل نے پستول کی نالی کا رخ اس کے سر کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ میری بات تسلیم کر لو۔ کم از کم ایک رات کے لئے۔" بات کا اختتام کرتے ہوئے اسے کوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنی آستین اوپر اٹھائی اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے رسٹ واچ پر وقت دیکھنے لگا۔ "اس تمام ہنگامے کی وجہ سے میرا نہایت قیمتی وقت ضائع ہو گیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ تمہارا کیا بندوبست کیا جائے۔ میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میرے جاتے ہی تم پولیس کو فون کر دو گے۔ جس کا مطلب یہ ہو گا کہ آج رات میں مشرقی برلن نہیں جا سکوں گا۔"

پیٹر کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس شخص سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جس نے تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی کو قتل کیا ہو۔ کرنل نے پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس مسئلے کا ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے سر مبارک کی پشت پر ایک کاری سی چوٹ لگا کر تمہیں بے ہوش کر دیا جائے یا تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک کونے میں پھینک دیا جائے لیکن یہ طریقے عام طور پر تسلی بخش ثابت نہیں ہوتے۔ کوئی شخص کمرے میں آ کر موقع حال سے آگاہ ہو سکتا ہے یا تم کوشش کر کے خود کو رسیوں سے آزاد کرا سکتے ہو۔ برلن میں ایک پُرامن شہری ہوں۔ تمہیں مجھ سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"بجا فرمایا۔" کرنل نے جواب دیا۔ پھر جرمن زبان میں پوچھا۔ "کیا تم جرمن بول سکتے ہو؟"

"ہاں بول سکتا ہوں۔" پیٹر نے انگریزی میں کہا۔

"اگر بول سکتے ہو تو جرمن میں جواب دو۔"

"میں بڑی اچھی طرح جرمن زبان بول سکتا ہوں۔" پیٹر نے جرمن میں کہا۔ "میں نیویارک یونیورسٹی میں جرمنی زبان پڑھا رہا ہوں۔"

"بہت خوب۔" کرنل نے خوش ہو کر کہا۔ "مسئلہ حل ہو گیا۔ ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آج رات تم میرے ساتھ مشرقی برلن چل رہے ہو۔"

"سو کرنل، میں تمہارے معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔"

"دوست یہ محض تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اتنا اچھا حل مل گیا۔ شکر ہے کہ اب مجھے تمہیں خاموش کرنے کی تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تمہیں اپنے ناول کے لئے بہترین مواد حاصل ہو جائے گا۔ اور تجربہ بھی۔"

"لیکن... مجھے اس قسم کے تجربات حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں"

کرنل نے مسکراتے ہوئے پستول ہلایا اور کہا۔ "ذرا جلدی۔ میں مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"

**

پیٹر اسٹیشن ویگن چلا رہا تھا اور کرنل برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا جس میں پستول پکڑا ہوا تھا۔ نالی کا رخ پیٹر کی طرف تھا۔

"بظاہر یہ بات غیر ضروری... بلکہ غیر اخلاقی ہے۔" کرنل نے کہا۔ "لیکن میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آج رات میرا مشرقی برلن پہنچنا بہت ضروری ہے۔ اگر تم نے مدد کے لئے شور مچانے کی کوشش کی تو میں تمہیں بے تامل ہلاک کر دوں گا اور ہو سکتا ہے... بلکہ یقینی ہے کہ بعض بے گناہ آدمیوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑے۔"

پیٹر کو یقین تھا کہ کرنل جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی نظر میں انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

"کرنل جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔ "اگر تم واقعی سی آئی اے کے لئے کام کر رہے ہو تو تم اپنے معاملے میں مقامی پولیس سے مدد کیوں نہیں حاصل کرتے؟"

کرنل نے دور نظر آتے ہوئے برینڈن برگ گیٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میرے دوست، اگر تم اس کام میں ہوتے تو طویل تجربے سے یقیناً یہ بات سیکھ جاتے کہ تمہارے اردگرد نظر آنے والا ہر شخص تمہارا دشمن ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو اپنائے بغیر کوئی شخص اس پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یقین کرو کہ مغربی برلن میں سرخ ایجنٹوں کی کافی سے زیادہ تعداد موجود ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ میں ایک خاص آدمی کو خفیہ طور پر مشرقی برلن سے اسمگل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ سی آئی اے کا نام اس میں ہرگز نہیں آنا چاہئے۔"

"کیا کہا؟" پیٹر نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یعنی تم مشرقی برلن کے کسی اہم آدمی کو اغوا کرنے جا رہے ہو؟ آج رات؟ اور ابھی؟"

پیٹر سڑک پر سے نظریں ہٹا کر کرنل کو گھورنے لگا تھا۔

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔ "جس شخص کو ہم اغوا کریں گے وہ بظاہر ایک مردہ آدمی ہو گا۔ اور... وہ سامنے والے آدمی کا ذرا خیال کرنا۔"

پیٹر نے جلدی سے بریک لگائی اور کہا۔ "بظاہر ایک مردہ آدمی!"

"اگر میں بریک نہ لگاتا تو یہ شخص عدم کو سدھار چکا ہوتا۔"

"گاڑی کو چلاتے رکھو مسٹر پیٹر۔ سرحد کی دوسری جانب پہنچنے کے بعد میں تمہیں تفصیل سے ساری بات سمجھا دوں گا۔"

**

مغربی سرحدی چوکی پر انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے راستہ دینے سے پہلے شناختی کاغذات طلب کئے۔ کرنل نے کوٹ کی داہنی اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکال کر دکھایا اور پیٹر نے اپنا ویزا دکھا دیا۔

"خدا حافظ۔" گارڈ نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" کرنل نے جواب دیا۔ اور پیٹر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مشرقی سرحدی چوکی کے قریب پہنچنے سے پہلے کرنل نے پیٹر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اس طرف کے گارڈ کو تم کوئی کاغذ نہ دکھانا۔ بلکہ تمہیں اس کی بات کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہی ظاہر کرنا کہ تمہیں جرمن نہیں آتی۔"

اسی اثنا میں چوکی آ گئی اور پیٹر نے گاڑی روک دی۔

ایک تیز آنکھوں اور موٹے ہونٹوں والا سپاہی ان کی طرف آیا۔ وہ سبز اور سلیٹی رنگ کی یونیفارم میں ملبوس تھا۔ اس کے سیاہ بوٹ خوب چمک رہے

تھے۔ اس نے لاپروائی کے ساتھ اپنی رائفل کی بیرل کھڑکی کے اندر جھکا دی اور اندر جھانکنے لگا۔ پیٹر نے قدرے خوف زدہ نظروں سے بیرل کے سیاہ سوراخ کو دیکھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

کرنل لفت نے کوٹ کی بائیں اندرونی جیب سے ایک دو شناختی کارڈ نکال کر سپاہی کے سامنے کر دیا۔ سپاہی نے سرسری نظروں سے شناختی کارڈ کی طرف دیکھا اور پھر رائفل کی بیرل سے پیٹر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس کے کاغذات کدھر ہیں؟"

"اس کے پاس کوئی کاغذات نہیں۔" کرنل نے جواب دیا۔ "یہ میرا ملازمی ساتھی ہے۔"

سپاہی نے سر کو معمولی سی جنبش دی۔ شناختی کارڈ کرنل کے ہاتھ میں تھما دیا اور گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمیوں کو اوکے کا اشارہ کرتا ہوا واپس چل پڑا۔

"آرام سے۔" کرنل نے پیٹر سے کہا۔ "راستہ کھلنے کے بعد عجلت ظاہر نہیں کرنا۔ آرام سے چلنا۔"

راستہ کھلنے کے بعد پیٹر نے گاڑی بڑھا دی۔ اسے آگے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ گاڑی کو واپس موڑ لیتا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے کرنل سے کہا۔

"غالباً تمہارے پاس کوئی کھل جا سم سم قسم کا جادو ہے۔ جو تمہارے لئے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

"ہاہ... ہا... اندر داخل ہونا کوئی مشکل نہیں۔ اصل کام تو باہر نکلنے کا ہے۔ مشرقی چوکی پر میں نے جو کارڈ دکھایا تھا وہ سوویٹ ملٹری ہیڈ کوارٹر کا... جاری کردہ ہے۔"

"ہائیں۔ کیا کہا؟ سوویٹ ملٹری ہیڈ..."

پیٹر دفعتاً خاموش ہو گیا اور فی الفور گاڑی کو سڑک کے کنارے پر روک دیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

"اس کا یہ مطلب ہے کرنل کہ تم... تم سوویٹ ایجنٹ ہو... اور اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے اغوا کر کے مشرقی برلن لے جا رہے ہو... ب... بلکہ درحقیقت تم مجھے اغوا کر چکے ہو۔ کرنل سچ سچ بتاؤ تم کون ہو...؟"

کرنل نے دستی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کام کی رفتار تیز کرنے کے لئے بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ اگر میرے پاس یہ سہولتیں موجود نہ ہوتیں تو میں کبھی اتنی جلدی یہاں نہ پہنچ سکتا۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ تم دراصل کس کے وفادار ہو؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میری ہمدردیاں مغرب کے ساتھ ہیں۔" کرنل نے جواب دیا۔ "دوست تم اتنے حیران کیوں ہو؟ کیا تم نے اس شخص کے بارے میں نہیں سنا جو دہری زندگی گزارتا تھا؟ تاہم میرے نزدیک یہ نہایت الجھن والی بات ہے۔ میرا طریقہ بہت سیدھا سادا ہے۔ میں صرف دوہری زندگی گزارتا ہوں۔ ایک مشرقی اور ایک مغربی۔ تاہم اس بات کی ضرورت صرف جرمنی میں ہی پیش آتی ہے جب

جیسا دوسرے ممالک میں ہوتا ہوں تو...۔ تم جانتے ہی ہو کہ سیاست میں سب چلتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ درحقیقت تم ایک آزاد کارکن ہو اور سب سے اونچی بولی دینے والے کا ساتھ دیتے ہو۔"

"ہاں۔" کرنل نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ اور ہاں ذرا چلتے رہو۔ رکنا خطرناک ہے۔ میرے سے زیادہ تمہارے لئے۔ کیونکہ تمہارے پاس شناختی کاغذات بھی نہیں..."

پیٹر نے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"تم نے ایک بظاہر مردہ آدمی کا ذکر کیا تھا۔ وہ کون ہے؟"

"اب چونکہ تم میرے ساتھ کام کر رہے ہو۔ اس لئے تم سے کوئی بات پوشیدہ رکھنی بیکار ہے۔" کرنل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر کو اغوا کر کے مغربی برلن لے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ڈاکٹر محلہ لینن ایلی میں تنہا رہتا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک خادمہ ہے۔ جو بری تنخواہ دار ہے۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے وہ ڈاکٹر کو ڈیجی ٹالس DIGITALIS کی ایک مخصوص مقدار کھلا رہی ہے۔ اس دوا کے اثر سے ڈاکٹر کے دل کی دھڑکن وقتی طور پر رک جائے گی اس مرحلے پر خادمہ فوراً ایک دوسرے ڈاکٹر کو فون کرے گی۔ یہ ڈاکٹر اتفاق سے مغرب کا حامی ہے۔ وہ آتے ہی پہلے والے ڈاکٹر کو مارفین کا انجکشن دے گا۔ جس کے نتیجے میں اس پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جائے گی۔"

"ایک منٹ۔" پیٹر نے جلدی سے کہا۔ "کیا یہ شخص یعنی پہلے والا ڈاکٹر بذات خود مغربی برلن آنے پر آمادہ ہے؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میرا خیال ہے کہ کسی نے اس سے یہ بات پوچھنے کی غلطی بھی نہیں کی ہوگی۔ تاہم میرا اندازہ ہے کہ وہ مغرب کو پسند نہیں کرتا۔"

"اوہ کرنل، تم ایک بے گناہ ڈاکٹر کو ڈیجی ٹالس اور مارفین دے رہے ہو تاکہ اسے اغوا کیا جا سکے۔ یہ شخص ہے کون؟ میرا مطلب یہ ہے کہ اس میں کون سی اہم بات ہے جس کی وجہ سے اسے اغوا کیا جا رہا ہے؟"

"میرا اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ وہ کون ہے اور کتنا اہم ہے میرا کام اسے مشرق سے مغرب پہنچانا ہے۔"

"لیکن یہ ڈیجی ٹالس، اور مارفین اور موت کی سی کیفیت مجھے تو یہ سب کچھ دیوانگی معلوم ہوتی ہے۔"

"بندہ پرور میری لائن میں یہی کچھ ہوتا ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔ جب پہلے والے ڈاکٹر پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جائے گی تو دوسرا ڈاکٹر حکام کو اس کی موت سے آگاہ کرے گا۔ وہ کسی ذمہ دار افسر کو تصدیق کے لئے بھیج دیں گے۔ یہ افسر سرسری دیکھ بھال کے بعد موت کی توثیق کر دے گا۔ پھر دوسرا ڈاکٹر موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کرے گا! اس کے بعد ڈاکٹر کی خادمہ

مرحوم ڈاکٹر کے بھائی کو فون کر کے اس افسوس ناک سانحہ ارتحال کی اطلاع دے گی۔ اور اتفاق سے یہ بھائی میں ہوں گا۔ اور اس وقت ہم اسی جگہ جا رہے ہیں جہاں ڈاکٹر کی خادمہ کا فون متوقع ہے۔"

"ناممکن..." پیٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ناقابل یقین! اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت ڈاکٹر پر موت کی کیفیت وارد ہو چکی ہوگی اور دوسرا ڈاکٹر موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنے والا ہوگا۔"

"بالکل۔" کرنل نے کہا۔ "اور سنو، ایک بات تم پر واضح کر دوں کہ مشرقی برلن میں داخل ہونے کے بعد تمہاری حیثیت بالکل بدل چکی ہے۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں ابھی، اور اسی وقت قتل کر سکتا ہوں۔ بلکہ اصولی طور پر تمہیں اب تک قتل کر دینا چاہئے تھا۔ تاہم تم اب تک پورا پورا تعاون کرتے آ رہے ہو اس لئے میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ لیکن یاد رکھو اگر تم نے ذرا سا عدم تعاون کیا تو پھر اپنے آپ کو ختم ہی سمجھو۔ اور مجھے تمہاری موت سے گہرا صدمہ ہوگا۔"

پیٹر کرنل کی آخری بات سے متفق نہیں تھا۔ کسی کی موت پر رنج کرنا کرنل کی شان کے خلاف تھا۔ تاہم اس نے اس موضوع پر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

× ×

وہ ایک خفیہ قسم کا نائٹ کلب تھا۔ قرب و جوار میں کئی ایک کہنہ سال اور شکستہ عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ بیشتر غیر مستقل تھیں۔ وہاں پر گزشتہ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا منظر نظر آ رہا تھا۔ راہداری نیم تاریک اور نیچی چھت والی تھی۔ کرنل اور پیٹر سر جھکاتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ عمارت کے کسی حصے سے بے ہنگم موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ وہاں میں داخل ہوئے ایک سنہری بالوں والی خوبصورت عورت نظر آئی۔ اس نے رسمی آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"جارج، تمہارے لئے فون کال ہے۔"

"اچھا، اچھا۔" کرنل نے کہا۔ "میں اسی فون کے لئے یہاں آیا ہوں اور یہ مسٹر اسمتھ ہے، برطانوی باشندہ۔"

"سنو جارج۔" عورت نے بیزاری سے کہا۔ "اگر تم کسی مقصد کے لئے اس شخص کو یہاں لائے ہو تو مہربانی کر کے یہ مقصد کہیں اور جا کر پورا کرو۔ یہاں پر پہلے ہی بہت گڑبڑ ہو رہی ہے۔ دوسری طرف خفیہ پولیس لوگوں کے کاغذات چیک کر رہی ہے۔"

"تو پھر تم مسٹر اسمتھ کو اپنے بالائی کمرے میں لے جاؤ۔ اسے کچھ دیر کے لئے یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔"

"نہیں جارج، تم کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

"ٹھہرو، میری بات سنو۔" پیٹر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میرے پاس کسی قسم کے کاغذات نہیں ہیں۔ اگر انھوں نے مجھے چیک کر لیا؟"

"اسی وجہ سے میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔" کرنل نے قدرے غصے سے کہا۔ وہ جلدی سے ٹیلیفون کی طرف جا رہا تھا۔ "اگر ڈاکٹر کے گھر میں موجود افسر نے تمہارے کاغذات طلب کر لئے تو صورت حال گڑبڑ ہو جائے گی۔ تمہیں ہر صورت یہاں انتظار کرنا پڑے گا۔"

"لیکن جارج۔" عورت نے دوبارہ اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "میری بات بھی تو سنو۔ میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ..."

"لیزا۔" کرنل نے تیزی سے کہا۔ "میرے پاس بحث کے لئے وقت نہیں ہے۔ میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ اور اسے یہاں بھی نہیں چھوڑا جا سکتا ورنہ خفیہ پولیس والے اسے پریشان کریں گے اور یہ سڑک پر بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ تم اسے بالائی منزل پر لے جاؤ۔ میری واپسی تک یہ وہیں انتظار کرے گا اور اب میں ذرا فون وصول کر لوں۔"

کرنل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ٹیلیفون بوتھ میں گھس گیا۔ پیٹر نے بے بسی کے ساتھ لیزا کی طرف دیکھا۔ کرنل کے جانے کے بعد وہ خود کو یتیم محسوس کرنے لگ گیا تھا۔ لیزا نے غصے سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کسی دن میں اسے اس کے دس ہزار دشمنوں میں سے کسی ایک کے سپرد کر دوں گی۔ اور وہ اسے عالم بالا کی طرف ٹرانسفر کر دے گا۔ ہمیشہ اپنی بات منواتا ہے۔ خصوصاً جب کسی منصوبے پر کام کر رہا ہو تو..."

دفعتاً وہ خاموش ہو گئی اور اندرونی کمرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے ایک شخص ان کے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ لیزا نے اپنے برہنہ بازو پیٹر کی گردن میں حائل کر دیئے اور اپنا خوبصورت چہرہ اس کے خوفزدہ چہرے پر جھکا دیا۔ پیٹر کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے علاوہ کبھی کسی عورت سے محبت نہیں کی تھی۔ لیزا خاصی سرگرمی دکھا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لیزا نے اسے آزاد کر دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"بچ گئے۔" اس نے کہا۔ "وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ اگر میں بروقت تمہاری مدد نہ کرتی تو تم دھر لئے گئے تھے۔"

کرنل ٹیلیفون بوتھ سے نکل کر ان کے قریب آ گیا۔ "میں جا رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "مسٹر اسمتھ کو تمہاری سایہ عاطفت میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھنا۔" دفعتاً وہ قدرے چونک کر پیٹر کے ہونٹوں کو گھورنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے میرے کہے بغیر ہی اس کا خیال رکھنا شروع کر دیا ہے۔" پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر پیٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ہونٹ مسٹر اسمتھ۔ ان رنگین مزاج عورتوں کی صحبت میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان کا رنگ عموماً کچا ہوتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ لیزا اسے پکار کر کہا۔

"لیکن جارج، ماسٹر اوپر بیٹھا ہے..."

بلکہ کرنل تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیزا نے غصے کے ساتھ دانت پیستے ہوئے کرنل کے شجرۂ نسب میں خاطر خواہ ردوبدل کر دیا۔ پھر اس نے پیٹر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"آؤ مسٹر اسمتھ۔" اسمتھ کی رہنمائی کرتی ہوئی وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک نیم تاریک راہداری تھی۔ جس کے اختتام پر ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ لیزا نے آگے بڑھ کر ایک کونے میں رکھی ہوئی الماری کا دروازہ کھولا اور پیٹر کو اندر دھکیل دیا۔ پھر خود بھی اندر داخل ہو گئی۔ دونوں کا جسم ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً چپک گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پیٹر نے کپڑوں کی سرسراہٹ سنی پھر لیزا کے بازوؤں کو حرکت کرتے محسوس کیا۔

دفعتاً اسے اپنے عقب میں دیوار سرکتی محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کے بعد دیوار ایک طرف ہٹ گئی۔ اب سامنے ایک لمبا سا کمرہ تھا۔ جس کے اندر تقریباً ایک درجن افراد نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کے دور افتادہ کونے میں ایک شخص ممبر کے پیچھے کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ پیٹر احمقانہ انداز میں آنکھیں جھپکتا ہوا اندر دیکھنے لگا۔ لیزا نے اسے کمرے میں دھکیل دیا۔ چرمی جیکٹ میں ملبوس ایک نوجوان تیزی سے آگے بڑھا اور پیٹر کے پیٹ پر پستول کی نال رکھ دی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" لیزا نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "اسے جارج نے بھیجا ہے۔"

"بہتر۔" نوجوان نے مستعدی سے کہا اور پستول کو پیچھے ہٹا کر پیشانی کے سامنے بلند کر لیا۔ نال کا رخ اوپر کی طرف تھا

"شکر زندہ باد۔" اس نے پیٹر کی طرف مڑ کر کہا

پیٹر نے قدرے بے یقینی کے ساتھ اس کی تائید کی۔

ممبر کے پیچھے کھڑا ہوا شخص پُرجوش آواز میں کہہ رہا تھا

"...وہ سب پاگل اور دیوانے ہیں۔ خواہ وہ کمیونسٹ ہوں یا سرمایہ دار... یا بگڑے ہوئے سیاست دان۔ ہماری نظروں میں ان سب کی ایک ہی حیثیت ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے خلاف نہ ختم ہونے والی سرد جنگ میں مصروف ہیں۔ انہیں لڑنے دو۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ایک نیا نظام لے کر اٹھے ہیں۔ مغربی اقوام کی قسمت اس نظام سے وابستہ ہے۔ دنیا کے اندر اس وقت مایوسی اور..." دفعتاً وہ خاموش ہو گیا اور قہر آلود نظروں سے پیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیزا۔" اس نے گرج کر کہا۔ "یہ شخص کون ہے؟"

اس کے ساتھ ہی ایک درجن سر گھوم کر پیٹر کو دیکھنے لگے۔ وہ تمام بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگ تھے پیٹر بے خیالی میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ اپنا ہی آدمی ہے جنرل رائٹر۔" لیزا نے کہا۔ "اسے جارج نے بھیجا ہے۔ یہ جارج کے ساتھیوں میں سے ہے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ہمارے بھی ساتھیوں میں سے ہے۔"

جنرل نے کہا۔ "ہم ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ جو شخص جب چاہے یہاں گھس جائے۔"

لیزا نے کندھے اچکا کر کہا۔ "جارج نے کہا تھا کہ اس کا نام اسمتھ ہے یہ انگریز ہے اور یہ کہ اس کے آنے تک میں اسے چھپائے رکھوں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"جارج!" جنرل رائٹر نے جارج کا نام دانتوں میں پیستے ہوئے کہا "میں جارج کی عجیب و غریب حرکتوں سے خاصا تنگ آ چکا ہوں۔ بلکہ یہاں اکثر ممبران یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جارج کی ہمدردیاں ان کے ساتھ نہیں ہیں غالباً وہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس کی دال روٹی کس کے ساتھ وابستہ ہے اور کیا تم نے جارج کو یہ نہیں بتایا کہ یہاں میٹنگ ہو رہی ہے...... اور اس کی حاضری لازمی ہے؟"

"جارج نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔" لیزا نے جواب دیا۔ "نیچے خفیہ پولیس کے دو آدمی دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور اس شریف آدمی کے پاس کوئی کاغذات نہیں ہیں۔ جارج نے مجھے صرف اس قدر کہا تھا کہ اسے اوپر لے جاؤ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" جنرل رائٹر نے غصے سے کہا۔ "ہرگز نہیں ہو سکتا اور ذرا اس شخص کا چہرہ تو دیکھو۔" جنرل نے پیٹر کے خوف زدہ چہرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ شخص نازی نہیں ہو سکتا۔ کیا جارج کو اس بات کا خیال نہیں آیا کہ ایک احمق انگریز کی موجودگی میں ہم خفیہ اجلاس کس طرح جاری رکھ سکتے ہیں۔ اچھی طرح سن لو۔ ہم اس شخص کا وجود برداشت نہیں کر سکتے اور یہ نا قابل تنسیخ فیصلہ ہے"

"بہت بہتر۔ بہت بہتر۔" لیزا نے کہا۔ "مجھے نیچے جا کر یہ دیکھ لینے دو کہ خفیہ پولیس کے آدمی چلے گئے یا نہیں۔ میں واپس آ کر اسے نیچے لے جاتی ہوں۔"

"ضرور لیکن ذرا جلدی کرو۔" جنرل کے ہونٹ ایک ایک لفظ پر کسی خودکار آہنی ڈھکنے کی طرح کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ جیسے ہی لیزا واپس جانے کے لیے مڑی پیٹر نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ واضح طور پر وہ ایک درجن نازی دیوانوں کے درمیان ٹھہرنے پر انتہائی خوف زدہ تھا۔ تاہم وہ لیزا کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پستول بردار نوجوان اب مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیگر تمام حاضرین اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے تھے جنرل رائٹر نے پیٹر کو مخاطب کر کے کہا۔

"بیٹھ جاؤ مسٹر اسمتھ۔ تمہارا نام اسمتھ ہے اور تمہارے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں؟"

"ہاں یہ درست ہے۔" اس نے سوچا کہ اگر وہ یہ بتا دے کہ اس کا اصلی نام پیٹر وینس ہے اور وہ انگریز نہیں بلکہ امریکن ٹورسٹ ہے تو شاید صورتِ حال مزید خراب ہو جائے۔

"تم نے سرحد کس طرح پار کی؟"

"اس کے بارے میں تو جارج ہی بتا سکتا ہے کیونکہ اس نے ہی مجھے سرحد پار کرائی ہے۔ اس نے ڈیوٹی پر متعین گارڈ کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا تھا اس کے بعد ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔"

"وہ تمہیں یہاں کیوں لایا ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "اس نے مجھے ساتھ چلنے کی درخواست کی تھی۔"

"اور تم چل پڑے؟ لہٰذا تم اس کے ساتھ کام کر رہے ہو۔ بلکہ تمہیں معلوم ہے کہ آج رات وہ کیا چکر چلا رہا ہے؟"

"نہیں، میں اس کے ساتھ کام نہیں کر رہا۔"

"تو پھر تم اس کے ساتھ کیوں گئے؟"

"میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔"

"زبردستی؟"

"پستول کی نوک پر۔"

"نہیں مسٹر اسمتھ۔" جنرل رائٹر نے اپنے ہونٹوں پر خوفناک مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تم ہمیں اس سے اچھی کہانی سنا سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے دیرینہ دوست جارج کے متعلق کوئی ایسا قصہ سنا سکتے ہو جسے سن کر ہماری طبیعت خوش ہو جائے۔ غالباً تم کچھ شرمائے ہوئے ہو۔ شاید ہم نے تمہاری خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہیں کی...."

یہ سنتے ہی حاضرین میں تین بھاری بھرکم اور قوی الجثہ آدمی آگے بڑھے۔ ایک نے اپنی جیکٹ کی جیب سے آٹومیٹک چاقو نکال لیا۔ پیٹر خوفزدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن پیچھے ہٹنا کچھ مفید ثابت نہ ہوا۔ اس کی کمر نوجوان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کے نلے سرے سے جا ٹکرائی۔ وہ ایک دم رک گیا۔ میں انہیں کیا بتاؤں؟ اس نے سوچا۔ معلوم یہ حضرات کیا سننا چاہتے ہیں؟

تینوں قوی الجثہ آدمی بن مانسوں کی طرح ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چاقو بردار شخص نے چاقو کا بٹن دبایا اور زرک سے چمکدار پھل باہر آ گیا۔

"دیکھو۔" پیٹر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم... میں"

دفعتاً عقبی دیوار میں سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور اس کے فوراً بعد پیٹر کو اپنے عقب سے لیزا کی آواز سنائی دی۔

"سب لوگ چلے گئے ہیں۔ مسٹر اسمتھ اب آپ نیچے جا سکتے ہیں۔"

"مسٹر اسمتھ نیچے نہیں جا سکتے۔" جنرل رائٹر نے کہا۔ "ہم مسٹر اسمتھ کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔"

"جنرل۔" لیزا نے جلدی سے کہا۔ "جارج نیچے موجود ہے اور وہ اسمتھ کو فوری طور پر نیچے بلا رہا ہے۔ تم جارج کی طبیعت سے بخوبی آگاہ ہو اگر اسے مطلوبہ چیز نہ ملے تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے۔ اس وقت وہ مسلح ہے اگر اس نے کوئی ہنگامہ کھڑا کیا تو اس کے نتیجے میں ہم سب کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

جنرل رائٹر سوچ میں پڑ گیا۔ پیٹر کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آنے لگے اس نے سوچا کہ کرنل لنفٹ واقعی آہنی شخصیت کا مالک ہے۔

"چلو مسٹر اسمتھ۔" لیزا نے اسمتھ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

"ٹھیک ہے۔" جنرل نے کہا۔ "جارج کو بتا دو کہ میں اس سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔"

"جنرل میں تمہارا پیغام پہنچا دیتی ہوں۔"

دونوں اسی راستے سے ہوتے ہوئے نیچے پہنچ گئے۔

"پاگل۔" لیزا نے غصے سے کہا

"شکر ہے کہ جارج واپس آ گیا۔" پیٹر نے ہال میں داخل ہونے کے بعد کہا

"جارج ابھی واپس نہیں آیا۔" لیزا نے کہا۔ "یہ چھوٹا سا جھوٹ تمہاری جان بچانے کے لیے بولنا پڑا۔ ورنہ معلوم وہ تمہارا کیا حشر کرتے۔"

"اوہ شکریہ میڈم۔" پیٹر نے کہا۔ "لیکن کیا تم ان کے ساتھیوں میں سے نہیں۔۔۔؟ نازی؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" لیزا نے جواب دیا۔ "کیا میں دیوانی نظر آتی ہوں؟ میں صرف جارج کے لیے کام کرتی ہوں لیکن مجھے جارج کی بعض باتیں سخت ناپسند ہیں۔ وہ اس قسم کے شوریدہ سر لوگوں کی کئی ایک تنظیموں سے وابستہ ہے اور یہ تنظیم یہی سمجھتی ہے کہ اس کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی دن یہ لوگ اس کے کباب بنا کر کھا جائیں گے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اب تمہارا یہاں ٹھہرنا سخت خطرناک ہے۔ میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیتی ہوں اور جارج کو دیں پر بھیج دوں گی لیکن خدا کے لیے ذرا نارمل نظر آنے کی کوشش کرو۔ تمہارے چہرے سے سخت خوف و ہراس ظاہر ہو رہا ہے...."

☆☆

وہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا نائٹ کلب تھا۔ پیٹر کونے کی میز پر تنہا بیٹھا تھا۔ کرنل کا انتظار کرتے کرتے خاصی دیر ہو گئی۔ اس کی نظریں بار بار دستی گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک رنگین مزاج اور شوخ سی لڑکی کولھے مٹکاتی ہوئی اس کے قریب آئی اور نہایت بے تکلفی سے اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور ایک ہاتھ اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کے جسم اور کپڑوں سے ملی جلی خوشبوؤں کی مہک آ رہی تھی۔

"ایک جام تو پلاؤ۔ ڈارلنگ!" اس نے پیٹر کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

پیٹر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "معاف کرنا میں شراب نہیں پیتا۔ اور آج رات تفریح کے موڈ میں نہیں ہوں۔ شکریہ!"

"دل توڑنے والی باتیں کر رہے ہو ڈارلنگ۔ تم اداس نظر آ رہے ہو۔ میں تمہارے سارے غم غلط کر دوں گی۔ چلو اوپر چلیں۔"

"اوہ نہیں۔" پیٹر نے کہا اور جیسے کا ذکر سن کر ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے ایک درجن نازی دیوانوں کا منظر گھوم گیا۔ "شکریہ میں ذرا انتہائی پسند واقع ہوا ہوں۔"

"تو جہنم میں جاؤ پیٹر۔" لڑکی غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہاں کیا کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر وہ کولھے مٹکاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

پیٹر کی میز سے کچھ فاصلے پر دو آف ڈیوٹی سپاہی بیٹھے تھے اُن کے ساتھ دو سستی قسم کی آوارہ مزاج لڑکیاں بھی بیٹھی تھیں۔ چاروں شراب پیتے ہوئے بے ہنگم قہقہے لگا رہے تھے۔ سپاہیوں کے ہاتھ آزادانہ حرکت کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ذرا اسٹائل عیاشی کر رہے تھے۔

ایک سپاہی کبھی کبھی پیٹر کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ پیٹر کے پاس سے اٹھ کر جانے والی لڑکی جب اس سپاہی کے قریب سے گزری تو اُس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی گود میں گرا لیا۔ لڑکی نے کندھے اچکاتے ہوئے کوئی بات سپاہی کے کان میں کی اور ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گئی۔ سپاہی دوبارہ پیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

پیٹر میز پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا۔ تب اُسے احساس ہوا کہ اُس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔ اس نے مایوسی کے ساتھ سوچا۔ لیزا ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مجھے نارمل نظر آنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ شاید یہ سپاہی بھی اسی لیے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ بل ادا کر کے جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ معلوم نہیں کرنل لفت کہاں رہ گیا تھا۔ جب وہ کلب کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ مذکورہ سپاہی بھی اپنی نشست سے اٹھ گیا تھا۔ خوف کی وجہ سے اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ اب کیا ہوگا؟ کہاں جاؤں گا؟ باہر تاریکی تھی۔ باہر نکلنے کے بعد وہ ہسٹریائی انداز میں ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سڑک سنسان تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مدھم روشنی کی اسٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ تقریباً پچاس گز تک بھاگنے کے بعد وہ رک گیا اور نارمل رفتار سے چلنے لگا۔ اس کے ایک منٹ بعد کلب کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہی سپاہی باہر نکل رہا تھا تاہم اب دونوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔

"اے مسٹر!" سپاہی نے پیچھے سے آواز لگائی۔

پیٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے سپاہی نے آواز نہیں لگائی بلکہ فائر کیا ہو۔ چلتے رہنا چاہیے۔ اُس نے خود سے کہا۔ یہی ظاہر کرنا چاہیے کہ میں نے اُس کی آواز سنی ہی نہیں۔ کیا مجھے دوڑنا چاہیے؟ نہیں، دوڑنا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فائر کر دے۔ فائر کا خیال آتے ہی اُس کی کمر تن گئی۔ لیکن یہ سپاہی تو اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہے کیا اس کے پاس پستول ہوگا؟

سپاہی نے دوبارہ آواز لگائی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نسبتاً قریب پہنچ چکا ہے۔ پیٹر نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

چاروں طرف رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گلیاں اور بازار ویران پڑے تھے۔ دفعتاً گلی کے دور افتادہ کونے پر ایک گاڑی مڑتی نظر آئی۔ وہ پیٹر کی طرف ہی آ رہی تھی۔ وہ اسٹیشن ویگن تھی۔ پیٹر کی حالت اُس شخص کی مانند تھی جیسے صحرا میں بھٹکتے ہوئے اچانک کوئی نخلستان نظر آ جائے۔ اُس نے سوچا یقیناً یہ گاڑی کرنل لفت کی ہے۔

پیٹر سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر گاڑی کی رفتار کم ہو گئی لیکن اچانک اس کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ غالباً کرنل نے پیچھے آنے والے سپاہی کو دیکھ لیا تھا۔ پیٹر کے چہرے پر ایک دم مایوسی کے بادل چھا گئے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب سپاہی کے ہاتھوں سے بچنا محال ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی کی بریکیں چرچرائیں اور وہ پیٹر کے بالکل برابر رک گئی۔

"جلدی!" کرنل نے تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ پیٹر فوراً اندر داخل ہو گیا۔ کرنل نے دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔

"ہے، ٹھہرو!" سپاہی نے چیخ کر کہا۔

"چل بے چوہے!" کرنل نے ایکسیلیٹر دباتے ہوئے کہا۔

"اوہ کرنل! میں سمجھا تھا کہ تم مجھے بغیر گئے چلے جاؤ گے۔"

"سپاہی پر نظر پڑنے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا تھا۔" کرنل نے کہا۔ "لیکن تمہاری بے بسی دیکھ کر مجھے رحم آ گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ محض عمر کا تقاضا ہے۔ بڑھاپا انسان کے اندر نرمی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔" ایک موڑ پر ایک بائیسکل سوار گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا تاہم کرنل نے سائیکل سوار کے بارے میں کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیزا نے تمہاری دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟"

"آہ! کرنل تم نے تو مجھے خونخوار بھیڑیوں کے بھٹ میں بھیج دیا تھا۔ اگر لیزا بروقت میری مدد کو نہ آتی تو وہ ہٹلر کے سعادت مند فرزند اب تک میری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر ڈبوں میں بند کر چکے ہوتے۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ تم مجھے کسی ناگ کے بھٹ میں بند کر دیتے۔"

"اوہ ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا سنا ہے کہ وہ کوئی میٹنگ وغیرہ کر رہے تھے۔ وہ سب گرے ہوئے بچے ہیں۔ ناکارہ سپاہی۔ پرانی یادوں سے دل بہلاتے رہتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی یہ لوگ مفید بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔"

"میں تو تمہاری طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔"

"معاملہ تھوڑا سا گڑبڑ ہو گیا تھا۔" کرنل نے اعتراف کیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا منصوبہ ناکام ہو گیا۔" پیٹر نے گاڑی کی پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کرنل لفت کے منصوبے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔" کرنل نے کہا۔ "ڈاکٹر پچھلی سیٹ پر کمبل کے نیچے پڑا ہے۔ وہ پاگل کی بچی ملازمہ کچھ زیادہ ہی ...

... لی تھی۔ اُس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر کو مقدار سے زیادہ دوائی کھلا دی جائے اور وہ جان بحق ہو جائے۔ لہٰذا اس ڈر کی وجہ سے اس نے مقررہ مقدار سے کم دوائی کھلائی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ڈاکٹر کی لاش کبھی کبھی حرکت میں آ جاتی ہے۔ پھر راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ میں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور ٹائر تبدیل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی ٹہلتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور پوچھنے لگا کہ میں اتنی رات گئے وہاں کیا کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے بھائی کی لاش لے کر گھر جا رہا ہوں۔ مجھے یہ بتانا ہی پڑا کیونکہ مردم۔ ڈاکٹر کے پیر نظر آ رہے تھے اور عین اس وقت ڈاکٹر کے پیر ہلنے لگے۔"

"اوہ میرے مالک!" پیٹر نے کہا۔ "کرنل پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اسے شوٹ کر دیا۔" کرنل نے جواب دیا۔ "اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟"

"تم نے اسے شوٹ کر دیا؟" پیٹر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "یعنی ڈاکٹر کو شوٹ کر دیا؟"

"ڈاکٹر کو نہیں سپاہی کو۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب اس کی لاش بھی پچھلے حصے میں پڑی ہے۔"

"اوہ خدا۔ ایک رات میں دو قتل۔"

"جنگ میں قتل کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔" کرنل نے کہا۔ "ہم اس قوم کے ساتھ سرد جنگ میں مصروف ہیں۔ بلاشبہ ایک روز یہ سرد جنگ اصلی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی۔ پھر ایک رات میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل بنیں گے لیکن کوئی اسے قتل نہیں کہے گا۔ بہرحال یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ مشرقی برلن کے سپاہی میرے اور میری قوم کے دشمن ہیں۔ میں انہیں ہر موقع پر ہلاک کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ قوم مجھے غازی اور ہیرو کا خطاب دے گی جس کا میں بجا طور پر اہل ہوں اور پھر یہ کام میری روزی کا ذریعہ بھی ہے۔ میں روزی کمانے کے لیے اس سے اچھا کام نہیں کر سکتا۔" اس وقت اُن کی گاڑی ایک تنگ سی گلی میں پہنچ گئی تھی۔ "فی الحال میں گاڑی کو یہاں پر چھپانا چاہتا ہوں۔ پھر ہمیں اپنے ان بن بلائے مہمانوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

"اگر گاڑی کو یہاں چھپا دیا تو ہم واپس کس طرح جائیں گے؟"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم گاڑی میں مغربی برلن جائیں گے؟ ڈاکٹر کی لاش کے ساتھ؟ نہیں دوست۔ مجھے حیرت ہے کہ تم ناول نگار کس طرح بن گئے۔ ناول نگار کو تو بہت حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ واپس جانے کے اور بہت سے عمدہ ذرائع ہیں جو زیادہ خیال افروز ہیں، سنسنی خیز! ہم ایک سرنگ کے ذریعے واپس جائیں گے۔ جس کا میں نے کئی روز پہلے انتظام کر لیا تھا۔"

پیٹر نے ایک طویل جمائی لی اور آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"جب منزل آ جائے تو مجھے جگا دینا۔" اس کی آواز میں بیزاری اور ناامیدی پائی جاتی تھی۔

***

تاحدِ نگاہ دوسری جنگِ عظیم کے کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے۔ لفت کی گاڑی ایک ایسے راستے پر چل رہی تھی جو کسی زمانے میں خوبصورت اور صاف ستھری گلی رہی ہوگی۔ اس وقت وہاں مہیب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گلی کے دونوں طرف تباہ شدہ عمارتوں کے کھنڈر خوفناک انداز میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔ گاڑی بمشکل دس میل کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔

کرنل نے ایک سیاہ رنگ کی وسیع عمارت کے سامنے گاڑی روک دی اور بتیاں بجھا دیں۔ انجن بند ہوتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

"مسٹر پیٹر، تم اس عمارت کے پچھلے حصے سے اندر جاؤ اور یہ دروازہ اندر کی طرف سے کھول دو۔" کرنل نے ایک پھاٹک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں رات بھر کے لیے گاڑی یہاں کھڑی کرنا چاہتا ہوں۔"

"گویا تم کل واپس آ رہے ہو؟"

"واضح بات ہے۔" کرنل نے جواب دیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے ڈیکی ٹاس اور مارفین کا چکر یونہی چلایا تھا؟ اب تک جلنے اچھے ڈاکٹر کی صرف موت کی تصدیق کی گئی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس کی تجہیز و تکفین بھی باقاعدہ سرکاری ریکارڈ میں آ جائے۔"

پیٹر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا عقب سے عمارت کے اندر گیا اور پھاٹک کھول دیا۔ عمارت خاصی بڑی تھی اور غالباً کسی زمانے میں وہاں پر کوئی فیکٹری وغیرہ رہی ہوگی۔

کرنل نے گاڑی کا پچھلا حصہ کھولا اور سپاہی کی لاش کو کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم ذرا اچھے ڈاکٹر کا خیال رکھنا میں اس سپاہی کو ٹھکانے لگا آؤں۔" کرنل سپاہی کو لیے ہوئے تاریکی میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"اب اچھے ڈاکٹر کو نکالنا ہے۔"

پھر اس نے گاڑی کو پھاٹک کے اندر کھڑا کر دیا اور بے ہوش ڈاکٹر کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ "ایک طرف سے تم پکڑ لو اور ایک طرف سے میں پکڑ لیتا ہوں۔" کرنل نے پیٹر سے کہا۔ "یہ... بایاں ہاتھ اپنے کندھے کے اوپر سے آگے لے آؤ اس طرح اور یہاں سے کلائی پکڑ لو... یہ! بالکل ٹھیک ہے۔"

دونوں ڈاکٹر کو لیے ہوئے کھنڈرات میں چلنا شروع ہو گئے۔ پیٹر کی حالت خاصی خراب تھی۔ قدم قدم پر اُس کے منہ سے آہ نکل جاتی تھی۔ اُسے پوری زندگی میں کبھی ایسے سخت کام سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اُس کا ذہن زمان و مکاں کے بندھن سے قطعاً بے بہرہ ہو چکا تھا۔ کرنل اُس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

"تم خوب جا رہے ہو۔ بس اب تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ دیوار کے آس پاس تین سو گز کا علاقہ ممنوعہ قرار دے دیا گیا ہے ...

بلکہ اُسے بند کر دیا گیا ہے۔ تاہم میں ایک خفیہ راستے کو جانتا ہوں۔"

ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ پیٹر نے دل میں کہا۔ تمہارے پاس ہر طرح کے ذرائع موجود ہیں۔ تمہارے لیے تمام راستے کھلے ہوئے ہیں۔ تم نہایت ہوشیار اور چالاک ہو۔ بوڑھے چمگادڑ!

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہیں بیٹھ کر پیٹنا شروع کر دے۔

"وہ سامنے ٹیلا دیکھ رہے ہو؟" کرنل نے کہا۔ "ہمیں اسی ٹیلے پر پہنچنا ہے۔"

پیٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد دونوں ٹیلے پر پہنچ گئے اور ڈاکٹر کو زمین پر لٹا دیا۔ ایک لمحے کے بعد نیچے ایک سپاہی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ اپنے سامنے روشنی کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کرنل نے ہولے سے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ ہم اس وقت کس تاریخی اہمیت کے مقام پر ہیں؟"

پیٹر نے نفی میں سر ہلایا!

"یہ اُس شکستہ بنکر BUNKER کے اندر ہیں جہاں ہٹلر کی موت واقع ہوئی تھی۔"

پیٹر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ارد گرد دیکھنے لگا۔

"تھوڑا سا سفر اور رہ گیا ہے۔" کرنل نے ڈاکٹر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم اس طرف آجاؤ۔ شاباش۔"

پیٹر نے دوبارہ ڈاکٹر کو کندھا دیا اور دونوں آگے چل پڑے۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک تاریک اور متعفن راہداری میں داخل ہوگئے۔ چند قدم چلنے کے بعد انہیں آس پاس سے سرسراہٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"چوہے۔" کرنل نے ہولے سے کہا

چند تاریک کمروں سے گزرنے کے بعد اور کئی ایک سیڑھیاں اُترنے چڑھنے کے بعد وہ ایک کھلے اور طویل صحن میں پہنچ گئے۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ آس پاس حشرات الارض کی نہ ختم ہونے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس وقت وہ آزاد علاقے میں تھے۔ دیوارِ برلن سے چند قدم کے فاصلے پر۔ پیٹر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا کہ اب وہ آزادی کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ کرنل، ڈاکٹر کے ڈھلکے ہوئے جسم کو سیدھا کرنے لگا۔ دفعتاً صحن کے دور افتادہ گوشے میں ٹارچ کی روشنی نظر آئی۔ شاید کوئی سپاہی گشت کر رہا ہے۔ پیٹر نے دہشت زدہ ہوتے ہوئے سوچا۔ کرنل کی نظر تاحال اس روشنی کی طرف نہیں گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو سیدھا کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک ڈاکٹر کے منہ سے ایک ناقابلِ فہم آواز برآمد ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی کا رخ اُن کی طرف ہوگیا۔

"جلدی، پیٹر جلدی۔" کرنل کے جسم میں چیتے کی سی پھرتی آگئی۔

دونوں ڈاکٹر کو گھسیٹتے ہوئے عمارت کی طرف بھاگے۔

"ہالٹ۔" عقب سے آواز آئی۔

دونوں ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہوگئے۔ پیٹر کا پیر فرش پر پڑے ہوئے کسی ٹین کے ڈبے سے ٹکرایا۔ جس کے نتیجے میں سخت کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی۔ کرنل نے چیخ کر کہا۔

"ڈاکٹر کو سنبھال کر رکھو۔ چھوڑنا نہیں۔"

پیٹر نے اُسی لہجے میں جواب دیا۔ "اپنا موٹا منہ بند رکھو بڈھے!"

عمارت کے ایک بغلی دروازے سے باہر نکل کر دونوں ایک دوسری عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کرنل ان پُرپیچ راستوں سے بخوبی واقف ہے۔ عمارت کا بیرونی حصہ کچرے اور کاٹھ کباڑ سے اٹا پڑا تھا۔ کرنل نے اس ڈھیر کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"اوپر۔"

دونوں اس متعفن اور گندگی کے ڈھیر پر چڑھنا شروع ہوگئے۔ اُن کے پیر بار بار پھسل جاتے تھے۔ ڈھیر کے عین اوپر ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ کرنل کا رُخ اسی دروازے کی طرف تھا۔ دفعتاً نیچے سے فائرنگ کی آواز آئی۔ پیٹر سر سے پیر تک کانپ گیا۔

"اوہ خدا۔" وہ بڑبڑایا۔ "اس گندگی کے ڈھیر پر میری موت واقع نہ ہو۔" دونوں بروقت دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔

"اب مسٹر پیٹر غور سے سنو۔" کرنل نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ پستول پکڑ لو اور اس دروازے پر ڈٹ جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو نیچے لے کر جاتا ہوں۔ وہاں بارودی سرنگ تیار ہے۔ صرف فیتے کو آگ لگانے کی دیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرار کا راستہ کھل جائے گا۔ جب تم دھماکے کی آواز سنو تو کسی چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے پہنچ جانا۔ اُس وقت تک سپاہیوں کو روکے رکھو۔"

"سنو کرنل، مجھ سے یہ کام نہیں۔"

لیکن کرنل ڈاکٹر کو لیے ہوئے تاریکی میں غائب ہوچکا تھا۔ پیٹر کو اس کے قدموں کی مدھم اور بھاری آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم پیچھے مڑ کر دروازے کی اوٹ سے باہر تاریکی میں گھورنے لگا۔ رات کے سناٹے میں سیٹی کی گونج سنائی دی اور ایک سایہ کچرے کے ڈھیر کی طرف آتا دکھائی دیا۔

"خبردار۔" پیٹر نے چیخ کر کہا۔ "آگے نہیں بڑھنا ورنہ شوٹ کر دوں گا۔"

وہ سایہ رک گیا اور ایک دم دو حصوں میں تقسیم ہو کر دائیں بائیں اوٹ میں چلا گیا۔ غالباً وہ دو سپاہی تھے۔ دفعتاً ایک نے فائر کھول دیا۔ پیٹر فوراً اوٹ میں ہوگیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی دروازے سے اندر داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ کچھ دیر کے بعد نیچے خاموشی ہوگئی۔ پیٹر نے احتیاط کے ساتھ نیچے جھانکا اور ایک سائے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ بائیں طرف سے جوابی فائر ہوا اور

دروازے کی پٹی کی کرچیاں اُڑ گئیں۔ رائفل کے شعلے سے پیٹر کو اپنے ٹارگٹ کا صحیح اندازہ ہوگیا۔ جیسے ہی تھوڑا سا وقفہ ہوا اس نے بائیں طرف نظر آنے والے سائے پر دو فائر جھونک مارے۔ اس کے ساتھ ہی وہیں سے ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ دائیں طرف والے نے ایک بار پھر فائر کھول دیا۔ پیٹر نے اپنی پوزیشن تبدیل کرلی۔ اب وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے پھر ڈٹ کر فائر کرنا شروع کر دیا۔ اچانک پستول کی گولیاں ختم ہوگئیں۔ اُسے اس بات کا خیال نہیں تھا کہ گولیاں ختم بھی ہوسکتی ہیں۔ اوہ مالک! اب کیا ہوگا؟

عین اس وقت ایک زوردار دھماکا ہوا جس سے پوری عمارت لرز گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ کرنل لفٹ نے دیوارِ برلن میں شگاف کر دیا تھا... دھماکے کی آواز سنتے ہی وہ بقول لفٹ، کسی چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا نیچے کی طرف بھاگا۔ تاریکی کے باوجود وہ نہایت تیزی کے ساتھ زینے طے کرتا جا رہا تھا۔ نیچے کمرے کے اندر ہر طرف دھواں اور بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر شکستہ اینٹوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ تہہ خانے کے دور افتادہ گوشے میں ایک کشادہ سوراخ نظر آرہا تھا۔ پیٹر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا کیونکہ دھوئیں کی وجہ سے کھڑے ہو کر چلنا خاصا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔

"پیٹر، پیٹر۔" اسے کرنل کی سرگوشی سنائی دی۔ "جلدی سے اس طرف آجاؤ۔ میں ادھر ہوں۔ ڈاکٹر کو باہر نکالنے میں میری مدد کرو۔"

پیٹر نے کرنل کے قریب پہنچ کر کہا۔ "کرنل اس ڈاکٹر کو چھوڑو اور اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ سپاہی ہمارے تعاقب میں ہیں۔ میں تو باہر جا رہا ہوں۔" کمرے کی بیرونی دیوار میں جو سوراخ نظر آرہا تھا وہ کم از کم دس فٹ چوڑا اور چھت تک اونچا تھا۔ پیٹر تیزی سے سوراخ کی طرف بڑھنے لگا۔

"پیٹر، میری مدد کرو۔" کرنل نے زور دے کر کہا۔ "میں زخمی ہو چکا ہوں اور اکیلا ڈاکٹر کو باہر نہیں نکال سکتا۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔"

تب پیٹر کو خیال آیا کہ کرنل بارود کے دھماکے سے زخمی ہوگیا ہوگا۔ وہ تیزی سے واپس مڑا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر کرنل کو تلاش کرنے لگا۔ وہ ایک بڑی سی میز کے نیچے بیٹھا تھا اور ڈاکٹر قریب ہی فرش پر پڑا تھا۔ اوپر سے کسی کے بھاری بوٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ واضح طور پر سپاہی انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک لمحے کے بعد دور سے کسی سائرن کی آواز سنائی دی جو تیزی سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ صورتِ حال انتہائی سنگین تھی۔ پیٹر نے تیزی کے ساتھ ڈاکٹر کو سیدھا کھڑا کیا۔ پھر خود اس کے سامنے آگیا اور اُس کے دونوں بازوؤں کو اپنے کندھے پر سے سامنے کی طرف لا کر اُسے بوری کی مانند پشت پر لاد لیا۔ "کرنل تم خیریت سے تو ہو؟"

"میرے بائیں کندھے میں سیمنٹ کا ٹکڑا گھس گیا ہے۔" کرنل نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میرا بایاں بازو بالکل ناکارہ ہوگیا ہے۔ لیکن میں چل سکتا ہوں۔ تم ڈاکٹر کو لے کر چلو۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔"

پیٹر ڈاکٹر کو تقریباً گھسیٹتا ہوا سوراخ کی طرف لے چلا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ اُسے اپنی زندگی کا طویل ترین سفر معلوم ہو رہا تھا۔

☆☆

وہ دونوں برساتی کوٹ میں ملبوس تھے اور تاریکی میں سے اچانک وہاں نمودار ہوگئے تھے۔ دونوں تیزی اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھے۔ ایک نے بے ہوش ڈاکٹر کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور دوسرے نے کرنل کو سہارا دیا۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ پیٹر نے اندازہ لگایا کہ دونوں سی آئی اے کے آدمی تھے اور کرنل کی ہدایت کے مطابق وہاں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کی کار کھڑی تھی۔ ایک آدمی ڈاکٹر اور کرنل کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اس کے ساتھ ہی کار تیزی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ نصف گھنٹے کے بعد گاڑی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے پہنچ گئی۔ ڈرائیور نے پیچھے جھک کر کار کا دروازہ کھولا اور کرنل کو مخاطب کر کے کہا۔

"تمہیں اکیلے چھوڑ کر جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن ڈاکٹر کو فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچانا ضروری ہے۔ اس لیے معذرت چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" کرنل نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "آج رات مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں۔ آؤ مسٹر پیٹر۔"

پیٹر دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ باہر آتے ہی اُس کے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ نہ معلوم یہ باہر کی ٹھنڈی ہوا کا اثر تھا یا اُس کا اعصابی نظام کچھ گڑبڑ ہوگیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر کہا۔

"آج تم نے بہت عمدہ کام کیا ہے، براؤن۔"

اس کے ساتھ ہی گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پیٹر عجیب نظروں سے کرنل لفٹ کو گھورنے لگا۔

"کرنل لفٹ، کرنل جارج، یا کرنل براؤن؟ اس وقت آپ جناب کو کس نام سے پکارا جاتا ہے؟"

"سیاست میں سب چلتا ہے۔" کرنل نے لاپروائی سے کہا۔ "اب جلدی کرو۔ کندھے کی پٹی کروانے کے بعد واپسی کا پروگرام ترتیب دینا ہے۔"

"محترم جارج براؤن صاحب اب کسی اور کو تلاش کرلو۔ بندہ اب مشرقی برلن جانے کے قابل نہیں رہا۔"

"یقینی بات ہے۔" کرنل نے کہا۔ "اب تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگیا ہوگا کہ کہانی لکھنا آسان ہے لیکن کہانی بننا بہت مشکل ہے۔"

صفدر صدیقی

ملبیز کرافورڈ اپنے لائبریری روم میں بیٹھا ہوا اپنے دوست اور پارٹنر سام بروڈی سے باتیں کر رہا تھا۔ کرافورڈ جس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی، بروڈی کے ساتھ مل کر قانون کی پریکٹس کرنے سے قبل ایک کامیاب کیریکٹر ایکٹر رہ چکا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ کمرے میں کچھ زیادہ خنکی محسوس کرتے ہوئے کرافورڈ نے اپنی ملازمہ مینی کو برقی آتش دان کھولنے کی ہدایت کی۔ دونوں دوست ایک حالیہ مقدمے کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے جس کا تعلق کار کے ایک حادثے سے تھا۔ گفتگو کے دوران کرافورڈ نے تاش کھیلنے کی تجویز پیش کی، اور ابھی وہ اپنی میز کی دراز سے تاش کی ایک نئی گڈی نکال کر اسے کھول ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلنے اور پھر زور سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

"یہ ٹوڈ ہوگا۔" کرافورڈ نے کہا۔ ٹوڈ اس کے نوجوان بیٹے کا نام تھا۔ "تعجب ہے آج وہ اتنی جلدی واپس آگیا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیرونی دروازے کے ہال میں داخل ہوا۔ یہ بلاشبہ ٹوڈ ہی تھا۔ اور اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر کرافورڈ فکرمند ہوگیا۔ ٹوڈ کی عمر اکیس بائیس سال تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح چھریرے جسم کا مالک مگر قد میں اس سے زیادہ لمبا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بھورا تھا جو اس نے اپنی ماں (کرافورڈ کی دوسری بیوی ایلینا) سے لیا تھا لیکن چہرے کے خدوخال بیشتر کرافورڈ سے مشابہت رکھتے تھے۔ ٹوڈ اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی پکڑے ہوئے تھا۔

"آج کیا بات ہے کہ رات کے دس ہی بجے واپس آگئے؟" کرافورڈ نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔

ٹوڈ نے باپ کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب دیئے بغیر زینے کی طرف بڑھ گیا جو مکان کی دوسری منزل کی طرف جاتا تھا۔

"ٹوڈ!" کرافورڈ نے اپنے لہجے کو کسی قدر نرم بناتے ہوئے کہا "کم سے کم میری بات کا جواب تو دے سکتے ہو۔"

"میں اوپر جا رہا ہوں۔" ٹوڈ نے کہا۔ اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر چلا گیا۔ کرافورڈ نے اس کے بیڈروم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اتنی دیر میں سام بھی باہر ہال میں آگیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا "لڑکے کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیوں نہیں، بالکل ٹھیک ہے۔ اس چیتے کی طرح جو اپنے شکار کو چیر پھاڑ کر اپنا پیٹ بھر چکا ہوتا ہے۔" کرافورڈ نے غصے سے جواب دیا۔ "تم اتنی مدت سے اسے جانتے ہو پھر بھی اس کے مزاج سے واقف نہیں ہوسکے۔"

سام زینے کی طرف بڑھا۔ وہ کسی خاص چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟" کرافورڈ نے بدستور غصے میں کہا۔ "چلو چل کر تاش کیوں نہیں کھیلتے۔"

"ملبیز!" سام نے کہا "ذرا دیکھنا مجھے ہی شبہ ہو رہا ہے یا یہاں سچ مچ کسی کا خون گرا ہے۔"

کرافورڈ، سام کے قریب پہنچا اور جہاں سام نے اشارہ کیا تھا وہاں جھک کر قالین کو دیکھنے لگا۔ قالین پر بلاشبہ کسی چیز کا دھبا موجود تھا۔ کرافورڈ نے انگلی سے اس دھبے کو چھوا اور اس سرخ چیز کو دیکھنے لگا جو اس کی انگلیوں کے سروں پر لگ گئی تھی۔ پھر اس نے زینے سے بیرونی دروازے تک جا کر دیکھا۔ خون کے دھبے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دروازے تک چلے گئے تھے۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ اوپر چلوں؟" سام نے پوچھا۔

کرافورڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ اور بہ یک وقت دو دو سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر جا پہنچا۔ معمول کے مطابق وہ دروازے پر دستک دینے کے لئے بھی نہیں رکا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بیٹا کبھی خوشی کے ساتھ اسے اپنے کمرے میں خوش آمدید نہیں کہتا مگر اس وقت اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر داخل ہوگیا۔

ٹوڈ نے اپنا جیکٹ اتار دیا تھا اور اس وقت باتھ روم سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی آستین چڑھی ہوئی تھی اور کلائی پر ایک سفید تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی اس مداخلت پر کسی قدر تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن غصے کے علاوہ اس کے طرزِ عمل میں کسی قدر جرم و پشیمانی کا تاثر بھی معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا تمہیں یہ چوٹ کیسے آئی؟" کرافورڈ نے پوچھا۔

بیٹے سے محبت کرنے والے ایک باپ کی تاثر انگیز کہانی
ہنری سلاسر نے اسے تحریر کیا ہے:

"یونہی معمولی خراشیں آگئی ہیں۔" ٹوڈ بڑبڑایا۔ "کار کا ایک چھوٹا سا حادثہ ہوگیا تھا۔ مگر کوئی خاص بات نہیں۔"

"یہ خراشیں معمولی تو نہیں کہی جاسکتیں۔" کرافورڈ نے کہا۔ "کافی خون نکل رہا ہے۔ ذرا مجھے دیکھنے دو۔"

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر ٹوڈ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"میں نے کہا نا کہ کوئی خاص بات نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "آخر آپ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔"

اتفاق سے تولیے کا ایک سرا کھل گیا۔ کرافورڈ نے دیکھا کہ ٹوڈ کی کلائی پر کافی گہرا زخم نظر آرہا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس طرح لاپروائی سے زخم خراب بھی ہوسکتا ہے۔ مگر یہ زخم آیا کیسے۔ کیا تمہارا کسی سے جھگڑا ہوگیا ہے۔؟"

"آپ کی کار بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں کار کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر بات کیا ہوئی ہے۔؟" اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کا کندھا پکڑ لیا۔ "تم کہتے ہو کہ حادثہ ہوا ہے۔ مگر کس قسم کا حادثہ؟"

"سچ ہی سننا چاہتے ہیں تو کار کا کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے۔" ٹوڈ نے کہا۔ "میری کسی سے لڑائی ہوگئی تھی۔"

"لڑائی۔ کیسی لڑائی۔؟"

"جیسی ہوا کرتی ہے۔"

اسی وقت سام پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ "ملبیز!" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم میرے ساتھ نیچے چلو۔"

"کیا بات ہے۔؟" کرافورڈ نے پوچھا۔

"باہر پولیس کی ایک کار آکر رکی ہے۔" سام نے بتایا۔ "وہ ایک منٹ میں اندر آنے والے ہیں۔ ٹوڈ تو ٹھیک ہے؟"

اس نے کمرے میں دیکھا۔ ٹوڈ فرش پر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

"پولیس!" کرافورڈ چونکا اور تیز نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ "تو یہ معمولی سی لڑائی تھی۔ آخر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں میں بتا چکا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"ملینر تم جلدی سے نیچے چلو۔" سام نے پھر کہا۔

وہ دونوں ایک ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئے۔ ٹوڈ نے ان دونوں کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ جس وقت وہ بیرونی ہال میں پہنچے تو دروازے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

"زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں مسٹر کرافورڈ۔" پولیس آفیسر نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا تمہارا لڑکا ٹوڈ کرافورڈ گھر پر موجود ہے۔ روڈ نمبر چار پر ایک واردات ہوگئی ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں؟"

دروازہ کھلتے ہی دونوں پولیس آفیسر اندر آگئے تھے۔ ایک نے کرافورڈ کو مخاطب کیا اور دوسرا خاموشی سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا تھا۔

پولیس آفیسر کی بات سن کر کرافورڈ نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور تھوڑی دیر میں ٹوڈ زینے پر نمودار ہوا۔ اس کی کلائی پر تولیہ ابھی تک لپٹا ہوا تھا اور سیدھے کندھے پر ——— جیکٹ لٹک رہا تھا۔ ایک لمحہ ہچکچاہٹ کے بعد ٹوڈ نیچے اترنے لگا۔ "تمہارا نام ٹوڈ کرافورڈ ہے۔؟"

"ہاں!" "دیکھو آفیسر......"

کرافورڈ نے ان دونوں کے درمیان آنے کی کوشش کی مگر پولیس آفیسر نے اسے نرمی سے سمجھایا کہ وہ کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔ اس صورت حال پر ٹوڈ کے ہونٹوں پر ایک سرد مسکراہٹ ابھری۔

"غالباً تم لوگ میرے والد سے واقف نہیں ہو۔" اس نے کہا۔ "کیا تم نے کبھی ملینر کرافورڈ مشہور فلمی اداکار کا نام نہیں سنا۔؟"

پولیس آفیسروں نے کرافورڈ کی جانب دیکھا۔ مگر ان کی نظریں کسی قسم کی دلچسپی یا پہچان کے تاثر سے خالی تھیں۔

"میں کوئی مزاحمت نہیں کروں گا۔" ٹوڈ نے پولیس آفیسروں سے کہا۔ "کیا مجھے اپنے ساتھ کچھ چیزیں لے جانے کی اجازت ہے۔؟"

"لیکن اس نے کیا کیا ہے؟" کرافورڈ نے بیتابی سے پوچھا۔ "خدا کیلئے ذرا سوچو تو۔ تم اسے کسی بھی قسم کی وضاحت پیش کئے بغیر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ یہ کہاں تک درست ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔؟"

"ہاں ہمارے پاس وارنٹ ہے۔" پہلے آفیسر نے جواب دیا۔ "تمہارے بیٹے کا جھگڑا جولیس بربین نامی ایک لڑکے سے ہوگیا تھا۔ یہ جھگڑا روڈ نمبر چار پر ہوا تھا۔ اس لڑکے کو چاقو کے سنگین نوعیت کے زخم آئے ہیں۔"

"کیا اس کی حالت خطرے میں تو نہیں ہے؟" کرافورڈ نے پوچھا۔

مگر پولیس آفیسر اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ وہ ٹوڈ سے مخاطب ہوا۔ "تم اپنے ساتھ وہ چیزیں لے جا سکتے ہو جن کی تمہیں رات میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو وہ کل صبح تمہارے والد پہنچا سکتے ہیں۔" وہ گھوم کر کرافورڈ سے بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔ لیکن ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔"

"میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔" کرافورڈ نے جلدی سے ہال کی الماری سے اپنا کوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا تعلق کس پولیس چوکی سے ہے۔؟"

"آٹھویں پولیس چوکی سے۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ "لیکن اس وقت تمہارے ساتھ جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مناسب ہوگا کہ صبح تک انتظار کرو۔"

"تم فکر مت کرو۔" کرافورڈ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "میں تمہاری ضرورت کی چیزیں پہنچا دوں گا۔ پھر صبح کو ہم تمہیں ضمانت پر رہا کرالیں گے۔"

"مسٹر کرافورڈ۔" دوسرا پولیس آفیسر بولا۔ "ضمانت کے بارے میں اتنی امید مت رکھو۔ تم خود ایک وکیل ہو اور تمہیں ان باتوں کے بارے میں زیادہ علم ہونا چاہئے۔" "کیا مطلب ہے تمہارا۔؟"

"وہ لڑکا جولیس بربین مر چکا ہے۔"

○

جس وقت وہ گھر واپس آئے تو رات کے دو سے زیادہ بج چکے تھے۔ ان کے ساتھ جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ٹوڈ کو قتل کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات پہنچا دیا گیا تھا اور انھیں اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک ڈسٹرکٹ پولیس ڈیٹیکٹو رانفیل نے ان سے دس منٹ تک گفتگو کی۔ مگر وہ چند حقائق کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں کر سکے۔ پولیس کے کہنے کے مطابق ٹوڈ دو اور لڑکوں کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ انھوں نے ضرورت سے زیادہ شراب بھی پی رکھی تھی۔ راستے میں ان کے درمیان جھگڑا ہوا۔ جس کے درمیان چاقو نکل آئے۔ ٹوڈ نے اپنے مدمقابل جولیس بربین کو گہرے زخم لگائے۔ جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوگئی اور اس وقت اس کی لاش پولیس کے سرد خانے میں رکھی ہوئی تھی جہاں جولیس کی مطلقہ ماں روتے ہوئے اپنے شوہر کو ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ اور جب سام اور ملینر گھر واپس پہنچے تو ملینر اپنے آپ کو اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میری زندگی کس طرح گزری ہے۔ پہلے ہالی وڈ کی دن رات کی مصروفیات و ہنگامہ خیزی پھر حادثہ اور اس کے بعد یہ محدود آمدنی والا قانونی مشوروں کا دفتر......"

"ختم بھی کرو۔" سام بولا۔ "آخر اب ان باتوں سے کیا حاصل ہوگا۔"

"پھر ملینا نے مجھ سے طلاق لے لی لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔" کرافورڈ اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے ٹوڈ کے خیال سے دوبارہ شادی کرنا پڑی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ فیرن اس قسم کی عورت نہیں تھی جن میں مامتا کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن ٹوڈ ایک بے حد ضدی سرکش اور جذباتی لڑکا تھا۔ اگر تنگ آکر وہ اپنی کوشش سے دست بردار ہوگئی تو اس میں اس کا اتنا زیادہ قصور نہیں تھا۔"

"اب تمہیں آرام کرنا چاہئے ملینر۔" سام نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد حالات تبدیل ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے ایک اچھی اور نارمل زندگی گزارنے کے قابل بنا سکوں گا۔ مگر اس کی فطرت میں ایک طرح کی سرد مہری بلکہ سنگدلی رچ بس گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حد سے زیادہ شراب پینے لگا تھا۔ پولیس کہتی ہے کہ وہ آج رات بھی نشے میں تھا اور اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ یہ بات تو اس کے حق میں جا سکتی ہے سام۔ کیوں جا سکتی ہے نا۔؟"

"تم قانون کو جانتے ہو ملینر۔" سام نے کہا۔ "کوئی نشے میں ہو یا ہوش میں لیکن کوئی جیوری قتل جیسے سنگین جرم کو پسند نہیں کرتی۔"

"میں خود ان سے بات کروں گا۔" کرافورڈ نے کافی کی میز پر گھونسے مارتے ہوئے کہا۔ "میں انھیں بتاؤں گا کہ میں ایک باپ کے فرائض ادا کرنے میں کس طرح ناکام رہا۔ تب وہ محسوس کریں گے کہ اصل میں ٹوڈ کا اتنا قصور نہیں جتنا میرا ہے۔"

اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ سام نے اس کے قریب آکر ——— اسے تسلی دینا چاہی۔ لیکن وہ رو نہیں رہا تھا۔ وہ صرف اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔ سام نے میز پر رکھا ہوا لیمپ بجھا دیا اور اپنے دوست کو آرام کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ اچانک کرافورڈ بول اٹھا۔

"آخر کیوں۔ آخر کیوں میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیا نہیں کر سکتا۔؟"

"میرا مطلب ہے کہ میں ٹوڈ کی جانب سے وکیل صفائی کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو ملینر تم فوجداری کے وکیل نہیں ہو۔" سام نے کہا۔ "دیوانی کے مقدمات کی بات اور ہے لیکن فوجداری..... اور وہ بھی قتل کا کیس..... کیا تم سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔؟"

"بیشک۔" کرافورڈ نے جواب دیا۔ "میں بار کا ممبر ہوں۔ اور ملک میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے کہ تم اپنے کسی عزیز کیلئے وکیل صفائی کی حیثیت سے پیش نہیں ہو سکتے۔ مجھ سے زیادہ اچھی طرح کون یہ کام کر سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں ایک فوجداری وکیل کی خدمات حاصل کرلوں گا جو مقدمہ لڑے گا۔ لیکن تم جانتے ہو سام کہ جیوری کیا ہوتی ہے۔ بارہ افراد کا ایک گروہ جسے تمہیں متاثر کرنا ہوتا ہے۔ تمہیں ان کے سامنے بات کو اس انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے جس طرح تم اسے محسوس کرتے ہو۔ اور یہ کام ایک باپ سے زیادہ اچھی طرح کون کر سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے ایک باپ یا ایک اداکار۔؟"

"کیا یہ اتنی ہی معیوب بات ہے۔" کرافورڈ نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ میں نے ایک درجن سے زیادہ فلموں میں وکیل کا کردار ادا کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہالی وڈ چھوڑنے کے بعد میں نے قانون کی ڈگری لینے کا ارادہ کر لیا لیکن مجھے فوجداری مقدمات کا تجربہ ہو یا نہ ہو مجھے یقین ہے کہ ٹوڈ کا کیس لڑ سکتا ہوں۔"

"کچھ بھی سہی۔" کرافورڈ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں کل چارلس سکلیمو کو فون کروں گا اور اس سے کہوں گا وہ کسی اچھے فوجداری وکیل کا نام بتائے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

○

جس وقت دوسری صبح آٹھ بجے کرافورڈ نے چارلس کو فون کیا تو وہ سو رہا تھا۔ اور اس طرح اٹھائے جانے پر بگڑا ہوا بھی تھا لیکن جب اسے وجہ معلوم ہوئی تو اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ انھوں نے تقریباً نصف گھنٹہ گفتگو کی جس کے آخر میں کرافورڈ نے اپنے پیڈ پر ایڈون سی۔ ویٹھ فورڈ نامی وکیل کا پتہ وغیرہ تحریر کیا۔ سام کی طرح چارلس بھی اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ خود کرافورڈ بھی اپنے بیٹے کے مقدمے میں پیش ہو۔ مگر اس نے زیادہ بحث نہیں کی اور یہ معاملہ ایڈون کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

اور جس وقت کرافورڈ نے ایڈون کے سامنے یہ تجویز پیش کی تو سام یا چارلس کے برخلاف اس نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی۔ ایڈون ایک ہوشیار وکیل تھا اور اس نے جس طرح ٹوڈ کے کیس کا قانونی پہلو سے تجزیہ کیا تھا وہ کرافورڈ کو کافی پسند آیا۔ جہاں تک کرافورڈ کی تجویز کا تعلق تھا تو اس سلسلے میں اس نے کہا۔

"تم ایک سند یافتہ وکیل ہو اور میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ تم اپنے بیٹے کے مقدمے میں پیش نہ ہو سکو۔ یہ الگ بات ہے کہ مقدمے سے تمہارا ذاتی تعلق ایک رکاوٹ بن سکتا ہے۔ تم نے وہ مثل تو سنی ہوگی کہ جو شخص خود اپنا وکیل بننا چاہتا ہے وہ عموماً وکیل سے زیادہ احمق ثابت ہوتا ہے۔"

"میں تمہیں اس سے بہتر قول سنا سکتا ہوں۔" کرافورڈ نے جواب دیا۔ "آدمی شاید ہی کسی قانون کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے سوائے اس کے جسے وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔"

"اور تمہارا خیال یہ بھی ہے کہ تم ارکان جیوری کو اپنا احساسات محسوس کرا سکتے ہو۔ ان کے جذبات ابھار سکتے ہو۔"

"ہاں۔ آخر میں ٹوڈ کا باپ ہوں۔"

"لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ چارلس نے مجھے بتایا تھا کہ تم فلمی اداکار رہ چکے ہو۔"

"یہ ایک طویل مدت پہلے کی بات ہے تقریباً ۱۹۲۰ء کی۔ میری آخری فلم ۱۹۳۳ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اور ۱۹۴۰ء سے میں قانونی وکیل کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ بہرحال مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں ایک اداکار رہ چکا ہوں اور لوگوں کو اپنے جذبات محسوس کرا سکتا ہوں۔ یہ میرا پیشہ تھا۔" ایڈون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑے غور سے کرافورڈ کو دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہارے فرائض میں حارج ہونا نہیں چاہتا۔" کرافورڈ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "میں صرف اپنا پارٹ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے آخری الفاظ تاثر کے اعتبار سے غلط فہمی پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن کرافورڈ نے ان کی وضاحت یا تصحیح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"ہم دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔" آخر ایڈون نے جواب دیا۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے نزدیک اصل اہمیت میرے موکل کی ہے۔ کیا نام ہے اس کا...؟" "ٹوڈ۔"

"میرا خیال ہے کہ آخر اسے بھی تو رائے دینے کا حق پہنچتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ وہ اس بات کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سے بھی پوچھ لینا چاہئے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" دفعتاً کرافورڈ نے کہا۔ "میں اس سے ضرور معلوم کروں گا۔" اگلے دن کرافورڈ ٹوڈ سے ملنے گیا۔

"یہاں جیل میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

ٹوڈ شانے اچکا کر رہ گیا۔ وہ اس ملاقات سے ابھی سے بیزار نظر آنے لگا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" کرافورڈ نے اسے تسلی دینا چاہی۔ "میں مسٹر ایڈون سے بات کر چکا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم تمہیں ضمانت پر رہا نہیں کرا سکتے مگر......"

"مقدمہ عدالت میں کب پیش کیا جائے گا؟" ٹوڈ نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"شاید اگلے ہفتے میں کسی دن۔" کرافورڈ نے جواب دیا۔ "اور اس وقت ہم عدالت کے سامنے تمہیں غیرارادی طور پر قتل کا مرتکب قرار دیئے جانے کی درخواست پیش کریں گے۔ تم دونوں باتوں کا فرق سمجھتے ہو نا؟"

ٹوڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"قتل عمد وہ ہوتا ہے جس میں کوئی باقاعدہ ارادے اور منصوبہ بندی کے بعد کسی کو قتل کرتا ہے اور قتل غیرارادی وہ ہوتا ہے جس میں کسی وقتی بات یا وقتی جذبے سے اشتعال میں آ کر کسی کو قتل کر دیتا ہے جبکہ حقیقتاً اس کا کوئی ارادہ اس شخص کو قتل کرنے کا نہیں ہوتا اور نہ اس نے اس کی پہلے سے کوئی تیاری کی ہوتی ہے۔ یقیناً تمہیں مسٹر ایڈون نے اس بارے میں بتایا ہوگا۔"

"وہ مجھ سے دو گھنٹے تک بات کرتا رہا۔ مگر میں اس کی تمام باتیں نہیں سمجھ سکا۔" ٹوڈ نے جواب دیا۔

"میری بات غور سے سنو ٹوڈی۔" کرافورڈ اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ "میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایک بہت ہی اہم بات۔"

"کیا...؟" "اگر میں تمہارے وکیلِ صفائی کی حیثیت سے پیش ہوں تو تمہارے احساسات کیا ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ تنہا نہیں۔ تمام کام ایڈون ہی کرے گا۔ لیکن وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت میں بھی کچھ بول لیا کروں گا۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو...؟"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ بولا۔ "آپ فوجداری کے وکیل تو نہیں ہیں۔"

"بیشک میں نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے میں اچھی طرح جرح یا بحث نہ کر سکوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھ سے کچھ احمقانہ غلطیاں ہو جائیں بلاشبہ ایسے مواقع پر ایڈون میری مدد کرے گا لیکن پھر بھی میں غلطیاں کر سکتا ہوں۔ مگر اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ میں جیوری کو اپنی بات سننے اور سمجھنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔" وہ ایک لمحے کیلئے رکا۔

"لیکن یہ میں اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک تم خود اس کی اجازت نہ دو۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ ہے اور تمہیں انکار کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔"

"آپ میرے لئے یہ سب کچھ کریں گے۔" ٹوڈ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

کرافورڈ نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے ہیں۔ "ہاں یہ اور جو کچھ بھی میرے بس میں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ ڈیڈی۔" بے اختیار ٹوڈ کے منہ سے نکلا۔ اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے باپ کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔ اور اس کی نظروں سے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے والد کو زندگی میں پہلی مرتبہ ایک باپ کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔

○

لیکن ٹوڈ کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوتے ہی ایڈون کے طرزِعمل میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ وہ ہر روز کرافورڈ سے اس بات پر بحث کرتا کہ خود وکیل صفائی کی حیثیت سے پیش ہو کر وہ ایک مہلک غلطی کر رہا ہے اپنے بیٹے کی زندگی سے کھیل رہا ہے۔ اور یہ کہ عدالت میں وہ اپنا مذاق اڑوانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر کرافورڈ نے عدالت میں فلمی ڈائیلاگ بولنے کی کوشش کی یا اس طرز کا ڈرامائی انداز اختیار کرنا چاہا تو وہ مقدمہ سے دست بردار ہو جائے گا۔ لیکن اس تمام لفاظی کے باوجود وہ دوسری طرف کرافورڈ کو وکیل صفائی کی حیثیت سے پیش ہونے کیلئے تیاری بھی کرا تا...... جا رہا تھا۔ وہ اسے مختلف مقدمات کے پیراگراف سناتا اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ انھیں ٹوڈ کے مقدمے کو کس انداز میں عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے۔

"اس مقدمے میں تمام انحصار اس بات پر ہے کہ آیا ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں یا نہیں کہ ٹوڈ نے جولیس کو کسی پیشگی ارادے اور تیاری کے بغیر قتل کیا تھا۔" "لیکن کیا ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں؟" کرافورڈ نے پوچھا۔ "تم ٹوڈ کا بیان سن چکے ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ جب زبانی جھگڑا حد سے بڑھ گیا تو انھوں نے اسے لڑ کر طے کرنا چاہا۔ خاص اسی مقصد کے لئے کار ایک مقام پر روکی، باہر نکلے اور لڑنا شروع کر دیا۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے چلے ہیں۔"

"کیا واقعی وہ جانتے تھے؟" ایڈون نے کہا۔ "ہمیں یہی دکھانا ہے کہ انھیں اس کے انجام کا ادراک نہیں تھا اور یہ احساس ہو نا یا نہ ہونا ہی وہ نازک فرق ہے جو ایک قتل عمد اور قتل غیرارادی کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ ہمیں یہی فرق ثابت کرنا ہے۔ ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ان دونوں کی لڑائی کے درمیان ایک لمحہ کا وقفہ بھی ایسا نہیں آیا جب انھیں عقل و ہوش کے ساتھ حالات کو سمجھنے کا موقع ملتا۔ وہ دونوں اشتعال کی حالت میں تھے اور دونوں ہی اس لڑائی کے انجام سے ناواقف تھے۔ یہ ثابت کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوگی۔ خاص طور سے اس صورت میں جبکہ سرکاری وکیل کے فرائض بینیلے انجام دے رہا ہے۔ وہ بہت سخت آدمی ہے۔ اور ان لوگوں میں سے ہے جو آنکھ کے بدلے آنکھ کے اصول کے قائل ہوتے ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" کرافورڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن شاید یہ ہی مناسب ہو کہ تم خود ہی وکیل صفائی کا فرض انجام دو۔"

"تم دل سے یہ بات کہہ رہے ہو...؟"

"نہیں۔" کرافورڈ نے ایک گہری سانس لی۔ "تم خود کہہ چکے ہو کہ یہ مقدمہ محض حقائق کی بنیاد پر نہیں لڑا جا سکتا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس وقت ٹوڈ کے دل میں کیا خیالات تھے۔ اور میں یہی کام کرنا چاہتا ہوں کہ انھیں ٹوڈ کے اور اپنے جذبات و خیالات محسوس کرا دوں۔"

اس شام کرافورڈ اپنے گھر واپس پہنچا تو اس نے وہاں چار رپورٹروں کو موجود پایا۔ سام بھی اس کا انتظار کر رہا تھا اور اس نے کہا بھی وہ باہر جا کر رپورٹروں کو ٹال دے مگر کرافورڈ نے جواب دیا کہ نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اسے پریس کا تعاون حاصل ہو اور یہ بات ٹوڈ کے حق میں بہتر ہوگی۔

چنانچہ رپورٹروں کو اندر بلا لیا گیا۔ اور انھوں نے آتے ہی کرافورڈ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کرافورڈ، ٹوڈ کی صفائی پیش کرنے کے لئے کیا پروگرام رکھتا ہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے فلمی دنیا سے کرافورڈ کے تعلق کے بارے میں سوالات شروع کئے تو سام نے انھیں روکنا چاہا مگر کرافورڈ نے کہا کہ رپورٹر جو کچھ بھی پوچھنا چاہیں انھیں پوچھنے دیا جائے۔

"مسٹر کرافورڈ کیا آپ فلموں میں وکیل کا کردار نہیں ادا کرتے رہے ہیں؟" ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

"یہ درست ہے۔ لیکن موجودہ کیس سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں ہے..."

"آپ کو فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوئے پچیس سال کے لگ بھگ نہیں ہو گئے؟"

"ہاں تقریباً۔"

اس موقع پر سام نے ایک بار پھر کرافورڈ کو مزید سوالات کے جواب دینے سے روکنا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

"اور آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں مسٹر کرافورڈ۔" ایک رپورٹر نے پوچھا۔ "کہ کیا آپ کے خیال میں فلمی دنیا میں وکیل کا کردار ادا کرنے کا تجربہ اس موقع پر آپ کے بیٹے کیلئے مفید ثابت نہیں ہوگا...؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیا آپ نے کبھی کسی فلم میں وکیل کا پارٹ ادا کرتے ہوئے کوئی مقدمہ ہارا بھی ہے...؟"

"یہ ایک لایعنی سوال ہے......"

"کیا آپ دوبارہ فلمی دنیا میں واپس جانے کے بارے میں غور کر رہے ہیں...؟"

"بیکار باتیں مت کرو۔" کرافورڈ نے اس نوجوان رپورٹر کو گھورا جس نے یہ سوال کیا تھا۔ "میں گزشتہ بیس سال سے وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوں۔"

رپورٹر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

"کیا آپ کا یہ فیصلہ ایک طرح سے اپنے پرانے پیشے کی جانب واپس آنے کے مترادف نہیں ہے؟" دوسرے رپورٹر نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ اگر آپ عدالت میں ایک متاثر کن پارٹ ادا کرتے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی فلم پروڈیوسر......"

کرافورڈ کے اچانک پڑتے والے تھپڑ نے رپورٹر کو باقی فقرہ مکمل کرنے سے روک دیا۔ کمرے میں ایک لمحے کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ رپورٹر کوئی ردعمل ظاہر کرتے سام نے جلدی سے رپورٹروں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ رپورٹر کافی غصے میں تھے اور کچھ مزید سوالات بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر سام نے ان کی ایک نہ سنی اور آخرکار انھیں گھر سے جانے پر مجبور کر دیا۔

وہ کمرے میں واپس آیا تو کرافورڈ خاموشی کے عالم میں بیٹھا ہوا اپنے اس ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس سے رپورٹر کے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ سام نے اسے سمجھایا کہ آئندہ اسے زیادہ باتیں کرنے سے بچنا چاہئے اور وہ پبلک میں ہو یا عدالت کے سامنے اسے اپنے جذبات پر زیادہ قابو رکھنے کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

○

کرافورڈ اس سے پہلے بھی کمرۂ عدالت میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے جیوری کا سامنا بھی کیا تھا اور جج صاحبان کا بھی۔ اپنے موکلوں

کیلئے جرح بھی کی تھی اور بحث بھی۔ لیکن اس سے قبل حالات نے کبھی اتنی نازک صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اور نہ کسی مقدمے سے اس کا اتنا قریبی تعلق رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس وقت جج اور جیوری نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی اور مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو اس کا جی چاہا کہ ایڈون سے کہہ دے کہ اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو یہ پارٹ ادا کرنے کا اہل نہیں پاتا اور یہ کہ اس مقدمے میں اس کی جگہ حاضرینِ عدالت کے درمیان ہے وکیلِ صفائی کے برابر نہیں۔ لیکن اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ایڈون اپنی جگہ سے اٹھا اور جج صاحب کو اس بریف کی ایک کاپی پیش کی جو اس نے مقدمے کے سلسلے میں تیار کی تھی۔ وکیلِ سرکار بینیلے جو شکل و صورت کے اعتبار سے خاصا شریف اور رحم دل نظر آتا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا ابتدائی بیان شروع کیا۔ وہ دھیمے لہجے اور غیر جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں واردات کی رات کے جملہ واقعات بیان کیے جنھیں جیوری کے ارکان نے دلچسپی کے ساتھ مگر کسی خاص تاثر کے بغیر سنا۔ کرافورڈ نے اس کی تقریر سنی تو اس کی توقعات کچھ اور بلند ہو گئیں۔ اس کا خیال تھا کہ سرکاری وکیل کی تقریر اتنی زوردار نہیں جتنی وہ توقع کر رہا تھا اور یہ کہ بہ حیثیت مجموعی اس کی کارکردگی کچھ اچھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار ایڈون سے بھی کیا مگر ایڈون نے اس کے خیال سے اتفاق نہیں کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس پر کرافورڈ نے کچھ مزید توجہ سے بینیلے کی باتوں کو سنا اور اندازہ لگایا کہ بینیلے دانستہ حقائق کو اس سپاٹ انداز میں پیش کر رہا ہے اور ڈرامائی تفصیلات کو گواہوں کے بیانات ہونے تک ملتوی کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھ گیا۔

کرافورڈ اور ایڈون نے باہم فیصلہ کر کے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی تقریر کو اس وقت تک کے لیے ملتوی رکھیں گے جب تک استغاثہ اپنا کیس مکمل طور پر پیش نہ کر دے۔ اب گواہوں کو پیش کرنے کی باری تھی اور اس موقع پر بینیلے نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ اس نے مقدمے کے سب سے اہم گواہ ۔۔۔ یعنی خود ملزم ٹوڈ کو گواہی کیلئے طلب کیا۔

ٹوڈ ایک کھوئی ہوئی حالت میں محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو گواہوں کے کٹہرے میں بیٹھا پا کر اسے کچھ حیرت ہوئی۔ اسے بھی یہ توقع نہیں تھی کہ سب سے پہلے وکیلِ سرکار اسی کو طلب کرے گا۔ پھر جس وقت بینیلے نے اس سے اس رات کے واقعات دہرانے کیلئے کہا تو ٹوڈ نے انھیں کسی خاص ترتیب کے بغیر بیان کرنا شروع کر دیا چنانچہ بینیلے کو بار بار مداخلت کر کے اسے واقعات کی ترتیب درست کرنے کیلئے کہنا پڑا۔ ٹوڈ نے بیان کیا کہ وہ اور اس کے دوست کافی نشے میں تھے اور اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ کوئی انوکھی یا غیر معمولی بات نہیں تھی بلکہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس سے پہلے بھی ضرورت سے زیادہ شراب پیتا رہا ہے۔ اس نے ان دونوں دوستوں کے نام بتائے جو اس موقع پر اس کے ساتھ تھے اور پھر اپنے جھگڑے کی وجہ بیان کی۔

”ہم کچھ لڑکیوں سے ملنے جا رہے تھے۔“ اس نے بیان کیا۔ ”جو کہ قصبے کے دوسرے حصے میں رہتی ہیں۔ انھوں نے ایک پارٹی دی تھی۔ جولیس کے پاس وسکی کی ایک بوتل تھی۔ اور ہم سب اس بوتل سے پی رہے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جولیس شراب پیے کیونکہ وہ کار چلا رہا تھا۔ اور کار بھی میری نہیں میرے ڈیڈی کی تھی۔ میرے منع کرنے پر اس نے ناک بھنویں چڑھائیں اور اس نے غصے میں کچھ دوسری باتوں کا ذکر چھیڑ دیا مثلاً اس لڑکی کے بارے میں جسے ہم سب جانتے تھے۔ بحث اتنی بڑھ گئی کہ اس نے کار روک دی اور باہم زور آزمائی کے ذریعے ہار جیت کا فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پر ہمارے تیسرے ساتھی نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی لیکن ہم دونوں بہت غصے میں تھے۔ پھر اسی وقت کسی نے کہا کہ ہم وہیں سڑک پر لڑ کر اپنا فیصلہ کر لیں۔“

”وہ کون تھا۔۔؟“ بینیلے نے سوال کیا۔

”مجھے یاد نہیں۔“ ٹوڈ نے جواب دیا۔ ”لیکن ہم کار سے اتر گئے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ جولیس چاقو سے لڑنا چاہے گا۔ اس نے جب سڑک کا رستہ اترتے ہی چاقو نکال لیا تو مجھے ایک لمحے کیلئے تعجب سا ہوا۔ مگر پھر میں نے بھی اپنا چاقو نکال لیا۔“

”کیا تم ہمیشہ اپنے پاس چاقو رکھنے کے عادی ہو۔۔؟“

”ہمیشہ تو نہیں مگر زیادہ تر۔“

”پھر کیا ہوا۔۔؟“

”ہماری لڑائی شروع ہو گئی۔ پہلے جولیس کا چاقو میری کلائی پر لگا لیکن اس کے بعد میں نے اسے کوئی وار کرنے کا موقع نہیں دیا۔ خود اس پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ مر چکا ہے اس کے گرتے ہی میں کار میں بیٹھا اور گھر واپس آ گیا۔“

”تم نے اپنا چاقو اس کے جسم میں ہی چھوڑ دیا تھا۔“

”ہاں۔“

ایڈون کے مشورے پر کرافورڈ نے اس موقع پر کوئی جرح نہیں کی۔ کیونکہ ان کا ارادہ تھا کہ بعد میں ٹوڈ کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے طلب کیا جائے۔ کرافورڈ کو اپنی پہلی جرح کرنے کا موقع اس وقت ملا جب استغاثہ نے روڈی ٹرمیک کو گواہی کے لئے بلایا۔ بینیلے پہلے اس کے بیان سے یہ امر واقعہ سامنے لایا کہ اس رات روڈی وہ تیسرا لڑکا تھا جو ٹوڈ اور جولیس کے ساتھ تھا۔ اور اس کے بعد اس کی زبانی اس رات کے واقعات سنے۔ روڈی کا بیان ٹوڈ کے بیان سے ہم آہنگ تھا۔ لیکن بینیلے نے اپنے سوالات کے ذریعے ایک اور اہم نکتہ اٹھایا۔

”مسٹر روڈی کیا اس رات سے پہلے بھی ٹوڈ اور جولیس کے مابین کوئی جھگڑا ہوا تھا۔۔؟“

”ہاں۔“

”کس قسم کا جھگڑا۔ اور کیا وہ اس موقع پر بھی چاقوؤں سے لڑے تھے۔۔؟“

”نہیں۔ انھوں نے آپس میں گھونسہ بازی کی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں کے درمیان مستقل دشمنی رہتی تھی۔۔؟“

”ہاں۔ اکثر و بیشتر۔“

”اس دشمنی کی وجہ کیا تھی۔۔؟“

”کئی باتیں تھیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سلسلے میں جھگڑا ہوتا تھا اور کبھی لڑائی ٹوڈ کے باپ کی وجہ سے ہوتی تھی۔“

کمرۂ عدالت میں سرگوشیاں ابھریں۔ کرافورڈ نے مصنوعی کھانسی میں اپنی خفت چھپانے کی کوشش کی۔

”جولیس عموماً ٹوڈ کو چھیڑتا رہتا تھا۔“ روڈی کا بیان جاری تھا۔ ”وہ اس سے کہتا تھا کہ جس طرح اس کا باپ فلم اسٹار تھا۔ وہ خود بھی ہالی وڈ جا کر قسمت آزمائی کیوں نہیں کرتا۔ اور یہ بات سن کر ٹوڈ کو ہمیشہ غصہ آ جاتا تھا۔ وہ مذاق میں کہی ہوئی باتوں کا بھی برا مان جاتا تھا۔“

”جولیس اور ٹوڈ کے درمیان ان لڑائیوں میں کبھی کسی کے چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی۔۔؟“

”ایک مرتبہ ٹوڈ نے جولیس کی کلائی بیکار کر دی تھی۔“

”پھر کیا اس بات کی پولیس میں رپورٹ کی گئی۔۔؟“

”نہیں۔“ روڈی نے جواب دیا۔

”بس مجھے کچھ اور نہیں پوچھنا ہے۔“ بینیلے نے کہا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اب کرافورڈ کی باری تھی۔ وہ اٹھا۔ اگرچہ بظاہر وہ قطعی پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ اندر ہی اندر اس بری طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی نو آموز اداکار پہلی مرتبہ کیمرے کے سامنے جاتے ہوئے کانپتا ہے۔ وہ گواہوں کے کٹہرے کے پاس جا کر رک گیا۔ اسے احساس تھا کہ تمام نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں۔

”مسٹر روڈی۔“ اس نے پہلا سوال کیا۔ ”جولیس، ٹوڈ کرافورڈ کو کب سے جانتا تھا۔۔؟“

”تقریباً آٹھ دس ماہ سے۔“

”اور ان کی ملاقاتیں کتنے وقفے سے ہوتی تھیں۔۔؟“

”عموماً ہفتے میں دو تین مرتبہ۔“

”دوسرے الفاظ میں تم کہہ سکتے ہو کہ وہ آپس میں دشمن نہیں دوست تھے۔“

اس موقع پر بینیلے اٹھا اور اعتراض کیا کہ وکیلِ صفائی گواہ سے اس کا ذاتی خیال معلوم کر رہے ہیں جو قابلِ اعتراض ہے۔ جج صاحب نے اس اعتراض سے اتفاق کیا۔

”ان کی باہمی ہاتھا پائی خاص طور سے وہ جس میں جولیس کی کلائی بیکار ہو گئی تھی۔ کیا یہ بھی اسی طرح طے شدہ انداز میں لڑی گئی تھی۔ جس طرح اس رات انھوں نے آپس میں لڑ کر فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا؟“ کرافورڈ نے اگلا سوال پوچھا۔

”نہیں۔ وہ بس یونہی ہو گئی تھی۔“

”بالکل اچانک کسی پیشگی ارادے کے بغیر۔۔؟“

”ہاں یہ کہا جا سکتا ہے۔“ روڈی نے جواب دیا۔ ”جولیس نے اچانک ٹوڈ پر جست لگائی۔۔۔۔۔۔“

”تم نے کہا کہ جولیس نے ٹوڈ پر جست لگائی۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑائی میں پہل اس کی جانب سے ہوئی تھی۔“

”ٹوڈ نے جولیس سے کہا تھا۔۔۔۔۔۔“

”سوال یہ نہیں ہے کہ ٹوڈ نے جولیس سے کیا کہا تھا۔“ کرافورڈ نے بات کاٹی۔ ”سوال یہ ہے کہ جولیس نے لڑائی کی ابتدا کی تھی۔۔؟“

”جی ہاں۔“

”کیا یہی معاملہ اس ۔۔۔ ۱۴ ستمبر کی رات کو پیش آیا تھا؟“ کرافورڈ نے پوچھا۔ ”تم لڑائی کے وقت موجود تھے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے انھیں لڑتے دیکھا تھا۔ کیا اس رات بھی جولیس نے لڑائی میں پہل نہیں کی تھی؟ کیا اس نے پہلا وار نہیں کیا تھا۔۔؟“

”یہ کہنا تو بہت مشکل ہے۔“

”کیا جولیس نے ٹوڈ کی کلائی زخمی نہیں کی تھی؟ اور کیا اس لڑائی میں یہ پہلا زخم نہیں تھا۔ کیا تم لڑائی دیکھ رہے تھے۔ یا تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔؟“

”میں یقیناً لڑائی دیکھ رہا تھا۔“ روڈی نے جواب دیا۔ ”اور یہ بات بھی درست ہے کہ پہلے جولیس نے ٹوڈ کو زخمی کیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب۔۔۔۔۔۔“

”بس مجھے کوئی اور سوال نہیں کرنا ہے۔“

کرافورڈ تیزی سے گھوما اور واپس جا کر وکیلِ صفائی کی میز پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لیکن ایڈون کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ اپنی جرح میں خاصا کامیاب رہا تھا۔

پریشانی کی ابتدا دوسرے دن ہوئی جب ہینیلے نے اس دن کی پہلی گواہ ایک خوبصورت لڑکی باربرا کو گواہوں کے کٹہرے میں طلب کیا۔ لڑکی نے ضرورت سے زیادہ میک اپ کیا ہوا تھا مگر پھر اس کی عمر سترہ سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جو جولیس اور ٹوڈ کے درمیان جھگڑے کا باعث تھی۔ ایڈون نے کرافورڈ کو گواہ عورتوں کے بارے میں پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتیں فطری طور پر انتہا پسند ہوتی ہیں۔ وہ جس کی حمایت کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو کوئی دلیل کوئی منطق انھیں اس حمایت سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اسی طرح وہ جس کی مخالفت پر کمر باندھ لیں تو پھر کسی استدلال سے ان کی دشمنی کو دوستی یا کم سے کم غیر جانبداری میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ دعویٰ بڑی حد تک باربرا کے معاملے میں صادق آیا۔

"تم نے جولیس اور ٹوڈ کو اکثر ایک دوسرے سے تکرار کرتے دیکھا تھا۔" ہینیلے نے پوچھا۔ "کیا تم نے انھیں لڑتے اور ہاتھا پائی بھی کرتے دیکھا...؟"

"یقیناً دیکھا۔" باربرا نے بڑے انداز سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی لڑائی کی وجہ میں بھی ہوا کرتی تھی۔" وہ کچھ فخریہ انداز میں مسکرائی۔

"اس کے باوجود وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے مل بیٹھتے تھے۔ کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی تھی...؟"

"کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ لوگ بظاہر اس لئے ایک دوسرے کے دوست نظر آتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔" باربرا نے بڑے فلسفیانہ لہجے میں جواب دیا اور اپنے جواب پر بہت خوش ہوئی۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے...؟"

"خیال نہیں مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔"

"تمہیں یہ یقین کیسے ہوا...؟"

"نہ صرف ان کی آپس کی لڑائیوں سے بلکہ ٹوڈ کی دھمکیوں کی وجہ سے بھی جو وہ اکثر میرے سامنے دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ کسی دن جولیس کو قتل کر دے گا۔"

اس نے چور نظروں سے کمرۂ عدالت میں موجود ٹوڈ کی طرف دیکھا اور پھر اپنے جواب پر حاضرین عدالت کا ردعمل دیکھ کر خوش ہوئی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس نے واقعی جولیس کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی؟" ہینیلے نے سوال کیا۔

"ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ۔" باربرا نے جواب دیا۔ "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر جولیس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تو میں ایک دن اس کا گلا کاٹ دوں گا۔"

ایڈون نے جلدی جلدی کرافورڈ کو جرح کے بارے میں ہدایات دیں۔ اس نے کہا کہ وہ ایسے سوالات کرے جس سے لڑکی کی آوارگی اور بدکرداری نمایاں ہو جائے۔ وہ یہ ظاہر کرے کہ باربرا کو ٹوڈ سے نفرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے خلاف وہ باتیں کر رہی ہے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن جب کرافورڈ نے اپنی جرح میں باربرا سے یہ اعتراف کرانے کی کوشش کی کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی تو باربرا بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔

"بیشک میں ٹوڈ کو پسند کرتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "بہت زیادہ پسند کرتی تھی۔ میں اسے کسی پریشانی یا مصیبت میں مبتلا دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا اس کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتی کیونکہ میں نے اس معزز عدالت کے سامنے ہر بات سچ سچ بیان کرنے کا حلف اٹھایا ہے۔"

اس نے گہری نظروں سے کرافورڈ کی طرف دیکھا، جیسے اسے خود بھی احساس ہو کہ اس نے اپنے جواب سے جیوری کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔

اس کے بعد سرکاری وکیل نے استغاثہ کے تین اور گواہ پیش کیے اور ان سب نے یہ بیان کیا کہ ٹوڈ بہت غصہ ور، چڑچڑے مزاج اور غیر ذمہ دارانہ طبیعت کا مالک ہے۔ نیز یہ کہ اس کے اور مقتول جولیس کے درمیان انتہائی کشیدگی بلکہ دشمنی پائی جاتی تھی۔ پھر پولیس نے مقام واردات کے بارے میں اپنی شہادت پیش کی۔ وہ چاقو عدالت کے معائنے میں لایا گیا جو ٹوڈ مقتول کے جسم میں چھوڑ آیا تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ وقوع جرم کے بعد ملزم اپنے گھر بھاگ گیا۔ اور جب اسے گھر جا کر گرفتار کیا گیا تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

اس کے بعد استغاثہ نے اپنا کیس پیش کرنے میں مزید دو دن لگائے جس کے دوران ٹوڈ کے خلاف ثبوت و شواہد کی دیوار مزید بلند ہو گئی۔ صفائی کی جانب سے گواہوں پر جو جرح کی گئی وہ اور زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔ جیسا کہ ایڈون نے پہلے سے کہہ دیا تھا کہ گواہوں پر جرح کے دوران بعض باتوں کا بار بار اعادہ کرنا پڑے گا اور یہ تکرار جیوری اور جج پر کوئی اچھا اثر مرتب نہیں کرے گی۔ لیکن یہ جاننے کے باوجود ان کے لئے گواہوں پر جرح کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ صفائی کے پاس اپنا کوئی گواہ نہیں تھا۔ چنانچہ انھیں ان ہی حقائق پر اپنے کیس کی بنیاد رکھنا تھی جو اب تک عدالت میں پیش کیے جا چکے تھے۔ ان کی واحد توقع ٹوڈ کی اپنی ذات سے وابستہ تھی کہ جب اسے گواہی کیلئے بلایا جائے گا تو ممکن ہے اس کا بیان جیوری کو اس بات کا یقین دلا سکے کہ جو کچھ ہوا وہ ایک حالتِ اشتعال کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس کا اپنا کوئی ارادہ جولیس کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔

ٹوڈ نے اپنے باپ کے کہنے پر گواہوں کے کٹہرے میں قدم رکھا اور کرافورڈ نے اس سے سوالات کرنا شروع کیے۔

"جب تم اس سڑک پر اپنی کار سے اُترے تو کیا تمہارا ارادہ جولیس کو قتل کرنے کا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔"

"یا یہ کہ تم اسے زخمی کرنا چاہتے تھے۔ یا محض اس کے حملے سے اپنا دفاع کر رہے تھے...؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس وقت میرے خیالات کیا تھے۔" ٹوڈ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس وقت نشے میں تھا۔ صحیح معنوں میں مجھے کچھ احساس نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں یا اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"کیا تم جولیس سے نفرت کرتے تھے؟" کرافورڈ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

"لیکن تمہارے درمیان ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار تھے لیکن ہر لڑائی کے بعد ہمارے درمیان صلح ہو جاتی تھی۔" وہ قدرے رکا اور پھر بولا۔ "اس لڑکی سے ملنے سے پہلے ہمارے تعلقات خاصے بہتر تھے۔"

"لڑکی سے تمہاری مراد باربرا سے ہے...؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تم اس لڑکی سے محبت کرتے تھے...؟"

"مجھے صحیح اندازہ نہیں، ممکن ہے تھوڑی بہت محبت کرتا ہوں۔"

"کیا تم نے اس سے کبھی یہ بات کہی تھی کہ تم جولیس کو قتل کرنا چاہتے ہو...؟"

"مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس سے کبھی کوئی ایسی بات کہی ہو۔"

"تب تمہارے خیال میں اس نے عدالت میں یہ بیان کیوں دیا کہ تم نے اس کے سامنے جولیس کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی...؟"

"وہ جولیس کو پسند کرتی تھی اور جو کچھ ہوا ہے اس کی بنا پر اسے مجھ سے نفرت ہے۔ ممکن ہے اپنے اس بیان سے اس کا مقصد مجھ سے انتقام لینا ہو۔"

استغاثہ نے اس جواب پر اعتراض کیا اور جج صاحب نے اعتراض بحال رکھا۔ کرافورڈ پسینے میں نہایا جا رہا تھا۔ لیکن گزشتہ دنوں میں اسے سردی یا گرمی کسی چیز کا بھی احساس نہیں رہ گیا تھا سوائے ٹوڈ کے مقدمے کے۔ پسینہ اس کی پیشانی سے بہہ کر آنکھوں تک آ رہا تھا اور وہ بار بار اسے رومال سے خشک کر رہا تھا۔

"کیا کسی بھی موقع پر تمہارے دل میں اپنے دوست کو قتل کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا...؟"

"نہیں۔ اور یہ بات میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں۔" ٹوڈ نے فرش کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا اس رات جبکہ تم دونوں کا جھگڑا ہوا۔ تمہارے ذہن میں کوئی بھی خیال اسے جان سے مارنے کا پیدا ہوا تھا...؟"

ٹوڈ نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اس کی یہ خاموشی کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں کر رہی تھی۔ کرافورڈ نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور آگے جھک کر بولا۔

"مہربانی کر کے میرے سوال کا جواب دو۔"

"مجھے معلوم نہیں۔" ٹوڈ نے کہا۔ "مجھے اس بارے میں کچھ بھی یاد نہیں کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تو اس وقت یا اس سے فوراً پیشتر میرے کیا خیالات تھے۔"

"لیکن کیا تم اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

"میں کسی بارے میں کچھ نہیں ——— سوچ رہا تھا۔ میں نے وہ ہی کیا جو اس وقت حالات کے تحت مجھے کرنا پڑا۔"

کمرۂ عدالت میں گہری خاموشی چھا گئی۔ پوری فضا ہی بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آخری نشستوں پر کوئی کھانسا تو اس کی آواز بم کے دھماکے کی طرح گونج کر رہ گئی۔

"بس مجھے اور کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔" کرافورڈ نے کہا۔

وہ اپنی میز پر واپس آ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ایڈون اپنی جگہ سے اٹھا اور عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ صفائی کا کیس مکمل ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس نے جج صاحب سے درخواست کی کہ وہ بذاتِ خود جیوری کا پابند ہوئے بغیر غیر ارادی قتل کا فیصلہ صادر کرے۔ جج نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اور وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی دونوں سے کہا کہ وہ سہ پہر کے اجلاس میں جیوری کے سامنے اپنی آخری تقریر اختتامی دلائل دینے کے لئے تیار رہیں۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" کرافورڈ نے کمرۂ عدالت سے نکلتے ہوئے ایڈون کو یقین دلایا۔ "تم دیکھو گے کہ میں ان لوگوں کے جذبات احساسات کو کس طرح ٹوڈ کے حق میں ہموار کرنے کی کامیابی حاصل کرتا ہوں۔"

○

اور اس سہ پہر دو بجے جب عدالت کا اجلاس شروع ہوا تو کرافورڈ اپنی جگہ سے جیوری کو خطاب کرنے کیلئے اٹھا۔ اس سے قبل وہ محض کچھ چہرے تھے جن میں سے چند پر ہمدردانہ اور چند پر مخالفانہ تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا لیکن اب وہ کرافورڈ کے نزدیک ناظرین اور سامعین کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ وہ ان کے سامنے کھڑا ہوا۔ یوں جیسے اس بار گرلی نے جوائس کے شانوں

پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی قوتِ گویائی کو وقتی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ یہ خاموشی تقریباً دس سیکنڈ تک ہی۔ اس کے بعد اس نے گہری اور ہموار آواز میں بولنا شروع کیا۔

"جیوری کے معزز خواتین و حضرات۔ ایک نوجوان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اور وہ لوگ جو خود کو انسانی معاشرے میں انصاف کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں انتقام کے لئے چیخ رہے ہیں۔ آپ لوگ یہاں اپنے سامنے انھیں یہ مطالبہ کرتے دیکھ رہے ہیں کہ خون کا بدلہ خون اور جان کا بدلہ جان ہے اور یہ سب کچھ قانون کے اس اندھے مجسمے کے نام پر کیا جا رہا ہے جو اس عدالت کے باہر ایستادہ ہے۔ جب آپ لوگ اس کمرے سے باہر نکلیں گے تو یہ آپ کی ذمے داری ہوگی کہ ان کے مطالبے کا جواب اثبات یا نفی میں دیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ آپ لوگ کسی نتیجے پر پہنچیں میں ایک سوال کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی حقیقی اور مکمل انصاف کرنا ممکن ہے۔ ایسا انصاف جو مکمل طور پر غیر جانبدار ہو۔ ہر قسم کے تعصب سے پاک اور ہر طرح کے جذبات سے بالاتر ہو کر کیا جائے۔ اگر ایسا کوئی انصاف ہے یا ممکن ہو سکتا ہے تب میں کہوں گا کہ پروردگار تیرا شکر ہے۔ تیرا شکر ہے کہ ہم خطاکار انسانوں کو ایک ایسے عظیم تحفے کے قابل سمجھا گیا۔ خود ہمارے گناہوں کو کرمِ بے پایاں سے اس طرح معاف کر دیا گیا کہ ہم دوسرے گناہ گار انسانوں کے ساتھ مکمل انصاف کرنے کے قابل ہو سکے۔ اگر آپ نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی ایسا گناہ بھی نہیں جس کی سزا دینا قانون کے بس سے باہر ہو، تب جو کچھ میں کہنے والا ہوں، اس کے مخاطب آپ نہیں ہیں۔ اگر آپ کا دامن ہر دھبے سے پاک ہے۔ اگر آپ سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ آپ نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کبھی کسی انسان کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا ہے، تب آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ یہ فیصلہ کریں کہ اس مجرم نوجوان کو کیا اور کیسی سزا دی جائے۔"

اس مرحلے پر کرافورڈ کی آواز جوشِ خطابت میں کچھ اور بلند ہو گئی۔

"اگر آپ لوگ کرافورڈ کی زندگی کا اعمال نامہ بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ کہنے کیلئے آمادہ ہیں کہ صرف ایک لمحاتی حرکت نے۔ اس کے ہاتھ کے ایک اضطراری فعل نے۔ اس کی حیات کے ایک مشتعل لمحے نے۔ اس سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا ہے۔ اس کا یہ حق بھی سلب کر لیا ہے کہ وہ اپنی خطا پر نادم ہو۔ اپنے کردار کی اصلاح کرنے اور اپنی زندگی کو تبدیل کرنے کی کوشش کر سکے تو یہ آپ حضرات کا اپنا اقدام ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ آپ کوئی قدم اٹھائیں یہ یقین حاصل کر لیں کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اپنی بیوی، اپنے شوہر، اپنے کسی بچے کی دل آزاری کی ہے؟ — بعد میں آپ کو اپنے اس طرزِ عمل پر افسوس بھی ہوا ہوگا۔ لیکن آپ کیلئے اس کا تدارک کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ آپ نے معذرت کے چند الفاظ ادا کئے۔ ایک محبت بھرا پیار کیا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ کیا آپ نے کبھی کوئی پتھر مارا ہے۔ کوئی برتن توڑا ہے۔ کوئی گالی دی ہے۔ کسی کو تھپڑ مارا ہے۔ بچے کو سزا دی ہے۔ جھوٹ بولا ہے۔ وعدہ توڑا ہے۔ پھر آپ کو اس کی کیا سزا ملی؟ اگر کوئی سزا ملی بھی تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ کے لئے توبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہو۔ یہ موقع آپ سے کبھی نہیں چھینا گیا کہ آپ اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر کہہ سکیں کہ مجھے افسوس ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ اور آئندہ ایک بہتر انسان بننے کی پوری کوشش کروں گا۔

لیکن اس نوجوان نے محض ایک پلیٹ یا ایک گلدان نہیں توڑا ہے۔ اس نے ایک قیمتی جان لی ہے۔ ایک تنہا لمحے میں۔ وقتی اور بے معنی جوش سے اندھا ہو کر۔ بالکل غیر شعوری طور پر اس نے ایک دوسرے نوجوان کو قتل کر دیا۔ کیا اس نے پہلے سے اس کی کوئی تیاری کی تھی؟ یا اس کا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ تھا؟ ہرگز نہیں۔! اس کا یہ فعل اسی طرح غیر ارادی تھا جس طرح آپ کا غصے میں بھر کر کسی کو گالی دے دینا یا کسی کے تھپڑ مار دینا۔ اس نے ہرگز اس نوجوان کو قتل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ کوئی ارادہ نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے دوست گواہوں کے سامنے، خدا کے سامنے اور قانون کی جوابدہی سے لاپروا ہو کر قتل کر ڈالے گا۔"

کرافورڈ بُری طرح چیخ رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ خاموش ہو کر خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی۔ اور پھر نسبتاً نرم لہجے میں جیوری کے سامنے لگے ہوئے جنگلے کو پکڑ کر آگے جھکتے ہوئے بولا۔

"آپ چاہیں تو لوڈ کرافورڈ کی کتابِ زندگی — بند کر سکتے ہیں قانون آپ کو یہ حق دیتا ہے۔ اس کی عمر تیئیس سال ہو چکی ہے اور اس قابل ہے کہ آپ سے کہیں زیادہ بالاتر ہستی کے سامنے مواخذے کے لئے پیش ہو سکے لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ خدائے بزرگ و برتر کی آسمانی عدالت کے روبرو حاضر ہو کر لوڈ مجبور ہوگا کہ اس کے علاوہ کوئی اور عذر پیش نہ کر سکے کہ دنیا میں میرا آخری فعل ایک شخص کی جان لینا تھا جو کہ میرا دوست تھا اور مجھے اپنی اس غلطی کا تدارک کرنے — اپنے کردار کی اصلاح کرنے اور اپنی زندگی کو کارآمد بنانے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا۔"

کرافورڈ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ جنگلہ چھوڑ دیا۔ آہستہ سے گھوما اور اپنی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ کمرۂ عدالت میں گہری خاموشی مسلط تھی اور وہ اس خاموشی کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سکوت اس کے حق میں ہے یا اس کے خلاف۔

اور تب یکدم کسی نے تالی بجائی، کچھ اور لوگوں نے اس کا

ساتھ دیا۔ اور پھر فوراً ہی عدالت کی پوری فضا پُرزور تالیوں کے شور سے گونج اٹھی۔ کرافورڈ نے اس لمحے اپنے دلی تاثرات چھپانے کی بہت کوشش کی۔ چاہا کہ اس کے چہرے سے اپنی فتح مندی کا کوئی اظہار نہ ہو سکے، اور شاید وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔

جج صاحب ایک لمحے کیلئے ہچکچائے۔ پھر انھوں نے اپنا ہتھوڑا اٹھا کر کمرے میں بلند ہوتے ہوئے داد و تحسین کے شور کو ختم کیا۔ تالیاں بجنا بند ہو گئیں، مگر کرافورڈ کی تقریر جو تاثر پیدا کر چکی تھی اس کا جادو توڑنا لکڑی کے ہتھوڑے کے بس کی بات نہ تھی۔

بینیلے ایک دم اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اب تک جس مطمئن انداز میں اپنا مقدمہ لڑا تھا وہ یکسر بدل چکا تھا۔ اس پُرزور تقریر کا اثر اس پر بھی ہوا تھا مگر بالکل برعکس انداز میں۔ وہ بھی غصے اور جوش کے عالم میں تھا لیکن اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے چہرے سے ان جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔

"حضور والا" اس نے جج کو مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے مسٹر بینیلے؟" جج صاحب نے پوچھا۔

"حضور والا مسٹر کرافورڈ کی تقریر پر سامعین کے پُرجوش مظاہرے کے بعد میں یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ استغاثہ کو اپنی اختتامی تقریر آج کے بجائے کل کرنے کی اجازت دی جائے۔"

"بہت اچھا مسٹر بینیلے، آپ کی درخواست منظور کرتے ہوئے عدالت کا اجلاس کل صبح تک کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے۔" جج صاحب نے اپنا فیصلہ دیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

کرافورڈ نے جج صاحب کے الفاظ زیادہ توجہ سے نہیں سُنے۔ وہ ایڈورن کی طرف دیکھ رہا تھا اور ایڈورن جیوری کے چہروں سے ان کے تاثرات جاننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ پھر جب وہ کمرۂ عدالت سے باہر آرہے تھے تو ایڈورن نے کرافورڈ کا بازو پکڑتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا۔ جسے کرافورڈ ٹھیک سے نہیں سن سکا۔ چنانچہ باہر راہداری میں آکر ایڈورن کو اپنی بات دہرانا پڑی۔

"میرے خیال میں یہ ممکن نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "اور اگر کوئی مجھ سے کہتا تو شاید میں اس کی بات پر یقین نہ کرتا لیکن یہ حقیقت ہے مسٹر کرافورڈ کہ تم نے آج کمال کر دکھایا ہے۔"

ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بینیلے ایک لمحے کیلئے رکا، پھر وہ آہستہ آہستہ کرافورڈ کے پاس آیا۔ "بہت عمدہ تقریر تھی۔" اس نے تعریف کی "تم ایک باصلاحیت فنکار ہو مسٹر کرافورڈ میرا ہمیشہ سے یہی خیال تھا۔"

"شکریہ" کرافورڈ نے جواب دیا۔

"میں ہمیشہ تمہارا مداح رہا ہوں۔" بینیلے نے اپنی بات جاری

رکھی مگر اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا: "تم یہ بات یاد رکھنا۔ یہاں تک کہ کل جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بعد بھی۔"

اور اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ایڈون نے اسے فکر مند نظروں سے جاتے دیکھا۔

"کیا بات ہے۔۔۔!" کرافورڈ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو۔۔؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" ایڈون نے جواب دیا "لیکن میں مینلے کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور میرے خیال میں اس کے یہ الفاظ اپنے اندر کسی طرح کی دھمکی پوشیدہ رکھتے تھے۔"

اور دوسرے دن ایڈون کی پریشانی ایک حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔ وکیل استغاثہ کی میز ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہی تھی جس وقت کرافورڈ نے ایڈون کے برابر اپنی جگہ سنبھالی تو اس نے بھی ان چیزوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور پھر ایک دھچکے کی صورت میں اسے احساس ہوا کہ ان چیزوں سے کیا کام لیا جانے والا ہے۔ عدالت کا اجلاس شروع ہوتے ہی مینلے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"حضور والا! جیوری کے سامنے اپنی اختتامی بحث سے پہلے میں ایک غیر معمولی نوعیت کی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اور یہ درخواست میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس خیال سے کرنا چاہتا ہوں کہ دوسرے مقدمات کی طرح یہ کیس بھی اپنے حقائق کی بنیاد پر جانچا اور پرکھا جائے نہ کہ اس میں حصہ لینے والوں کے جذبات و احساسات کی بنیاد پر۔"

"مجھے یقین ہے کہ ہم سب اس بات کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔" جج صاحب نے قدرے ناگواری سے خشک لہجے میں کہا "آپ اپنی درخواست پیش کریں۔"

"حضور والا۔ میں آپ کی اجازت سے ایک فلم کا تھوڑا سا حصہ عدالت کو دکھانا چاہتا ہوں۔" مینلے نے کہا۔

ایڈون نے کچھ چونک کر کرافورڈ کی طرف دیکھا اور کرافورڈ اس پورٹ ایبل اسکرین اور پروجیکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا جو وکیل سرکار کی میز پر لگائے گئے تھے۔

"کیا یہ کسی طرح کی کوئی نئی شہادت یا ثبوت ہے؟" جج صاحب نے پوچھا۔

"نہیں حضور والا۔ یہ ایک فلم 'مجرم کون ہے' کا آخری ریل ہے۔" مینلے نے جواب دیا "اس فلم کو ۱۹۳۲ء میں الائڈ اسٹوڈیو نے تیار کیا تھا۔ اور میں خوش قسمتی سے پرانی فلموں کے ایک ڈسٹری بیوٹر سے اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ویسے یہ ایک بی کلاس فلم ہے جس کی نمائش بہت ہی مختصر عرصہ جاری رہ سکی بہرحال مجھے یقین ہے کہ اگرچہ اس فلم کا کوئی براہ راست تعلق تو کرافورڈ کے مقدمے سے نہیں ہے لیکن یہ اس کے وکیل صفائی کے طرز عمل پر روشنی ضرور ڈالتی ہے۔"

اس موقع پر مینلے نے اپنے لہجے کو کچھ آہستہ کرتے ہوئے جج صاحب کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"اور حضور والا۔ مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اس فلم میں جو کچھ دکھایا گیا ہے وہ بہت ممکن ہے کہ اس مقدمے کی خصوصیت اور اس کے قانونی معیار پر بھی اچھا اثر نہ ڈالے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا دکھایا جانا تمام متعلقہ افراد کے مفاد میں ہوگا۔ کیا میں اور قریب آ کر کچھ عرض کر سکتا ہوں؟"

جج صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مینلے نے جج صاحب کے بالکل پاس جا کر ان کے کان میں کوئی ایسی بات کہی جسے سن کر وہ ایکدم چونک گئے اور انھوں نے فلم دکھانے کی اجازت دیدی۔

ایڈون نے کرافورڈ کی طرف دیکھا جو اپنی کرسی میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہی تھیں اور چہرے پر گہری افسردگی و مایوسی کے تاثرات تھے۔ ایڈون اس کے کان میں پتہ نہیں کیا کیا سوالات کرتا رہا مگر کرافورڈ نے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

استغاثہ کے ایک کلرک نے عدالت کے بیلف کی مدد سے اسکرین کو اس طرح فٹ کیا کہ وہ جج اور جیوری کے سامنے رہے۔ فلم کا پروجیکٹر بھی اس کے بالمقابل لگا دیا گیا۔ حاضرین عدالت ایک ہیجانی کیفیت میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اسکرین کا سفید مستطیل پردہ ان کے لئے ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ پوری عدالت میں ایک کرافورڈ ہی ایسا شخص تھا جسے اس کارروائی سے کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ خلا میں آنکھیں جمائے پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

"ہم تیار ہیں۔" کلرک نے کہا۔ بیلف نے کمرۂ عدالت کی روشنیاں کچھ کم کر دیں۔

اور اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ایک اور کمرۂ عدالت کا منظر سامنے آیا۔ اداکاروں کی ایک جیوری اپنے مخصوص مقام پر بیٹھی تھی۔ ایک دوسرا اداکار سفید بالوں کی وگ سر پر لگائے جج بنا بیٹھا تھا۔ اور پھر جیوری کو مخاطب کرنے کیلئے اس کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے سامنے آیا ملیز کرافورڈ۔ چھریرے جسم کا نوجوان جس کی عمر اس وقت بمشکل بیس سال کی تھی۔ جو وکیل صفائی بنا ہوا تھا۔ مگر اس کا اپنا پیشہ اداکاری تھا۔

شروع میں چند لمحے آواز صاف سنائی نہیں دی مگر پھر فوراً ہی پروجیکٹر کا اسپیکر ٹھیک کام کرنے لگا۔ اور کمرۂ عدالت میں ایک گہری جذبات سے بھرپور آواز گونجنے لگی۔

"ایک نوجوان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور وہ لوگ جو خود کو انسانی معاشرے میں انصاف کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں انتقام کے لئے چیخ رہے ہیں۔ آپ لوگ یہاں اپنے سامنے انھیں یہ مطالبہ کرتے دیکھ رہے ہیں کہ خون کا بدلہ خون اور جان کا بدلہ جان ہے۔ اور یہ سب کچھ پتھر کے اس اندھے مجسمے کے نام پر کیا جا رہا ہے جو اس عدالت کے باہر ایستادہ ہے۔"

ایڈون نے کرافورڈ کا بازو پکڑ لیا۔ اسکرین پر نوجوان اور خوبصورت ملزم نے گھبرا کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔

"...... سوال یہ ہے کہ کیا واقعی حقیقی اور مکمل انصاف کرنا ممکن ہے؟" اسکرین پر وکیل بنا ہوا اداکار جیوری سے مخاطب تھا "ایسا انصاف جو مکمل طور پر غیر جانبدار، ہر قسم کے تعصب سے پاک اور ہر طرح کے جذبات سے بالاتر ہو کر کیا جائے......"

کمرۂ عدالت میں سرگوشیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ جیسے جیسے یہ احساس واضح اور زیادہ ہوتا جا رہا تھا کہ جو کچھ وہ پہلے سن چکے تھے وہ محض ایک فلمی سین کی صدائے بازگشت تھی ویسے ویسے وکیل استغاثہ کے اس خطرناک مظاہرے کے اندیشہ ناک پہلو اجاگر ہوتے جا رہے تھے۔

"...... اگر آپ نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی ایسا گناہ بھی نہیں جس کی سزا دینا قانون کے بس سے باہر ہو۔ تب میں جو کچھ کہنے والا ہوں اس کے مخاطب آپ نہیں ہیں۔ اگر آپ کا دامن ہر دھبے سے پاک ہے۔ اگر آپ سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ آپ نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ کبھی کسی انسان کو کسی طرح کا نقصان......"

"خدا کے لئے اس تماشے کو بند کراؤ۔" کرافورڈ نے ایڈون سے کہا۔ "جس طرح بھی ہو سکے اس فلم کو چلنے سے روک دو۔"

"حضور والا!" ایڈون نے کھڑے ہو کر چیختے ہوئے کہا۔ "حضور والا کیا آپ براہ مہربانی......"

مگر اس کی آواز فلم کے اداکار وکیل کی بلند جذباتی آواز کے سامنے ماند تھی۔ جو کہہ رہا تھا۔

"صرف ایک لمحاتی حرکت نے۔ اسکے ہاتھ کے ایک اضطراری فعل نے۔ اس کی حیات کے ایک مشتعل لمحے نے اس سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا ہے۔ اس کا یہ حق بھی سلب کر لیا ہے کہ وہ اپنی خطا پر نادم ہو۔ اپنے کردار کی اصلاح کرے اور اپنی زندگی کو تبدیل کرنے......"

"بند کرو!" کرافورڈ انتہائی بلند آواز میں چیخا۔

مینلے نے کلرک کے کان میں کچھ کہا۔ اور دوسرے لمحے اسکرین سے عدالت کا منظر غائب ہو گیا۔ مینلے اپنی جگہ سے اٹھ کر جج اور جیوری کے سامنے آیا۔

"حضور والا۔ میں اس موقع پر اس فلم کو مزید جاری رکھنے کے لئے اصرار نہیں کروں گا اور بخوشی وکیل صفائی کی درخواست منظور کرتے ہوئے فلم کی نمائش بند کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ کرافورڈ کی طرف گھوما۔ اگرچہ اس کے انداز میں کوئی فتح مندی کا تاثر نہیں تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ شرمندہ یا پشیمان بھی نظر

نہیں آرہا تھا۔

"میں ہمیشہ مسٹر کرافورڈ کی فنکارانہ صلاحیتوں کا معترف و مداح رہا ہوں۔ چنانچہ جب انہوں نے جیوری کے سامنے تقریر کی تو مجھے فوراً محسوس ہوا کہ میرے کان اس تقریر سے آشنا معلوم ہوتے ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ مجھے یاد آگیا کہ اس سے قبل میں نے اسے کہاں سنا تھا۔ یہ منظر میں نے مسٹر کرافورڈ کو شرمندہ کرنے کیلئے نہیں دکھایا ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا اس کی نمائش سے میرا مقصد یہ ہے کہ اس کیس میں ایک بہتر اداکار کی جذباتی اداکاری اور ڈرامائی مکالموں کو نہیں بلکہ واقعات و حقائق کو فیصلہ کرنے کا اختیار ملنا چاہیئے۔"

اور یہ کہہ کر وہ واپس اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔ کرافورڈ ابھی تک کھڑا ہوا بڑی بے بسی سے ان چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کی نظروں کے سامنے اپنے تاثرات کے ذریعے کچھ ایسے سوالات پوچھ رہے تھے جن کے جواب دینا آسان نہیں تھا۔

"حضورِ والا!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "حضورِ والا۔ یہ سچ ہے۔ وہ تقریر میری نہیں تھی۔ بلکہ اب سے کئی سال پہلے مجھے لکھ کر دی گئی تھی۔ میں نے اسے یہاں اس لئے استعمال کیا کہ جس طرح یہ برسوں پہلے میرے لئے حق و صداقت پر مبنی تھی اسی طرح آج بھی ہے۔ میں نے اسے اس لئے دُہرایا کہ مجھے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بھی ان سے زیادہ موزوں الفاظ نہیں مل سکتے تھے......"

جواب میں گہری خاموشی چھائی رہی۔ کرافورڈ نے اپنے بیٹے ٹوڈ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ایک مرتبہ پھر ہمیشہ کی طرح ناگواری کے تاثرات لئے ہوئے تھا۔ اور اس کی وجہ اسے معلوم تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان آخری لمحات میں وہ اپنے بیٹے کے وکیلِ صفائی کا کردار ہار چکا ہے۔ اپنے بیٹے کی نظروں میں وہ ایک مرتبہ پھر محض ایک اداکار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے وہ اداکار جس سے ٹوڈ نفرت کرتا تھا۔

"میں نے آپ حضرات کو دھوکا دیا ہے۔" کرافورڈ جیوری کے ارکان کی جانب دیکھ کر بولا۔ "میں نے آپ ہی کو نہیں بلکہ خود کو بھی بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ میں اس الزام سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا کے لئے ایسا نہ کریں کہ میری غلطی کا خمیازہ میرے بیٹے کو اٹھانا پڑے۔ آپ اسے سزا کا مستحق نہ گردانیں جبکہ حقیقت میں تمام تر قصور میرا ہے اور سزا بھی مجھے ہی ملنا چاہیئے......"

وہ اس سے زیادہ کہہ بھی کیا سکتا تھا جیوری کے ارکان کے سپاٹ چہرے مظہر تھے کہ اب وہ خواہ کچھ بھی کہے اس کا کوئی مفید ردِعمل ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی نشست کی طرف چلا اور تب وہ ایک دم چلتے چلتے رُک گیا۔

"ذرا ٹھہرو۔ ایک منٹ رُک جاؤ۔" وہ جلدی سے گھوم کر اس شخص سے مخاطب ہوا جو لگے ہوئے پروجیکٹر اور اسکرین کو علیحدہ کر رہا تھا۔ اور پھر تیزی سے قدم بڑھا کر جج صاحب کی میز کے سامنے آیا۔

"حضورِ والا۔ انصاف کے نام پر میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

جج صاحب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"چونکہ آپ نے کمال مہربانی سے استغاثہ کو یہ فلم دکھانے کی اجازت دی تھی۔" کرافورڈ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس لئے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسے مکمل طور پر اپنے انجام تک دکھائے جانے کی اجازت بھی دیں۔"

"لیکن میں اس کی ضرورت سمجھنے سے قاصر ہوں۔" جج صاحب نے جواب دیا۔

"اس ریل میں ایک منظر اور بھی ہے حضورِ والا۔" کرافورڈ نے کہا۔ "وہ سین جب مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک آخری منظر جو فلم کو انجام تک پہنچاتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اور جیوری کے معزز ارکان اسے بھی دیکھنے کی زحمت گوارا کرلیں۔"

بینیلے جلدی سے اپنی کرسی سے اُٹھا۔

"حضورِ والا میں اس کمرۂ عدالت کو سینما ہال میں تبدیل کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ دکھانا چاہتا تھا......"

"پلیز۔" کرافورڈ نے تیزی سے کہا۔ "عدل و مساوات کا تقاضا ہے کہ جو ریل تم نے پیش کی ہے۔ اسے آخر تک دکھایا جائے۔ عدالت کو یہ دیکھنے کا موقع بھی دیا جائے کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ میری درخواست منظور کی جائے۔"

جج صاحب نے چند لمحے غور کیا۔ اور پھر بولے۔

"بہت بہتر۔ چونکہ میں وکیلِ استغاثہ کی اسی نوعیت کی درخواست منظور کر چکا ہوں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی درخواست مسترد کی جائے۔ مسٹر بینیلے آپ اپنے معاونین کو ہدایت کریں کہ وہ اس ریل کو اس کے اختتام تک دکھائیں۔"

"لیکن حضورِ والا......"

"عدالت اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔" جج صاحب نے کچھ ناگواری سے کہا۔

وکیلِ سرکار کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ اور پھر اپنے نائبوں کو فلم دکھانے کی ہدایت کی۔ پروجیکٹر نے ایک مرتبہ پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ اب جو منظر اسکرین پر نمودار ہوا وہ مقدمے کا آخری سین تھا جیوری کے ممبران باہمی مشورے کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے اور دوبارہ عدالت میں آکر اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے تھے۔ اس کے بعد جیوری کا فورمین اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور جج کو مخاطب کر کے بولا۔

"ہم جیوری کے ممبران ملزم پر لگائے ہوئے الزام کو حقائق پر مبنی سمجھتے ہوئے ملزم کو اس جُرم کا قصوروار ٹھہراتے ہیں جو اس پر عائد کیا گیا ہے......"

اور اس کے بعد یہ منظر بھی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ اب جو منظر اسکرین پر نمودار ہوا وہ اس کال کوٹھری کا منظر تھا جہاں پھانسی پانے والے قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ نوجوان مجرم کوٹھری کے فرش پر سر جھکائے انتہائی افسردگی و مایوسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے ہوئے فیصلے کی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک کوٹھری کا دروازہ کھلا اور جیل خانے کا پادری اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اُداس تھا وہ اس کے لئے کوئی نئی امید بن کر نہیں بلکہ صبر و ضبط کی تلقین کرنے آیا تھا۔ اس نے نوجوان کے شانے پر ہمدردانہ انداز میں ہاتھ رکھا اور نوجوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پادری نے اپنی انجیل مقدس کھولی۔ اور مجرم کو وہ الفاظ پڑھ کر سنانے لگا جو اس دم آخر میں اسے اپنے گناہوں سے توبہ کرنے اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے کیلئے صبر کی تلقین کرنے والے تھے۔

ابھی اس کی پند و نصیحت جاری تھی کہ جیل خانے کا وارڈن اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو گارڈ بھی تھے۔ وہ بھی بدنصیب نوجوان کے لئے کوئی خوش خبری لے کر نہیں آئے تھے۔ مجرم کو پھانسی دینے کا وقت ٹھیک گیارہ بجے مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس وقت گیارہ بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

نوجوان سسکیاں بھرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر کی جانب اُٹھا دیئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور اپنے کئے ہوئے پر ندامت و پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ اور خدا کا واسطہ دے کر رحم کی التجائیں کرنے لگا۔ وارڈن اس کی اس کیفیت سے بہت متاثر تھا۔ اس کے اپنے چہرے سے بھی گہرے غم و اندوہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے مجرم کو معاف کرنے یا چھوڑ دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ قانون اس کے بارے میں جو حکم سُنا چکا تھا وہ اس کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے پشیمان مجرم کے ہاتھ جنھوں نے التجائی انداز میں اس کا دامن پکڑ رکھا تھا نرمی سے علیحدہ کئے اور پلٹ کر گارڈ کو کچھ ہدایات دیں۔

اب وقت آگیا تھا کہ بدقسمت نوجوان کو اس کے آخری سفر کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کے پیروں سے جوتے اُتار کر جوٹ کے سلیپر پہنا دیئے گئے۔ اور پھر اسے دونوں جانب سے بازوؤں سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے پھانسی گھر کی طرف لے جایا جانے لگا۔

کوٹھری کا منظر ختم ہوا اور پردہ پر پھانسی گھر کا منظر نمودار ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ پھانسی گھر جانے والی راہداری میں آگے بڑھ رہے تھے۔ پس منظر میں غمناک موسیقی بج رہی تھی۔ پادری زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے دعائیہ کلمات ادا کر رہا تھا۔ اور بدنصیب مجرم سسکیوں کے درمیان گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ التجا کر رہا تھا کہ زندہ رہنے اور اپنی غلطی کا تدارک کرنے کا موقع دیا جائے۔ وعدہ کر رہا تھا کہ وہ معاشرے کے لئے ایک بہتر فرد ثابت ہونے کی پوری کوشش کرے گا۔ مگر کوئی کان اس کی التجائیں سُننے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

وہ راہداری کے آخر میں بنے ہوئے پھانسی گھر کے دروازے میں داخل ہوئے اور اندر جاکر نظروں سے غائب ہو گئے۔ اسی کے ساتھ پھانسی گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور دروازہ بند ہوتے ہی اسکرین پر دی اینڈ کے الفاظ اُبھر آئے۔

○

اس کے ساتھ ہی عدالت میں روشنیاں جل اُٹھیں۔ ہر طرف گہری خاموشی مُسلط تھی۔ اور کرافورڈ نے اس مکمل سکوت میں جیوری کے ارکان کے چہروں کی طرف دیکھا کہ شاید ان کے سپاٹ چہروں پر کوئی ایسا تاثر نظر آجائے جس سے وہ اپنے بیٹے کے انجام کا اندازہ لگا سکے لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

جیوری کے ممبران خاموشی سے اُٹھ کر باہم کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اور انھیں فیصلہ کرتے میں نصف گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ اور ان کا فیصلہ تھا کہ ٹوڈ کرافورڈ قتل غیر ارادی کا مرتکب ہوا ہے۔ جس کی سزا میں اسے بیس سال سے زیادہ کی مدت کے لئے جیل نہ بھیجا جائے۔

فیصلہ سُن کر ملیز کرافورڈ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن اس نے اپنی بہتی آنکھوں سے لاپرواہ ہو کر آگے بڑھتے ہوئے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ اور شاید یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب دونوں باپ بیٹے اس محبت و یگانگت کے ساتھ باہم گلے ملے ہوں۔

دانشمند اور نادان

علامہ شوکانی نے کسی عدالت میں دیکھا، مدعی اور مدعا علیہ کے وکیل جرح و بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں اور منصف نہایت غور سے ان کی باتیں سُن رہا ہے۔ شوکانی نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ دونوں وکیل اپنے اپنے دلائل میں بڑی عقل خرچ کر رہے ہیں جبکہ منصف سننے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ انھوں نے حاضرینِ عدالت سے کہا۔ "لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہاں دانشمند تو بحث کرتے ہیں اور نادان فیصلہ سناتے ہیں۔"

صدیوں پر محیط ایک ناقابلِ فراموش داستان

صدیوں کا بیٹا

ایم اے راحت

بیسویں قسط

نیویارک ایرپورٹ سے پرواز کرنے والا طیارہ طوفان میں گھر گیا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو نوجوان پائلٹ راڈرک نے ایک خوفناک سفر کے بعد اسے برف پر اتار لیا۔ طیارہ برف کے ایک پہاڑ میں داخل ہوگیا تھا اور بہت سے مسافر وحشت سے مر گئے تھے۔ نوجوان راڈرک نے باقی بچے ہوئے لوگوں کے ساتھ پہاڑ میں سرنگ کھودی اور اس کے ذریعے باہر نکل کر بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ پروفیسر خاور نے نوجوانوں کو تیار کرلیا کہ وہ جہاز کا ڈھانچہ برف کھود کر نکال لیں تاکہ اس میں بیٹھ کر ڈھلان کے دوسری طرف موجود دنیا میں جا سکیں۔ ڈھانچہ نکالنے کے بعد سب لوگ اس میں بیٹھے اور ڈھلان کا سفر شروع کردیا۔ اور پھر جب بوڑھے خاور کو ہوش آیا تو جہاز پھر تباہ ہو چکا تھا اور زندہ بچنے والوں میں وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں فرزانہ اور فروزاں تھیں۔ پروفیسر نے وہاں ایک غار دیکھا جس میں زندگی کے وجود کا پتہ چلتا تھا۔ جب وہ غار میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک عظیم الشان لیبارٹری موجود تھی۔ وہاں ایک تابوت رکھا ہوا تھا جس میں ایک نوجوان کا جسم رکھا ہوا تھا۔ پروفیسر کی تھوڑی سی کوشش سے یہ نوجوان جاگ اٹھا۔ نوجوان نے بتایا کہ اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ اور اس کی عمر نامعلوم ہے۔ وہ ہر دور میں زندہ رہا ہے۔ اس نے تہذیب کا ارتقاء دیکھا ہے۔ پھر اس نے اپنی کہانی شروع کی۔ کہانی کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوتی ہے جب نوجوان کو ایک لڑکی مل گئی تھی۔ پھر اسے دوسری لڑکی ملی جس نے پہلی لڑکی کو ہلاک کردیا۔ اس لڑکی نے اسے توسا کے نام سے پکارا۔ لڑکی نے اپنا نام نگالا بتایا تھا۔ ایک دن زلزلہ آیا تو نگالا زلزلے کی نذر ہوگئی اور نوجوان نے اپنے آپ کو ایک وادی میں پایا جہاں اس جیسے بہت سے لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ حالات نے اسے اس علاقے کا سردار بنادیا۔ وہاں اس نے طویل زندگی گزاری اور پھر ایک دن اکیلا گروہ اس علاقے سے نکل آیا۔ سمندر کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا وہ درختوں کی بستی میں جا نکلا جو تہذیب کی طرف گامزن تھی لیکن رقابت کا دور شروع ہوگیا تھا اور میدانوں میں بسنے والے گروہ ان درختوں والوں کی تاک میں تھے۔ ایک دن انھوں نے حملہ کرکے درختوں والوں کو تباہ کردیا۔ لیکن نوجوان کو انھوں نے بحیثیت دوست قبول کرلیا۔ وہیں اس کی ملاقات بوڑھے ارساں سے ہوئی اور ارساں نے جو سردار آکے کا باپ تھا اسے بڑی عزت بخشی وہ اسے ان غاروں میں لے گیا جہاں وہ لوہا دریافت کرنے کے بعد اس کے ہتھیار بنا رہا تھا۔ اس کی بیٹی ساحی اس کی مددگار تھی۔ بوڑھے نے اسے تہذیب سکھائی لیکن جب ساحی کے ساتھ اس کے جذباتی تعلقات قائم ہوگئے تو بوڑھا اس کا دشمن ہوگیا۔ اس نے اسے اور ساحی کو گرفتار کرکے آگ میں جھونک دیا۔ ساحی جل کر راکھ ہوگئی لیکن وہ زندہ رہا۔ بستی والے یہ دیکھ کر فرار ہوگئے۔ پھر اس نے سمندری سفر شروع کیا اور ایک لہر نے اسے ایک سفید زمین پر لا پٹخا۔ وہ یہاں سو گیا۔ جب نیند سے جاگا تو دنیا کئی قدم آگے بڑھ چکی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات آرسانہ کی ملکہ سے ہوئی۔ ملکہ نے اپنا سب کچھ اس پر نثار کردیا اور اسے لے کر آرسانہ آگئی۔ شہنشاہ کو ان کے تعلقات کا علم ہوا تو اس نے نوجوان کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا۔ نوجوان نے شیروں کو گھورنا شروع کیا تو سب خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ وہیں اس کے تعلقات شہنشاہ کی لڑکی ایبسہ سے استوار ہوگئے۔ شہنشاہ نے سازش کرکے اسے اور ایبسہ کو پینگ میں باندھ کر آتش فشاں کے دہانے میں اتار دیا۔ ایبسہ جل کر خاک ہوگئی۔ لیکن نوجوان کو آگ نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ انتقام کے طور پر وہ شہنشاہ کی دوسری لڑکی آکاشا کو لے کر فرار ہوگیا۔ پھر آکاشا بوڑھی ہو کر مرگئی تو وہ ایک بستی میں پہنچا وہاں ظالم طاآس حکمران تھا۔ بعض حیرت انگیز واقعات کے بعد طاآس اگناس کے ہاتھوں ہلاک ہوگیا۔ اور اس کی تمام بیویاں نوجوان کے حصے میں آگئیں۔ وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر وہ ایک جزیرے میں جا نکلا جہاں لاکھوں سیاہ فام آگ سے دیوتا کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے اسے یونیکا کہہ کر پکارا اور اسے بوڑھے آشوشا کے پاس لے گئے جو ایک پراسرار انسان اور غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا۔ بوڑھا عظیم سائنسدان تھا جس نے جڑی بوٹیوں سے طویل عمری کا راز پالیا تھا۔ لیکن وہ جوان ہونا چاہتا تھا۔ جوان ہونے کے شوق میں جب اس نے آگ کا غسل کیا تو مارا گیا۔ آشوشا کی موت سے بددل ہو کر وہ بستی سے اس غار میں آگیا اور وہ نظام قائم کیا جو پروفیسر خاور اور اس کی لڑکیوں نے دیکھا تھا۔ اپنے انتظامات کرکے وہ اس وقت تک کے لئے سو گیا جب دنیا تہذیب کے دور میں داخل ہوگی۔ جب وہ جاگا تو تہذیب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ وہ تہذیب کے گہوارے مصر میں داخل ہوگیا۔ وہاں بعض عجیب و غریب اور حیرت ناک واقعات سے گزر کر اس کی ملاقات غلاموں کے سوداگر سی سارا سے ہوئی۔ سی سارا کے جہاز پر موجود غلاموں سے اسے ہمدردی تھی اور وہ ان کی آزادی کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ جہاز پر موجود نوجوان کے دشمن سیاہ فام گیشے نے ایک قیدی کو اس کے قتل پر تیار کرلیا لیکن جو ہونا تھا وہی ہوا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ نوجوان نے گیشے کو طلب کیا لیکن اس نے وہاں بھی چالاکی سے کام لیتے ہوئے بات بدل دی اور موقع پا کر بوگاس پر خنجر کھینچ لیا۔ نوجوان نے اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے کہا ”میں نے گیشے کو کامیاب ہونے دیا اور اپنے قول کے مطابق اسے سزا دی۔ بعد میں یوجنا کے جہازوں سے مقابلے میں سی سارا مارا گیا اور یوجنا والے بھی مارے گئے تو قیدیوں کو آزادی مل گئی۔ انھوں نے مجھے اپنا راہنما تسلیم کرلیا۔ قیدیوں میں موجود عورتوں کو آپس میں بانٹ لیا گیا۔ پھر بھی کچھ عورتیں بچ گئیں تو میں نے اپنے آپ کو ان کے لئے وقف کردیا۔ اب ہر عورت مجھ سے فیضیاب ہوسکتی تھی۔ انہی عورتوں میں بوگاس کی بہن ابانیہ بھی تھی۔ آخر کار ہمارا جہاز ایک سرسبز زمین پر پہنچا۔ وہاں جانوروں کا وجود نہیں تھا جس کی وجہ ایک پراسرار وجود تھا۔ ہم نے اس زمین کو اپنا لیا۔ بوگاس اور دوسرے لوگوں نے یہ بات مان لی۔ لباس نہ ہونے کی وجہ سے برہنگی اپنانی پڑی تھی۔ وہاں رہتے ہوئے ہمیں خاصا عرصہ گزر گیا تھا۔ عورتیں بچے جن رہی تھیں۔ لوگ کھیتی باڑی میں لگے تھے کہ ایک رات جب ابانیہ میری آغوش میں تھی ہم لوگوں نے عجیب آوازیں سنیں۔ ہم دونوں چونک پڑے۔ یہ ڈھول کی آوازیں تھیں۔ ابانیہ کو لیکر میں آوازوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا

ہوا۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک وادی میں وحشی انسانوں کو دیکھا وہ لوگ ڈھول بجا رہے تھے اور کسی دیوتا کو پانچ انسانوں کی بھینٹ دینے آئے تھے۔ ان وحشی لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے ان پانچوں کو کھولا۔ ان لوگوں نے دیوتا نیمون کی کہانی سنائی۔ میں ان لوگوں کو لے کر بستی میں آیا اور انھیں اپنے لوگوں میں شامل کر لیا۔ انھوں نے پہاڑوں کی ملکہ شیمونا اور ہیگوں کی کہانی سنائی جو میرے لیے دلچسپ تھی۔ میں ہافو اور اس کی عورت پوشیانا کو لے کر نیمون کے غار کی طرف چل پڑا۔ نیمون کے غار کا معائنہ کرنے سے پتہ چلا کہ اس کے قدموں کے نشانات ایک بستی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ سو میں نے کہا کہ ہم بستی والوں کی مدد کریں گے۔ ہم گودری بستی کی طرف چل پڑے اور وہی ہوا... جس کا اندیشہ تھا۔ خونخوار نیمون بستی کے بے شمار لوگوں کو ہلاک کر کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا تھا۔ میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو سوگوار لوگوں کے درمیان چھوڑا اور خود نیمون کی تلاش میں نکل گیا۔ لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ ہاں جب میں واپس آیا تو انکشاف ہوا کہ شیمونا کے سپاہی ہافو کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ البتہ دونوں عورتیں محفوظ تھیں۔ میں نے بستی والوں کو اپنی طاقت سے مرعوب کر کے ان کے گھوڑے حاصل کیے اور سان بابے کا راستہ معلوم کر کے چل پڑا۔ لیکن راستے میں رقابت کی ماری پوشیانا نے اباتیہ کو قتل کر دیا۔ وہ میرا قرب چاہتی تھی۔ تب میں نے طیش میں آکر دونوں گھوڑوں کو ہلاک کر دیا اور پوشیانا کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور بالآخر ناقابلِ عبور راستو کو عبور کر کے میں شان بابے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ہیگوں کا راج تھا۔ کاہلوسِ اعظم ان کا سربراہ تھا۔ مجھے گرفتار کر کے ایک قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ہیگے مجھے دیوتا تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

اوراب آگے کے واقعات پڑھیے

میں نے گہری سانس لی۔ یہ غار اور اس کا دروازہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن تنہائی ملی تھی اس تنہائی میں تھوڑا سا وقت گزار کر میں سان بابے کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں غور کرنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔۔ آیا انھیں بھی اپنی دیوتائیت سے مرعوب کیا جائے، یا دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں۔۔!

حالانکہ میرے لیے کوئی مجبوری نہیں تھی۔۔ وقت جیسا بھی ہو اُس کے مطابق کام کیا جائے۔ میں قید خانے کی ایک دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔۔ اور گزرے ہوئے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نے مستقبل کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں جانی تھی۔ میں نے آسمان پر آنے والے حالات کے نقشوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ یوں سمجھو پروفیسر۔ کہ زندگی کے یہ سال تاریک گزرے تھے۔ میں نے صرف وقت ضائع کیا تھا۔ سوائے کچھ مخصوص واقعات کے، جو مجھے پیش آئے تھے۔۔ اور کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔

لیکن میں نے خود کو اس انداز میں تسلی دی۔ میری زندگی تو ایک طویل سفر ہے۔۔ صدیوں کے اس سفر میں اگر چند لمحات ٹھہر جاتے ہیں تو کیا مضائقہ ہے، ابھی تو زندگی بہت طویل ہے۔۔ ماہ و سال کا ذخیرہ بے پناہ ہے۔۔ اس میں سے کچھ ضائع ہو گیا تو کونسی مصیبت آ گئی۔۔ اور پھر میری زندگی کا کوئی طور تو نہیں ہے بس واقعات سے پُر زندگی میں جو لمحات بھی آئیں۔۔ وہی اسے رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔۔ میں ان میں تبدیلی کیوں کروں۔۔ سفر تو سفر ہے۔۔ اس میں جو کچھ بھی نظر آئے۔۔! ہاں میں ان میں جو حیثیت رکھوں وہی میرے لیے مناسب و ممکن ہے۔۔ میں لمحات کا تردد کیوں کروں۔۔ یوں میں نے سوچ کے رُخ بدلے۔

اور پھر میں نے اس بندر کے بارے میں سوچا۔ جو خوبصورت رتھ میں بیٹھ کر آیا تھا۔۔! تو اب مجھے ان بندروں سے نپٹنا ہے۔ لیکن یہ بندر چالاک ضرور ہیں ورنہ سان بابے کے خونخوار لوگوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔۔ اور پھر کاہلوس۔ ان بندروں کا استاد۔ جس سے رات کو میری ملاقات ہونے والی تھی۔

دیکھنا ہے یہ کاہلوس اعظم کیا حیثیت رکھتے ہیں۔۔!

وقت گزرتا رہا۔۔ پھر اچانک غار کی چھت میں ایک سوراخ نمودار ہوا۔ اور اس سوراخ سے میرے لیے کھانا لٹکا دیا گیا۔۔ وہ لوگ غار کا دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔

میں نے کھانا دیکھا۔ عمدہ اور میرا پسندیدہ کھانا تھا۔۔ میں نے اُسے قبول کر لیا۔۔ ویسے میں نے سوچا کہ فوری طور پر ان سے تعاون کروں۔ اس کے بعد حالات جو بھی ہوں۔۔ اس کے مطابق کام کرنا مناسب ہوگا۔

کھانے کے بعد میں اطمینان سے لیٹ گیا۔۔ اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا! چھت کا سوراخ کھلا رہنے دیا گیا تھا۔۔ وہ میرے فرار کا راستہ نہیں بن سکتا تھا۔۔ اس لیے انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔ اس سوراخ سے تیز ہوا آ رہی تھی۔ جس نے غار کی گھٹن ختم کر دی تھی۔ اس سوراخ سے چاندنی اندر آئی، جس نے رات کا احساس دلایا۔!

اور پھر چاند غار سے گزرنے لگا تو۔۔ باہر بے شمار لوگوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ یہ آوازیں غار کے دروازے سے سنائی دے رہی تھیں اور پھر دروازہ کھولا جانے لگا! دروازہ کھل گیا۔۔ اور ایک بہت بڑے سر نے اندر جھانکا۔۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری گرز تھا۔

"باہر آ جاؤ قیدی۔۔ تمہیں مقدس کاہلوسِ اعظم نے طلب کیا ہے؟"

اس کی آواز کی گڑگڑاہٹ گونجی۔

میں باہر نکل آیا۔۔ تب دس بارہ آدمی موٹی موٹی زنجیریں لیے ہوئے آگے بڑھے۔۔ اور میں نے گرز والے کو مخاطب کیا۔

"تمہارا کیا نام ہے۔۔"

"فولو۔۔ روحا فولو۔۔" اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"تمہاری کیا حیثیت ہے۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"میرے گرز کی ضرب چٹانوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ میرے جسم کی قوت سان بابے کے تمام لوگوں پر حاوی ہے۔ اس لیے میں سان بابے کی جنگجو فوجوں کا اتالیق اور ان کا سربراہ ہوں۔۔ اگر مقدس کاہلوس نے تمہارے قتل کے احکامات صادر کیے تو میں ہی تمہارا قاتل ہوں گا۔۔ کیونکہ سُنا ہے تم نے سان بابے کے باشندوں کو اپنی قوت کے شعبدے دکھائے ہیں۔۔ میں شعبدہ شکن ہوں قیدی۔۔ اس لیے اس وقت تک خود کو قابو میں رکھو، جب تک مقدس کاہلوس تمہارے قتل کا حکم نہ دے دے۔۔ اس کے بعد۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں شعبدے دکھانے کا پورا پورا موقع دوں گا۔۔ تمہاری موت چوہوں کی مانند نہ ہوگی، بلکہ تم دل کی حسرتیں نکال کر مر سکو گے۔۔"

"تو پھر طاقتور روحا۔۔ میں تجھ سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیسا معاہدہ۔۔؟"

"ان بے وقوفوں سے کہہ دے کہ یہ زنجیریں واپس لے جائیں۔۔ یہ جانتے ہیں زنجیریں میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔۔ یہ بیکار بوجھ میرے جسم پر نہ لاد۔۔ میں تیرے وعدے کی قید پسند کروں گا۔"

اور روحا نے غور سے میری آنکھوں میں دیکھا۔۔ اور پھر گردن ہلا کر بولا۔ "گو کاہلوسِ اعظم کے سامنے کسی قیدی کو آزاد دیکھنا اسے ناگوار بھی گزر سکتا ہے۔۔ لیکن روحا اپنی ذمہ داری پر تیری بات مان لیتا ہے۔۔ اس کی گرفت کمزور نہیں ہے۔" پھر اس نے اپنے آدمیوں کی طرف رُخ کر کے کہا۔ "زنجیریں واپس لے جاؤ۔ قیدی اسی طرح چلے گا۔"

کسی نے تعرض نہیں کیا۔۔ اور میں نے روحا کا شکریہ ادا کیا۔ بے شمار لوگوں نے میرے گرد دائرہ بنا لیا۔۔ وہ سب کھلے ہوئے ہتھیاروں سے لیس تھے۔۔ روحا میرے برابر اپنا وزنی گرز لیکر چل رہا تھا۔۔ وہ بھی میری طرف سے چوکنا تھا۔۔ یوں ہم سان بابے کے بازاروں سے گزرتے ہوئے پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔

"کاہلوس کہاں رہتا ہے۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"بستی سے دور۔۔ پہاڑوں میں۔۔ یوکا کے معبد کے پاس۔"

"اور ملکہ شیمونا۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"سیاہ محل میں۔۔ اس کا قیام وہیں ہوتا ہے۔"

"دوسرے پجاری کہاں رہتے ہیں۔۔؟"

"یوکا کے معبد میں۔۔ بستی کی گہما گہمیوں سے دُور۔ انھیں تنہائی پسند ہے۔۔ ہاں مقدس ہیگے ضرورت پڑنے پر بستی میں آتے رہتے ہیں۔"

"تم لوگوں کے ساتھ ہیگوں کا سلوک کیسا ہے۔۔؟"

"وہ قادر ہیں۔۔ جو بہتر سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔" روحا نے بھاری آواز میں کہا۔

"گویا ہیگوں کے سامنے شیمونا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"فضول باتوں سے پرہیز کر قیدی۔۔ مجھے غصہ بھی آ سکتا ہے۔"

"اس میں غصے کی کونسی بات ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"شیمونا ملکہ ہے۔۔ اس کا حکم آخری ہوتا ہے۔۔ یہ دوسری بات ہے کہ آخری حکم وہ مقدس کاہلوسِ اعظم سے مشورے کے بغیر نہیں صادر کرتی۔" روحا نے جواب دیا۔ اور میں گردن ہلانے لگا۔

"بات ایک ہی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اور ہم سان بابے کی چاندنی میں نہائی پُرسکوت بستی سے نکل آئے۔۔! چہار جانب ایک پُراسرار سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں صرف سپاہیوں کے قدموں کی آوازیں رخنہ انداز تھیں۔۔ یوں۔۔ یوکا کے معبد تک کا مختصر سفر طے ہو گیا۔۔ یہ معبد بھی پہاڑیاں تراش کر بنایا گیا تھا۔ پہاڑ ہی میں ایک چٹان کو بھدے ہتھیار کی شکل دی گئی تھی۔ نیچے اس کا غار نما دروازہ تھا جس پر پتھر کا عظیم الشان دروازہ لگا ہوا تھا۔۔ دروازہ کھولنے کے لیے ایک چرخی قریب ہی لگی ہوئی تھی۔ یہ چرخی بھی بھاری پتھروں سے تراشی گئی تھی اور اسے کئی آدمی مل کر گھما سکتے تھے۔۔ چنانچہ چند افراد چرخی کی طرف بڑھ گئے۔۔ اور پھر ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی پیلے رنگ کی روشنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی چربی جلنے کی بو بھی۔۔ یہ چربی سے جلائی جانے والی مشعلیں تھیں جو جگہ جگہ دیواروں میں نصب تھیں۔

لیکن معبد کے اس عظیم الشان غار کو دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔۔ بہت طویل غار تھا۔ اندر سے بالکل صاف ستھرا۔ چھت بھی کافی بلند تھی، اور اس میں جا بجا سوراخ تھے جن سے خوب ہوا آ رہی تھی۔ ہوا کی وجہ سے مشعلوں کے شعلے لرز رہے تھے۔ لیکن مخصوص قسم کی چربی کی وجہ سے وہ بجھ نہیں سکتی تھیں۔

پورے غار میں سکون تھا۔۔ جگہ جگہ ہیگے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ پتھروں کے بت کی مانند خاموش اور ساکت تھے۔ کسی کے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ سامنے ہی ایک چوڑا چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ جس پر انگارے بچھے ہوئے تھے۔ ان انگاروں سے سفید دھواں بلند ہو رہا تھا۔ شاید صندل کی لکڑیاں ان میں ڈالی گئی تھیں۔ ایسی ہی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ غرض انتہائی پُراسرار ماحول تھا۔۔ مجھے ایک مخصوص حصے میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔۔ سپاہی کچھ تو باہر ہی رہ گئے تھے۔ ہاں روحا اور تقریباً دس مسلح آدمی اب بھی میرے گرد کھڑے تھے۔!

"یہ مقدس کاہلوس کا دربار ہے۔" روحا نے کہا۔

"خوب۔۔ کاہلوس کہاں ہے۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی چند لمحات کے بعد۔۔ اس کی زیارت ہوگی۔۔"

"ہوں۔۔!" میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں نے ہیگوں کی جانب دیکھ کر کہا۔ "کیا یہ پتھر سے تراشے ہوئے انسان ہیں۔"

"خاموش۔۔ ان کی شان میں گستاخی نہ کر۔۔ ورنہ زبان کاٹ لی جائے گی۔" روحا دبی زبان میں غرایا۔

"پھر یہ ساکت کیوں ہیں۔۔ ہل جل بھی نہیں رہے۔"

"کاہلوسِ اعظم کے دربار کی یہی شان ہے۔ سینکڑوں ہیگے یہاں ساکت جامد کھڑے ہو کر کشف کرتے ہیں۔ کاہلوسِ اعظم انھیں علم سے نوازتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت عظیم ہے، لیکن کاہلوس کے دربار میں سب ہیچ ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

میں نے گردن ہلا دی۔۔ نیا ڈرامہ نہیں تھا۔۔ میں نے بے شمار لوگ دیکھے تھے۔۔ بڑے بڑے انوکھے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا تھا۔۔ لیکن میں بار بار بلند ہوتے ہوئے سفید دھوئیں کو دیکھ رہا تھا۔۔ نہ جانے یہ دھواں کہاں سے آ رہا تھا۔ جبکہ اس چبوترے کے نزدیک کوئی بھی نہیں تھا۔!

خاموشی سے کھڑے کھڑے بہت دیر گزر گئی تو میں نے بے چینی سے

روحا کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ”کیا تمہارا کاہوں اعظم سو رہا ہے۔ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟“

”اے شخص۔ گستاخی نہ کر۔ میری درخواست ہے کہ اس کے حضور گستاخی نہ کر۔ ورنہ میں اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکوں گا۔“ روحا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ اسے آواز دے۔ ممکن ہے میرے امن کے ارادے بدل جائیں۔ میں اس کا غلام نہیں ہوں۔“

”اوہ۔ اوہ۔!“ روحا نے اپنی پیٹی سے خنجر کھینچ لیا۔ لیکن اسی وقت غار کی دیواروں نے پریاں اگلنا شروع کر دیں۔ غار کی دیواروں کے ان سوراخوں پر پہلے میں نے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن جب ان سے بے شمار نیم عریاں لڑکیاں نکل آئیں تو میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ لڑکیوں کے جسم پر لباس نہ ہونے کے برابر تھے۔ انہوں نے جسم کے مختلف حصوں کو گاڑھے رنگوں سے رنگا ہوا تھا۔ کچھ حصوں پر پرندوں کے رنگین پَر چپکائے گئے تھے۔ سروں پر انہوں نے مور کے پروں کے تاج سے پہنے ہوئے تھے۔ لیکن یہ لڑکیاں سب کی سب نوخیز اور جاندار چہروں والی تھیں۔! انہوں نے ایک قطار بنائی اور چبوترے کی طرف بڑھیں۔ پھر وہ چبوترے کے سامنے جھک گئیں۔ ان کے جسموں کے حسین خط و خال نمایاں ہو گئے۔ ان کے متناسب جسم بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کرتب دونوں حصوں کو مختلف رنگوں سے رنگ رکھا تھا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح جھکی رہیں۔ پھر سیدھی ہو گئیں۔ اور پھر ان کی آوازیں ابھریں۔

”کائنات کے سب سے بڑے جادوگر۔

آسمان کی خبر رکھنے والے۔ ہماری آنکھیں تیری منتظر ہیں۔ دیکھ کتنے لوگ تیرے سامنے ہیں۔

دیوتاؤں کے منظورِ نظر۔ آ جا۔ تیری خادمائیں تیرے گیت گا رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی ہے۔“

اور پروفیسر۔ اچانک انگارے دہکنے لگے۔ سفید دھواں غائب ہو گیا۔ اب پیلے رنگ کے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔ اور یہ شعلے بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔ مجھے اچانک بلند ہو جانے والی آگ پر حیرت تھی۔ نہ جانے کس ترکیب سے یہ آگ روشن کی گئی تھی۔

پھر میں نے آگ کے پیچھے سے ایک سایہ نمودار ہوتے دیکھا۔ مگر یوں جیسے کوئی زمین سے نکل رہا ہو۔ یقیناً یہ سایہ آگ کے دوسری طرف صاف جگہ میں تھا۔ ایک انسانی سایہ آگ کے عقب میں صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس کا اوپری جسم برہنہ تھا۔ شاید نچلا جسم بھی لباس سے عاری تھا، لیکن آگ کے شعلے اسے لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ اس لیے صاف اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

او رگیت ختم ہو گیا۔ سر جھک گئے۔ جھکنے والے اس کے حکم کے بغیر سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ لیکن میں بے پلک نگاہوں سے اس شعبدہ باز کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں ویسی ہی لمبی چھڑی تھی جیسی میں نے پہلے بیگے کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔

اس نے چھڑی بلند کی اور بولا۔ ”میں نے تمہاری تعظیم قبول کی۔“

اور جھکے ہوئے سر اٹھ گئے۔ تب پُراسرار وجود آگ کے چبوترے میں در آیا۔ اور میں نے خوب غور سے اُسے دیکھا۔ وہ شعلوں کے درمیان پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ شعلے اس کے جسم کو چاٹ رہے تھے۔

کیا یہ کوئی بھائی بند ہے۔؟ میں نے سوچا۔ یقیناً وہ آگ کے اندر سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ بہرحال میں نے اس پُراسرار شخص کے بارے میں خوب جان لیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ان ناسمجھ لوگوں میں کیا حیثیت رکھتا ہوگا۔

رقص کرنے والی نیم برہنہ لڑکیاں پروانوں کی مانند اس آگ کے گرد چکرانے لگیں۔ ایک عجیب سے ناقوس سے ایک بھیانک آواز بلند ہونے لگی اور اور اس آواز کے ساتھ ہی کسی پتھر پر ایک مخصوص تال دی جا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا۔ ماحول کو پُراسرار بنانے میں جو کارروائی کی گئی تھی، میں اس کا دل سے معترف تھا۔ بلاشبہ یہاں ذہنوں کو گرفت میں لیا جا سکتا تھا۔!

نیم برہنہ لڑکیاں اب بے باک ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی، اور ان کے رقص میں ایک عجیب سا ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ میں اس رقص سے خاصا محظوظ ہوا۔ اور میں نے سوچا کسی دربار میں ایسا رقص کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہیں آگ میں بیٹھے ہوئے شخص کو بھی دیکھ رہی تھیں، جس کا چہرہ اب خوب چمک رہا تھا۔ یقیناً وہ مادر زاد برہنہ تھا اور اس کا چہرہ بھی جھریوں سے بھرا اور خوب بھیانک تھا۔

کئی منٹ کے بعد اس نے چھڑی اٹھائی اور رقص اس طرح رک گیا جیسے کسی میکنزم کو فوری طور پر بند کر دیا گیا ہو۔! اس نے چھڑی سے اشارہ کیا اور رقاصہ لڑکیاں ایک ایک کر کے انہیں سوراخوں سے اندر چلی گئیں۔

”روحا۔!“ بھیانک شخص نے بھیانک آواز میں کہا۔

”مقدس کاہوں اعظم۔!“ روحا آگے بڑھ کر جھکا۔

”اجنبی کو سامنے لاؤ۔“

روحا نے گردن جھکائی۔ اور پھر وہ میرے قریب آ گیا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر آگے دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے دونوں بازو ایک دوسرے سے باندھ لیے تھے۔ اور جسم سخت کر لیا تھا۔ روحا کی کوشش مجھے ہلا نہ سکی۔ تب روحا نے پوری طرح میرے بازو پر گرفت کی اور مجھے زور سے جھٹکا دے کر کاہوں کے سامنے گرانے کی کوشش کی۔ لیکن میں بھی کاہوں اعظم کو چند شعبدے دکھانا چاہتا تھا۔!

چنانچہ روحا کی پوری قوت میرے بدن کو جنبش بھی نہ دے سکی، اور روحا بجلی سی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مجھ سے لپٹ پڑنے کی کوشش کی۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی آگے بڑھ آئے تھے، اور پروفیسر روحا اور اس کے ساتھی مجھے آگے بڑھانے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ بدن کا کوئی حصہ اپنی جگہ سے ہل گیا تو پھر بات ہی کیا بنی۔؟

ساری گردنیں میری سمت گھوم گئی تھیں۔ لوگ مجھے حیرت زدہ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ہاں میں نے کاہوں کی آنکھوں میں ایک عجیب معنی خیز چمک دیکھی۔ پھر کاہوں کی تمسخرانہ آواز گونجی۔ ”مروحا۔ تیری قوت کیا ہوئی۔؟ کیا تو اپنی قوت کھو چکا ہے۔؟“

”یہ۔ یہ شخص شعبدہ گر ہے مقدس کاہوں۔“ اس نے فولادی زنجیریں توڑ دی تھیں۔ اس نے۔ اس نے۔“ شدتِ حیرت سے روحا کی ذہنی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ اور اس کے منہ سے صاف الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”شعبدہ گر نہیں کاہوں۔ تمہارا یہ بے وقوف غلام مجھے جادوگر تسلیم کرنے سے ہچکچا رہا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جسمانی قوت کے شعبدے دکھانے والے جادوگر نہیں کہلا سکتے اجنبی۔ اگر تم جادوگر ہو تو تمہارا امتحان لیا جا سکتا ہے۔!“

”ضرور۔!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اپنی اس چھڑی سے اشارہ کرو اور مجھے اپنے سامنے بلا لو۔“

”میں چاہوں تو زمین کا یہ ٹکڑا اپنی جگہ چھوڑ دے گا اور تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ لیکن اجنبی۔ میرے سامنے آؤ۔ مجھ سے گفتگو کرو۔!“

”ہاں۔ یہ دوسری بات ہے۔!“ میں نے کہا۔ اور آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ بھی مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”بیگوں کا کہنا ہے کہ تم خود کو دیوتا کہتے ہو۔؟“ اس نے کہا۔

”نہیں۔ تمہارے آدمیوں نے مجھے دیوتا کہا۔“

”تم خود کو کیا کہتے ہو۔؟“

”گوشت و پوست کا ایک انسان۔ جیسے تم ہو۔!“

”میں۔؟“ پُراسرار شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ میں حقارت تھی۔ ”خیر۔ مجھے تم نہیں جانتے۔! ہاں تمہارے جسم پر چمکدار پیلاپٹ کیوں ہے۔؟ تمہارے بال آگ کے رنگ کے کیوں لگتے ہیں۔؟“

”یہ میرا جادو ہے۔“

”غلط۔ یہ کسی بوٹی کا کمال ہے۔ اور میں یہ طلسم بآسانی توڑ سکتا ہوں۔“

”میں تمہیں اس کی دعوت ضرور دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم سان باسے کیوں آئے ہو۔؟“

”ہالوکو رہا کرانے۔“ میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔

”ہالو۔ ہالو کون ہے۔؟“ اس نے پوچھا۔

”سُنا تم لوگوں نے۔ تمہارا یہ خبر کاری کچھ نہیں جانتا۔ وہ ظلم ہے۔“ کاہوں نے دوسروں کی طرف رُخ کر کے کہا۔

”اس کی زبان کاٹ دی جائے۔“

”اس کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔“

”یہ بدکلام ہے۔“

”یہ بے باک ہے۔“

”یہ مقدس بیگے کا مذاق اُڑا رہا ہے۔“ بہت سی طیش میں ابھرتی ہوئی آوازیں ابھریں۔ لیکن کاہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی بلند کر دی۔

”یہی سب کچھ اس کے ساتھ ہوگا۔ تم دیکھ لوگے۔ کہ اسے کس کی بے باکی کی کیسی عبرتناک سزا ملے گی۔ لیکن ابھی نہیں، رک جاؤ۔ مجھے اس سے ضروری سوالات کرنے دو۔“

شور مچانے والے غضیلی آوازیں نکالتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ تب کاہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن مجھے

بانو کے بارے میں بتاؤ — وہ کون ہے ـ ـ؟"

"بانو — وہ نوجوان ہے جسے تمہارے آدمی گودری بستی سے پکڑ کر لائے تھے ـ اس پر الزام ہے کہ اس نے نیمون کا نوالہ بننے سے بچنے کی کوشش کیوں کی ـ ـ؟"

"اوہ — اوہ — دیوتاؤں کی قسم — تو کیا تم وہی انسان ہو جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بانو کو نیمون کے غار کے سامنے سے آزاد کیا تھا ـ تم ہی وہ مجرم ہو جس کی وجہ سے گودری کے لوگ موت کا شکار ہو رہے ہیں؟"

"ہاں — تمہارا خیال درست ہے ـ" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے پانیوں کے کنارے کوئی بستی آباد کی ہے؟"

"ٹھیک ہے ـ" میں نے گردن ہلائی۔

"اور تم ایسے سر پھرے ہو کہ نیمون کو ہلاک کر دینے کا دعویٰ کرتے ہو ـ؟"

"یہ بھی درست ہے ـ!"

"سنتے ہو لوگو — ارے سنتے ہو لوگو — یہ سر پھرا قہر کے دیوتا کو ہلاک کرنے کی سوچ رہا ہے — یہی ہے وہ احمق — یہی ہے وہ پاگل دیوانہ — ذرا غور کرو — ہاں — اس کے بدن میں کچھ طاقت ہے ـ اور یہ کم ظرف اسی طاقت کے بل پر ایسی ایسی احمقانہ باتیں سوچتا ہے ـ"

"تمہارے خیالات ٹھیک ہیں کاہوس — کیا اب تم میرے چند سوالات کے جواب دو گے ـ"

"ہر چند کہ میں اس کے لئے مجبور نہیں ہوں ـ مجھ کو کون مجبور کر سکتا ہے لیکن تو دلچسپ آدمی ہے ـ تیری باتوں پر ہنسی آتی ہے ـ یقیناً تیرے سوالات بھی ایسے ہی احمقانہ ہوں گے ـ ٹھیک ہے سوال کر ـ!"

"کیا بانو زندہ ہے ـ؟"

"ہاں — زندہ ہے — جسے نیمون کی بھینٹ کیلئے منتخب کر لیا گیا ہو ـ اسے کوئی دوسرا ہلاک بھی نہیں کر سکتا ـ تین چاند کے بعد اسے نئے لوگوں کے ساتھ پھر نیمون کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے گا ـ!"

"اوہ ـ!" میں نے سکون کی گہری سانس لی ـ اس کا مطلب ہے کہ اس کی زندگی ابھی کافی عرصے تک محفوظ ہے اور مجھے اس کی زندگی بچانے کے لئے کسی فوری تگ و دو کی ضرورت نہیں ہے۔

"کیا تم نے بانو کو اذیتیں دی تھیں ـ؟"

"نہیں — ہم سوالات کرنے کے لئے اذیتیں نہیں دیتے — اگر انسان ہمارے سوالات کا جواب دینے میں ہچکچائے تو اس کی زبان ہمارا حکم پورا کرے گی ـ بانو نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا — لیکن آدمی تم بھی گہرے ہو — خوب چکر چلاتے ہو ـ"

"میرے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے گا ـ؟"

"اس کا فیصلہ ہم کریں گے ـ ہماری مجلسِ مشاورت ہو گی اور اس میں تمہارے لئے جو بھی طے کیا جائے ـ"

"اس وقت تک میری حیثیت کیا ہو گی ـ؟"

"ایک قیدی کی ـ صرف ایک قیدی کی ـ"

"اور مجھے یہ حیثیت قبول نہیں ہے ـ سنو کاہوس — تمہارا جادو ان لوگوں کو احمق بنا سکتا ہے — میں ان تمام چیزوں سے الگ ہوں — میں تمہارے ساتھ تعاون کر سکتا ہوں — دو باتوں پر — نیمون کی نشاندہی کرو — اور اس تک پہنچانے میں میری مدد کرو تاکہ میں اسے قتل کر دوں — دوسری بات یہ کہ میرے ساتھی بانو کو رہا کر دو — میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا ـ"

"دیوتاؤں کی قسم تمہیں تمہاری اہانت کی سزا ضرور ملے گی ـ ایسی سزا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ ـ"

"میں نے جو ناسب سمجھا تم سے کہہ دیا ـ اب صرف یہ سوچو مجھے قیدی بنا کر کس طرح رکھو گے ـ؟" میں نے کہا۔

"زرد جسم والے اجنبی ـ" کاہوس نے کہا ـ "تیرے اندر انوکھی قوتیں ہیں — میں نہیں چاہتا کہ شیونا کے روبرو پیش کئے بغیر تجھے قتل کر دوں — میں تجھے زندہ رکھنا چاہتا ہوں ـ"

"تو مجھے ملکہ کے سامنے پیش کر دو ـ"

"ابھی نہیں — ملکہ کے ظہور میں ابھی چند روز باقی ہیں — وہ ایک مخصوص دن دربار کرتی ہے ـ"

"کوئی حرج نہیں — میں اس وقت تک انتظار کر لوں گا ـ!"

"لیکن میری مجلسِ مشاورت نے اگر یہ طے کیا کہ تجھے ملکہ کے سامنے لائے بغیر قتل کر دیا جائے — تو پھر ایسا ہی ہو گا ـ!"

"اب میں صاف زبان استعمال کروں گا بوڑھے کاہوس میرے سامنے تیرا جادو کوئی حیثیت نہیں رکھتا ـ تو سادہ لوح لوگوں کو اپنے شعبدوں کے جال میں پھانس کر بے وقوف بنا سکتا ہے ـ مجھے نہیں تو آگ کے ان شعلوں میں بیٹھ کر ان لوگوں پر رعب ڈال سکتا — مجھ پر نہیں ـ"

"وہ — وہ —" ردھا اب برداشت نہ کر سکا ـ وہ اپنا گرز لیکر مجھ پر ٹوٹ پڑا ـ گرز کی خوفناک ضرب میرے کاندھے پر پڑی اور پھر دوسری ضرب میری کمر پر ـ ردھا میرے جسم کی ہڈیاں پاش پاش کر ڈالنا چاہتا تھا ـ چنانچہ وہ میرے اوپر تابڑ توڑ حملے کرتا رہا — اور میں خاموشی سے اس کے گرز کی چوٹیں سہتا رہا — پھر ایک بار — صرف ایک بار میں نے ہاتھ اٹھائے — اور ردھا کے گرز کو پکڑ لیا — اس کے بعد میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے گرز کو درمیان سے موڑ کر پھینک دیا ـ کاہوس آگ کے چبوترے پر کھڑا ہو گیا تھا اس کے چہرے پر تعجب کے آثار تھے۔

تب میں نے آگے بڑھ کر ردھا کی گردن پکڑ لی — اور دوسرے لمحے وہ میرے سر سے بلند ہو گیا — میں نے اسے دو تین چکر دیئے اور پھر زمین پر کھڑا کر دیا ـ "میں تجھے قتل نہیں کروں گا ردھا — کیونکہ تیری آنکھیں بند ہیں ـ"

ردھا دیوانوں کی طرح اپنے گرز کو دیکھ رہا تھا ـ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا ـ تب کاہوس کی آواز ابھری۔

"تجھ اسے بے پناہ طاقت والے — تو نے مقدس آگ کے بارے میں بھی کچھ کہا ہے ـ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ دیوتاؤں کا پرتو ہے ـ کیا تو اس کی بھی توہین کرے گا ـ"

"آگ میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ـ"

"تب میں تجھے نزدیک آنے کی دعوت دیتا ہوں — آ — میرے قریب ہی آگ میں بیٹھ جا ـ!"

"اس کے بعد کیا ہو گا ـ؟"

"میں اپنے علم کو آواز دوں گا — میں جاننا چاہوں گا کہ میرے جادو نے دیوتا کی آمد کے بارے میں مجھے غلط اطلاع کیوں دی تھی ـ ممکن ہے مجھ سے ہی غلطی ہوئی ہو ـ"

"یہ ٹھیک ہے ـ" میں نے تسلیم کیا — میں سمجھ گیا کہ بوڑھا شیطان آخری چال چل رہا ہے ـ وہ مجھے آگ میں بھسم کر دینا چاہتا ہے ـ یقیناً اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے ـ!

چنانچہ میں چبوترے کی طرف بڑھ گیا — کاہوس آگ سے نکل گیا تھا اور آگ کے شعلے اور بھڑک اٹھے تھے — اس وقت آگ اچانک کافی تیز ہو گئی تھی ـ نہ جانے انہوں نے آگ روشن کرنے کا کونسا انتظام قائم کیا تھا ـ

اب ساکت و جامد کھڑے بگیے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے ـ ان کے چہروں پر عجیب تاثرات نمایاں تھے — میں آگ کی طرف بڑھ رہا تھا ـ اور پھر میں روح کو غذا پہنچانے والی آگ میں داخل ہو گیا ـ شعلوں کی لطیف حرارت میرے مسامات سے اندر داخل ہونے لگی اور میں شعلے بدن پر ملنے لگا — کاہوس کی آنکھیں پیالوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں ـ بگیے بھی منہ پھاڑے مجھے گھور رہے تھے ـ

لیکن میری آنکھیں فرطِ سرور سے بند ہوئی جا رہی تھیں ـ اور کافی دیر تک غسلِ آتش کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا ـ میرا بدن سنہرا ہو گیا تھا ـ میرے بال اور زیادہ آتش رنگ ہو گئے تھے ـ

کاہوس کے چہرے پر اب نمایاں طور پر پریشانی نظر آ رہی تھی ـ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا ـ اور پھر مضطربانہ انداز میں بولا

"ہو سکتا ہے ـ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو — ہو سکتا ہے تو دیوتا ہی ہو ـ اگر ایسا ہے تو — مجھے مہلت دے — میں اپنے علم میں تجھے تلاش کروں — ہاں ـ اب تو قیدی نہیں ہو سکتا — اب تو قابلِ احترام ہے — اور تیرا قیام آزادانہ ہو گا — لیکن اس وقت تک — جب تک ملکہ شیونا سے تیری ملاقات نہ ہو جائے وہ عظیم ہے — وہ دیوتاؤں کی منظورِ نظر ہے وہ تیرے بارے میں مناسب فیصلہ کرے گی ـ"

"میں تیار ہوں میں اس سے ضرور ملاقات کروں گا ـ"

"ردھا — اسے رنگ محل لے جاؤ — اس کی آسائشوں کا خیال رکھا جائے — میں دربار برخاست کرتا ہوں — اور ہاں ـ اجنبی دیوتا — تجھے جس شے کی ضرورت ہو طلب کر لینا ـ"

"شکریہ کاہوس ـ" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میں ردھا کے ساتھ باہر نکل آیا ـ ردھا کمزور انسان کی مانند حرکت کر رہا تھا ـ اس کے چہرے پر بہت پریشانی کے آثار تھے ـ بہرحال جس جگہ مجھے لایا گیا تھا وہ بہت آرام دہ تھی ـ اسے قید خانہ نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہاں آسائشوں کے سارے سامان موجود تھے ـ

میں نے یہاں قیام پسند کیا ـ دوسرے لوگوں کو میں نے جلنے کا جواز دے دیا تھا ـ رات کافی گزر گئی تھی لیکن پھر بھی میں آرام کرنے لیٹ گیا — اور مجھے نیند آ گئی — وہ نیند جو خاص ہوتی ہے اور جو صرف اعضا کو سکون دینے کا ایک ذریعہ ہے۔

دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو خدام میری خدمت کیلئے حاضر تھے مجھے غسل کی پیشکش کی گئی ـ لیکن غسلِ آتش کے بعد کسی دوسرے غسل کی خواہش نہیں رہتی تھی ـ پھر مجھے ناشتہ پیش کیا گیا — وہ لوگ میری منفرد عادات میں الجھے ہوئے تھے سورج جب سر پر پہنچ گیا تو ایک خادم میرے پاس آیا اور جھک کر بولا۔

"ردھا آپ سے ملاقات کا متمنی ہے ـ"

"بھیج دو ـ" میں نے کہا ـ اور چند ساعت کے بعد ردھا میرے قریب آ گیا ـ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مجھے تعظیم دی اور پھر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے ردھا ـ؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی گستاخیوں پر شرمندگی کا اظہار کرنے آیا ہوں عظیم دیوتا ـ"

"وہ تیرا فرض تھا ردھا ـ مجھے شکایت نہیں ہے ـ"

"دیوتا کا سینہ بے حد کشادہ ہے ـ لیکن ردھا اب تیرے سوا کسی کا غلام نہیں ہے ـ اس کا دل صرف تیری غلامی قبول کر سکتا ہے اور کسی کی نہیں ـ ردھا آج تک صرف اپنے عقیدے کا غلام رہا ہے ـ اس نے آنکھیں بند کر کے بگیوں پر بھروسہ کیا ہے ـ لیکن اب صورتِ حال دوسری ہے ـ بگیوں کی شخصیت میری نگاہ میں مشکوک ہو گئی ہے ـ مجھے اب ان پر بھروسہ نہیں رہا ہے ـ"

"ایسی کیا بات ہو گئی ردھا ـ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کل کے واقعات ـ وہ جو تیرے سامنے تیری موجودگی میں پیش آئے تھے — اور وہ جو تیرے چلے آنے کے بعد ـ!"

"اوہ — میرے چلے آنے کے بعد کیا ہوا تھا ـ؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جو کچھ تیرے سامنے ہوا تھا — میرے لئے وہی بہت کچھ تھا ـ میں نے تیری طاقت، تیری قوت کا لوہا مان لیا تھا — میں نے سوچا تھا کہ میں ایک عظیم طاقت کے مقابل آ گیا ـ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے ـ لیکن اس وقت

میری آنکھیں کھلیں جب میں نے تجھے آگ میں دیکھا۔ کیا اس کے بعد میری اداسی دور نہ ہو گئی ہوگی۔ میں نے خوش ہو کر سوچا کہ مجھے کسی انسان نے نہیں ایک دیوتا نے شکست دی ہے۔ سو میرا دل تیری عقیدت سے بھر گیا۔ اور میں نے سوچا کہ مقدس کاہلوس کا علم جھوٹا کیوں نکلا۔ کاہلوس نے ایک جھوٹا اعلان کیوں کیا۔ اور کاہلوس کے چہرے پر جو اضطراب تھا اس نے میرے دل میں تجسس پیدا کر دیا تب سب لوگوں کو واپسی کی ہدایت ملی اور میں بظاہر چل پڑا۔ لیکن میرے دل میں پیدا ہو جانے والے تجسس نے میرے قدم روک لئے۔ اور میں پوشیدہ راستوں سے واپس، اس جگہ پہنچ گیا، جہاں مقدس کاہلوس ابھی تک موجود تھا۔ لیکن اب صرف چند خاص ہیگوں کے علاوہ اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ گویا وہ لوگ جا چکے تھے جو اجنبی تھے۔ صرف وہ تھے جو دیوتاؤں کے دل جیسے جلتے تھے۔ اور یہی کاہلوس کی مشاورتی کونسل تھی۔

"ناقابل فہم بات ہے۔ ناقابلِ یقین بات ہے۔ کیسے تسلیم کی جائے۔ کیونکر تسلیم کی جائے۔" کاہلوس کہہ رہا تھا۔

"یقیناً کاہلوسِ اعظم۔ لیکن اس اجنبی کا وجود ہے اور ہمارے درمیان ہے۔ ہم اسے ٹال نہیں سکتے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ہم اس سے نجات حاصل کر سکیں۔"

"اگر اس نے سان باسے کے لوگوں کو مسخر کر لیا۔ تو سان باسے انقلاب سے دوچار بھی ہو سکتا ہے۔ ہیگوں کی حکومت ختم بھی ہو سکتی ہے۔" ایک ہیگے نے کہا۔

"ناممکن ہے۔" کاہلوس نے غرّا کر کہا۔ "میرا جادو بہرحال اسے ختم کر دے گا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ خود کیا ہے۔ کیا تم اسے آسمان سے اترا ہوا کوئی دیوتا تسلیم کرنے کو تیار ہو۔"

"اس سے قبل کوئی دیوتا آسمان سے نہیں اترا مقدس کاہلوس۔ ہم اُسے دیوتا کیسے مان لیں۔"

"تو پھر سن لو۔ ایک اجنبی شخص ایک بڑے خطرے کی حیثیت سے ہمارے درمیان آگیا ہے۔ جسے فنا کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن جسے ختم کرنا ضروری ہے۔"

"ہم اسے کیسے ختم کریں گے۔۔؟"

"کاہلوس کے پاس ابھی بہت سی ترکیبیں ہیں۔ مجھے تم سے صرف اسی قدر مشورہ درکار ہے کہ کیا اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔۔؟"

"یقیناً۔ اس کا وجود۔ ہمارے لئے سخت خطرہ ہے۔ اگر وہ انوکھی شکلیں لیئے ہوئے ہمارے لوگوں کے درمیان آگیا تو لوگ اسے ضرور دیوتا تسلیم کر لیں گے۔ اور پھر کسی دیوتا کے آگے ہماری کوئی حیثیت نہ ہوگی۔"

"تب پھر سنو۔ اس غیر معمولی انسان پر پہلے بعد دیگرے میں اپنے جادو آزماؤں گا۔ ممکن ہے ہم اس وقت سے قبل اس سے نجات حاصل کر لیں جب تک شیونا سے اس کا سامنا ہو۔ اور اگر اس میں کامیاب ہوئے تو پھر۔ وہ روز تو اس کا آخری روز ہوگا، جس دن وہ شیونا کا دیدار کریگا!"

"کس طرح مقدس کاہلوس۔۔؟" ایک ہیگے نے پوچھا۔

"یہ کاہلوس کے راز ہیں۔ جنہیں کاہلوس تک ہی رہنے دو۔" کاہلوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس نے ایک ہیگے کو مخاطب کیا۔

"ہوما۔"

"کاہلوسِ اعظم۔" ہیگے نے جواب دیا۔

"قتیلہ کو بلاؤ۔ ہماری اس منظورِ نظر کو بلاؤ۔ جسے ہم نے ہواؤں سے بھی پوشیدہ رکھا ہے۔ لیکن دشمن کے مقابلے میں ہم اپنے سارے حربے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور قتیلہ ایک شاندار حربہ ہے۔"

"جو حکم کاہلوسِ اعظم۔" ہوما نے جواب دیا۔ اور پھر وہ دیوار کے ایک سوراخ کی طرف بڑھ گیا۔ یوکا کا معبد ہیگوں کا پُراسرار محل ہے۔ اس کے اسرار سے کوئی شخص مکمل طور سے واقف نہیں ہے۔ سوائے ہیگوں کے۔ میں چونکہ ہمیشہ کاہلوس کے بڑے وفاداروں میں رہا ہوں، اس لئے وہاں کی چند باتوں سے واقف رہا ہوں۔ لیکن کسی قتیلہ کے وجود کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔!

"سو اب تم لوگ جاؤ۔ قتیلہ عام انسانوں کے سامنے نہیں آتی۔" کاہلوس نے باقی ہیگوں سے کہا۔ اور سب کے سب سر جھکا کر اٹھ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ مقدس کاہلوسِ اعظم کا جادو کہاں سو گیا۔ اُس نے ابھی تک میرے بارے میں نشاندہی کیوں نہیں کی۔ کیا کاہلوسِ اعظم کی جادوئی قوتیں فنا ہو چکی ہیں، یا سرے سے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔

سو میں یہی سوچ رہا تھا۔ کہ ہوما۔ جو کاہلوس کا معتقدِ خاص بلکہ بعض روایات میں خود اسی کی اولاد میں سے ہے۔ رنگین کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک قاتلہ کو لے آیا۔ میں سان باسے کا رہنے والا ہوں۔ میں نے یہیں زندگی گزاری ہے۔ میں اس بستی کے ایک ایک مرد، ایک ایک عورت کو جانتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ لڑکی کس کی اولاد ہے۔ اس کا من سحر انگیز ہے اس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپتی ہیں۔ اس کے انگ انگ سے جوانی اُبل رہی ہے۔ اور اس کی مسکراہٹ دلوں میں طوفان لاتی ہے۔

میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ایک انوکھی ادا سے کاہلوس کے سامنے جھکی تھی۔ تب کاہلوسِ اعظم نے ہوما سے بھی چلے جانے کے لئے کہا۔ لیکن اس کا جادو میری نشاندہی نہ کر سکا۔ میں ہنوز اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔! تو مقدس کاہلوسِ اعظم نے جسے ہم تارکِ الدنیا سمجھتے ہیں۔ جس کے بارے میں ہم سوچتے ہیں کہ وہ دنیاوی ضرورتیں ترک کر کے ہی علم و فن کی بلندیوں پر پہنچے ہیں۔ وہ پاک ہیں ہم گندوں کی بہ نسبت۔ لیکن بوالہوس ہیگے نے اس حسینہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اسے خوب پیار کیا۔

حسینہ بھی اس کی بوڑھی محبت کا جواب، اپنی جوان امنگوں سے دے رہی تھی۔ کافی دیر انہی لغویات میں گزری۔ پھر کاہلوسِ اعظم مطلب پر آ گیا۔ اس نے قتیلہ کو اپنی آغوش میں بٹھا کر کہا۔

"میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے تکلیف دی ہے قتیلہ۔!"

"قتیلہ کاہلوسِ اعظم کے اشارے پر سر کٹانے کو تیار ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں۔ اور تمہاری وفاشعاری کا دل سے معترف ہوں۔"

"تب مجھے بتاؤ۔ کیا بات ہے۔۔؟"

"پہاڑ کے ناقابلِ عبور راستے سے آنے والے اجنبی کے بارے میں تم نے کچھ سنا ہے۔۔؟"

"ہاں۔ اڑتی اڑتی خبریں کانوں میں پہنچی ہیں۔ وہ خود کو دیوتا کہتا ہے۔"

"ہاں۔ تمہارا خیال درست ہے۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو کیا وہ دیوتا ہے۔۔؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ صرف انسانوں کا وہم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وہم بستی والوں کے لئے ضروری ہے۔ انہیں خوفزدہ کرنے کے لئے دیوتاؤں کا سہارا لازمی ہے ورنہ ہم لوگوں کو بڑی مشکلات پیش آئیں۔"

"تو کیا کوئی دیوتا نہیں ہوتا۔۔؟" قتیلہ نے پوچھا۔

"ہوتا ہوگا تو اس کی دنیا ستاروں تک محدود ہوگی۔ زمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اس نے کبھی زمین پر قدم رکھا۔ نہ ہی اہلِ زمین نے اُسے دیکھا۔ یہ سب اختراع ہے۔"

"تو پھر وہ شخص خود کو دیوتا کیوں کہتا ہے۔۔؟"

"جھوٹ بولتا ہے، جس طرح ہم دیوتاؤں کے بارے میں بولتے رہے ہیں۔"

"اوہ۔! مگر وہ کیا چاہتا ہے۔؟"

"صحیح بات ابھی تک نہیں معلوم ہو سکی۔ لیکن بظاہر وہ ایک شخص ہافرک رہائی کے بارے میں کہتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے، وہ اس کے علاوہ بھی کچھ چاہتا ہوگا۔"

"ممکن ہے۔؟"

"یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی چالاکیوں سے کام لے کر ہیگوں کی حکومت ختم کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے عام لوگوں کے سامنے میری خوب توہین کی ہے۔ میرے جادو کو للکارا ہے اس لئے میں اس کے بارے میں بہت فکر مند ہوں۔"

"پھر مجھے بتا۔ میرے سپرد کیا خدمت ہے؟" قتیلہ نے پوچھا۔

"میں نے تجھے ہواؤں سے بھی پوشیدہ رکھا ہے قتیلہ۔ میں نے تجھے ہر میلی نگاہ سے بچا کر رکھا ہے۔ لیکن انسان کی ہر قیمتی شئے اسی وقت کے لئے ہوتی ہے، جب اُسے اس کی ضرورت ہو۔ مجھے بتا۔ اگر آسمان سے دیوتا بھی اتر آئیں، تو کیا وہ تیرے حسنِ جہاں سوز کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ دیوتاؤں کی قسم ہرگز نہیں۔ جھوٹا دیوتا بے حد طاقتور ہے۔ وہ نڈر اور انوکھی شخصیت کا مالک ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کی شکست ہے تو۔ صرف تو ہے۔"

"مجھے حکم دے کاہلوس۔ میں کیا کروں۔"

"کل تجھے اس کی خلوت میں جانا ہوگا۔ اسے مسخر کرنا ہوگا۔ تیرے حسن کے جال میں جکڑ کر وہ بے دست و پا ہو جائے گا۔ اور پھر تو اسے زمرد کا زہر دے گی۔ اس کا صرف ایک ریزہ ایک ہزار انسانوں کو موت کی نیند

سُلادے گا اور اس کی قوت بہرحال اس سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

"مقدس کاہوس۔ اپنے پسندیدہ انسان کے لئے میں یہ کام بخوبی انجام دوں گی۔"

"اور تیرے اختیارات ہمیشہ شیمونا سے زیادہ رہیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تیرے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکی مستقبل کی شیمونا ہوگی۔ یہ بھی میرا وعدہ ہے۔"

"اور مجھے تیرے وعدوں پر اعتبار ہے۔" قتیلہ نے جواب دیا۔

تو یہ گفتگو مقدس کاہوس اعظم اور قتیلہ کے درمیان ہوئی دیوتا۔ جسے میں نے سُنا۔ اور اس کے بعد میرے ذہن کی کیفیت بدل گئی۔ میں نے بہت سوچا۔ ہاں۔ یہ خیال ٹھیک ہے۔ حکومت شیمونا کی ہے۔ ملکہ وہ ہے۔ لیکن شیمونا ہیگوں کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوتی ہے اور پھر وہ ہیگوں ہی کے اشارے پر چلتی ہے۔ تو اصل حکومت تو ان ہیگوں کی ہوتی ہے اور جب کاہوس اعظم جھوٹا ہے تو اُس کے حواری بھی ایسے ہی ہوں گے!

میں خاموشی سے رُوحا کی گفتگو سُن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوگیا تو میں نے اس سے کہا۔

"سُن رُوحا۔ میں نے کبھی اپنی زبان سے خود کو دیوتا نہیں کہا۔ کیونکہ میں دیوتا نہیں ہوں۔ ہاں میری جسمانی قوتیں عام انسانوں سے بہت کر ہیں۔ تمہارے سرحدی محافظ سیکا نے مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اور نہ کرسکا۔ تو مجھے دیوتا کہنے لگا! یقیناً یہ بات صرف اس کی کہی ہوئی ہے۔ میں نے کبھی اس کی تصدیق نہیں کی۔ تو تم بھی میرے دوست رُوحا۔ تم بھی مجھے دیوتا مت کہو۔ میں دیوتا نہیں ہوں۔ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔ میں اس شخص باقو کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور اگر تم لوگ میرے دیوتا نیموں کی نشاندہی کرسکو تو میں اسے بھی قتل کرکے تمہیں اس سے نجات دلاسکتا ہوں۔"

وہ حیرت سے میری باتیں سُن رہا تھا۔ پھر اس نے شدید حیرت سے کہا۔ "تو۔ تو بھی انسان ہے۔؟"

"ہاں۔ تمہاری مانند۔"

"لیکن تیرے اندر یہ حیرت انگیز قوتیں کہاں سے آئیں۔؟"

"ان کے بارے میں جو کچھ بتاؤں گا تیری سمجھ میں نہیں آسکے گا رُوحا۔ اس لئے اس گفتگو کو ختم کردے۔ اور ہاں یہ بتا کہ کیا تو میری دوستی قبول کرے گا۔؟"

"میں تیری غلامی قبول کرچکا ہوں۔ کیونکہ تو نے مجھے شکست دی ہے۔"

"میں خود کو تیرا دوست ہی سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر تو چاہے تو میں ان ہیگوں کا بھرم توڑ دوں۔؟"

"سخت مشکل کام ہوگا۔ تو ان جھگڑوں میں نہ پڑ۔ میری خواہش ہے کہ اپنی زندگی بچا۔ اور خاموشی سے یہاں سے چلا جا۔ ایک نہ ایک دن ہیگوں کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔"

"تب پھر مجھے ایک بات بتا رُوحا۔؟"

"ضرور پوچھ۔"

"باقو کہاں قید ہے۔؟"

"وہ میری تحویل میں نہیں ہے ورنہ اسے ابھی لاکر تیرے سامنے پیش کردیتا۔ تاہم میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتا ہوں۔"

"اس کا پتہ چلا۔ اور اگر ہوسکے تو اسے قید سے نکال کر کسی جگہ پوشیدہ کردے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔ تو اطمینان رکھ۔"

"نیموں کے ٹھکانے کے بارے میں تجھے معلوم ہے۔؟"

"نہیں میرے دوست۔ بالکل نہیں۔ قہر کا دیوتا جنگلوں کا باسی ہے۔ اس کے صحیح ٹھکانے کے بارے میں تو کوئی بھی نہیں جانتا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم کرنا۔"

"مجھے اجازت دے۔ میں تیرا کام کرنے کے بعد تجھے اطلاع دوں گا۔" رُوحا نے کہا اور پھر میری اجازت سے باہر نکل گیا۔ تب مجھے سوچنے کا موقع ملا۔ اور میں نے قتیلہ کے بارے میں سوچا۔

قتیلہ۔ میری زبان نے چٹخارہ لیا۔ ابانیہ کی موت کو کئی دن گزر گئے تھے۔ اور اس کے بعد سے میں عورت سے دُور رہا تھا۔ زہر دینے کے لئے ہی آئے۔ کسی سازش کے تحت ہی آئے۔ عورت تو ہوگی۔ اور پھر رُوحا نے جس انداز میں اس کے حسن کی تعریف کی تھی اس کے تحت اندازہ ہوتا تھا کہ بہت خوب ہوگی! چنانچہ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔

اور دن گزر گیا۔ شام ہوئی اور چراغ کی شعلیں روشن ہوگئیں میں بہت بے چین تھا اور پھر میں نے اپنے مکان کے سامنے چند افراد کو دیکھا۔ وہ میری طرف ہی آرہے تھے اور ان کے درمیان کوئی تھا۔ موتیوں کے لباس میں ملبوس۔ رنگین کپڑوں میں لپٹا ہوا۔ تب ایک آدمی میرے سامنے آکر جھکا۔

"مقدس کاہوس نے دوستی کا پیغام بھیجا ہے۔ اس کی جانب سے یہ تحفہ قبول کرو۔" اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر میرے سامنے کردیا۔ اس کا چہرہ موتیوں کی جھالر میں پوشیدہ تھا۔ ایک جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔

"میری جانب سے کاہوس کا شکریہ ادا کردینا۔" میں نے کہا اور اندر مڑ گیا۔ لڑکی میرے پیچھے آرہی تھی۔ لیکن چہرہ ڈھکا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس لئے ایک دفعہ اس نے ٹھوکر کھائی اور میں نے اسے بازو پر سنبھال لیا۔

"کیا میں تیرا چہرہ کھول دوں۔؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ بڑی دلکش آواز تھی تب میں نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا اور اس کے پھول جیسے وزن کو سنبھالے

ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے اسے آرام دہ بستر پر ڈال دیا اور وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔!

"کاہوس اعظم کی دوستی کے ثبوت کو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"شعلوں کی روشنیاں تیز کردو۔ تاکہ میں تمہیں نظر آسکوں۔؟" اس نے کہا۔ وہ اپنے حسن سے واقف تھی اور پہلی بار بھرپور کرتی تھی بدقسمت لڑکی۔ غلط جگہ آگئی تھی۔ غلط خیالات لیکر آئی تھی۔ لیکن بہرطور مجھے منظور تھی۔

چنانچہ میں نے روشنیاں تیز کردیں۔ اور سارا کمرہ جگمگانے لگا۔! تب میں اس کے قریب پہنچا۔ اور میں نے موتیوں کی جھالریں اس کے چہرے سے علیحدہ کردیں۔ اور پروفیسر۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ دنیا کا لاجواب حسن تھا۔ بڑی بڑی حسینائیں میری نگاہوں سے گزر چکی تھیں لیکن وہ سینکڑوں پر بھاری تھی۔ انتہائی حسین اور جاذب نگاہ نقوش تھے۔ دل میں کھب جانے والے۔ اگر رُوحا مجھے حقیقت حال سے آگاہ نہ کردیتا تو اس لڑکی کو میری جانب سے شدید محبت ملتی اور شاید میں اسے طویل عرصے کے لئے پسند کرلیتا۔!

لیکن۔ دوسری طرف بھی کچھ ہوا تھا پروفیسر۔ اس نے مجھے دیکھا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں حیرت اور پھر پسندیدگی نظر آئی۔ اور پھر عجیب سے تاثرات اس کی آنکھوں میں اُبھر آئے۔!

وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔ پھر اس کی آواز اُبھری۔ "تو۔ کون ہے۔؟"

"کیا تجھے کاہوس نے میرے بارے میں نہیں بتایا۔؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بتایا تھا۔ لیکن۔ آہ۔ تو تو انوکھا ہے۔ کیسا نرالا ہے تو۔ تیرا جیسا تو کوئی نہیں ہے۔ تیرا بدن سونے کی مانند دمکتا ہے۔ اور تیرے بال۔ ان سے تو آگ کے شرارے نکل رہے ہیں۔ اور تیری آنکھیں۔ تیری آنکھیں جھیلوں کی ندی کی مانند نیلی ہیں جن میں آسمان کا عکس نظر آتا ہے۔ اور تیرا بدن۔ تیشہ کے تراشے کی طرح ہے۔ تو۔ تو تو انوکھا ہے۔"

"کیا میں تیری پسند ہوں۔؟"

"تو نے تو ایک نگاہ میں میری شخصیت ہی بدل دی۔ تو نے کیا کردیا اجنبی۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"میں نہیں جانتا۔"

"آہ۔ کیا تو سچ مچ آسمانوں سے اترا ہے۔ اگر۔ اگر ایسا ہے تو۔ تو۔"

"کیا اب تو کاہوس کے کہنے پر عمل نہ کرے گی۔؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا عمل۔؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"میں تجھ سے کچھ نہ پوچھوں گا۔ کچھ نہ کہوں گا تجھ سے۔ لیکن میں سب جانتا ہوں۔ کیا تو مجھے شراب نہ پلائے گی۔؟"

"آہ۔ آسمانوں کے باسی۔ تو سب کچھ جانتا ہے۔ کاہوس احمق ہے کہ اس نے تیرے بارے میں نہیں جانا۔ اس بے وقوف نے یہ بھی نہ سوچا کہ تو عورت کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے میرا انتخاب کرکے سخت غلطی کی! گو اس نے مجھے بُرے ارادے سے تیرے پاس بھیجا ہے قتیلہ۔ لیکن اس کے باوجود تجھے دیکھ کر میں اس کا شکرگزار رہوں۔"

"آہ۔ تو میرا نام بھی جانتا ہے۔ مگر۔ میں تجھے نہیں جانتی۔ افسوس، میں تیرے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"میں سنہرے دیس کا باسی ہوں۔ لیکن سُن۔ تو شراب کو زہر آلود کرکے مجھے دے دے۔ میرا اس سے کچھ نہ بگڑے گا۔ اس طرح تو کاہوس کے عتاب کا شکار بھی نہ ہوگی۔"

"تیرے نزدیک آنے کے بعد۔ زندگی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے تیرا قرب حاصل کرنے کے بعد زندہ رہنے کی آرزو فنا ہوجاتی ہے۔ میں وہ زہر خود کھاؤں گی میرے محبوب۔ میں تیرے اوپر اپنے بدن کا رواں رواں قربان کردوں گی۔"

یوں پروفیسر۔ کاہوس اعظم بدترین شکست سے دوچار ہوا۔ اور اس کی پسندیدہ عورت میری دیوانی بن گئی۔ اور کیا خوب عورت تھی۔ واہ واہ جنگل کا حسن۔ پتھروں کی مانند۔ اور وہ رات۔ طویل عرصے کے بعد

ایک عجیب ذات میری زندگی میں آئی۔ ورنہ اس رات کے خاتمے پر تو قتیلہ سچ مچ خودکشی پر آمادہ ہو گئی۔!

"اس کے بعد زندہ رہنے کی آرزو نہیں ہے اجنبی۔ میں جانتی ہوں کاہوس تیرا دشمن ہے۔ اور اب وہ میرا بھی دشمن ہوگا اور کاہوس جیسا شاطر جس کا دشمن ہو، اس کی زندگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ مجھے تجھ سے ضرور جدا کر دے گا۔ اور تیری جدائی موت سے بدتر ہے۔ اس کے لئے مجھے زہر ہلاہل کھا کر مر جانے دے اجنبی۔ اب زندگی میری نگاہوں میں ہیچ ہے۔"

"تو میرے پاس رہ قتیلہ۔ اپنی زندگی کی حفاظت مجھے سونپ دے، بس تو یہاں سے نہ جا۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔"

"میں تیرا حکم نہیں ٹالوں گی اجنبی۔ ٹھیک ہے۔ جس شکل میں بھی آئے موت ہی آئے گی۔ تیری قربت کے جو لمحات بھی میسر ہو جائیں غنیمت ہیں۔" اس نے محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ یوں میری تنہائی دور ہو گئی۔ اور اب میں سکون سے پورے چاند کی رات کا انتظار کر سکتا تھا۔ رہ گیا کاہوس۔ تو میں اس سے نمٹنے کے لئے بھی تیار تھا۔

سو وہی ہوا۔ دن کے ایک حصے میں کاہوس کے ہرکارے، ایک ہیگے کے ساتھ اس مکان میں آئے اور انھوں نے قتیلہ کو آواز دی۔ یہ وہی ہیگا تھا جو قتیلہ سے واقف تھا۔

لیکن اس کے جواب میں، میں باہر نکل آیا۔ اور ہیگے نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ اشایا سے اطلاع دی گئی تھی کہ یہاں سے میری لاش دستیاب ہوگی۔ "کیا تمہیں مقدس کاہوس اعظم نے بھیجا ہے۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔!" ہوما نے جواب دیا۔

"کیا میرے لئے اس کا کوئی پیغام ہے۔؟"

"نہیں۔ اس نے اس عورت کو طلب کیا ہے۔ جو تمہارے پاس موجود ہے۔"

"آؤ۔ اندر آؤ۔ میں اسے تمہارے حوالے کر دوں۔" میں نے کہا۔ اور اسے لئے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ قتیلہ خوف سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نے ہوما کو احترام سے بٹھایا۔ اور پھر اس سے بولا "بے شک۔ مقدس کاہوس نے مجھے اپنی دوستی سے نوازا ہے۔ اس نے اس حسین لڑکی کو میرے پاس بھیج کر میری ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں۔ سو میں تمہاری بھی عزت کرتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں۔ آؤ۔ میرے ساتھ شراب کا ایک جام پیو۔ اس کے بعد لڑکی کو لے جاؤ۔!"

ہوما مسکرانے لگا۔ تب میں دوسرے کمرے میں گیا جہاں قتیلہ موجود تھی۔ "لاؤ۔ وہ زہر مجھے دے دو۔ جو تمہیں کاہوس سے طلب ہے۔؟" میں نے اس سے کہا۔

"کون آیا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے۔؟" قتیلہ نے خوفزدہ انداز میں پوچھا

"کاہوس اعظم کا خاص دوست۔ ہوما۔!"

"اوہ۔ کیا کہہ رہا ہے۔؟"

"تمہیں لے جانے آیا ہے۔"

"پھر۔؟ اب کیا ہوگا۔؟"

"کچھ نہیں قتیلہ۔ یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔"

"مگر تم زہر کیوں طلب کر رہے ہو۔؟"

"سوالات نہ کرو۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتا دوں گا۔" میں نے کسی قدر جھنجلاتے ہوئے انداز میں کہا۔ اور قتیلہ نے تیتر کی وہ انگوٹھی میرے حوالے کر دی تھی جس میں زہر موجود تھا۔

"تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ کسی قسم کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ اور پھر واپس ہیگے کے پاس آ گیا۔

"وہ روانگی کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ جب تک ہم کاہوس کی دوستی کا جام پئیں۔" میں نے شراب کے برتن سے شراب الٹی اور ہوما کے جام میں چالاکی سے زہر ملا دیا۔ تب میں نے اس کا جام اس کے حوالے کر دیا۔

ہوما نے مسکراتے ہوئے جام ہونٹوں سے لگا لیا۔ لیکن زہر نے تو قیامت ڈھا دی۔ شاید اس نے دو ہی گھونٹ لئے ہوں گے کہ اسے زور کی کھانسی اٹھی اور خون کے لوتھڑے اس کے منہ سے اُبل پڑے۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ اس کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن زمین پر گر کر اپنے ہی خون میں لوٹنے لگا۔ اور چند ساعت کے اس تماشے کے بعد اس نے دم توڑ دیا۔

میں پُرسکون نگاہوں سے اس کی موت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ تب میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو آواز دی۔ اور ان میں سے دو آدمی اندر آ گئے۔ انھوں نے اندر کا منظر دیکھا۔ اور خوف سے اچھل پڑے۔

"اسے اٹھا کر کاہوس کے پاس لے جاؤ۔ میری طرف سے کہنا کہ میں نے دوستی کا تحفہ قبول کر لیا۔ اور تحفے واپس نہیں ہوتے۔ ہاں جوابی تحفہ ارسال ہے۔ اسے قبول کر کے مجھے عزت بخشے۔"

آنے والے پاگلوں کی مانند ہیگے کی لاش دیکھ رہے تھے۔ کسی ہیگے کی موت ان کے لئے بہت بڑی بات ہوتی تھی۔ پوری بستی سوگ مناتی تھی۔ وہ عجیب عجیب رسومات ہوتی تھیں۔ لیکن اس وقت کاہوس کا معتمد خاص بولناک طریقے سے اور بُری حالت میں مر گیا تھا۔ وہ لوگ اس کی لاش اٹھاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

"اگر تم نے اس کی لاش نہ اٹھائی۔ تو چند ساعت کے بعد میں باہر کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کو بلاؤں گا اور اس وقت انھیں اس ہیگے کے ساتھ تم دونوں کی لاشیں بھی اٹھانی پڑیں گی۔"

اور پروفیسر۔ یہ دونوں بھی میرے بارے میں یا تو سن چکے تھے یا دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خوفزدہ انداز میں ہوما کی لاش اٹھائی اور باہر نکل گئے۔ تب میں مسکراتا ہوا واپس قتیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ قتیلہ اب بھی

خوفزدہ بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا۔ کیا وہ لوگ واپس چلے گئے۔؟"

"ہاں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے بارے میں تم نے کیا کہا۔؟"

"یہی کہ دوستی کے تحفے واپس نہیں ہوتے۔ ہاں ایک جوابی تحفہ میں نے اسے بھیج دیا۔"

"اوہ۔ وہ کیا۔؟"

"ہوما کی لاش۔"

"کیا۔؟" وہ اچھل پڑی۔

"ہاں۔ تمہارا لایا ہوا زہر شراب میں حل کر کے میں نے ہوما کو دے دیا۔ اور اس کے ساتھ آنے والے اس کی لاش اٹھا کر لے گئے۔"

"بہت بُرا ہوا یہ۔ بہت بُرا ہوا۔ کسی ہیگے کی موت بہت بڑا طوفان لا سکتی ہے۔"

"میں نے ساری زندگی طوفانوں سے جنگ کی ہے۔ تم خوف کا اظہار کر کے مجھے غصہ نہ دلاؤ۔!" اور قتیلہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ تب میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ "خوفزدہ لڑکی۔ جب تک تو میری آغوش میں ہے۔ محفوظ ہے۔ کسی قسم کا تردد نہ کر۔ مجھے اپنے بارے میں بتا۔ کاہوس کے بارے میں بتا۔ شیمونا کے بارے میں بتا۔"

اور قتیلہ نے ایک گہری سانس لی۔ "تیری آغوش میں آنے والی موت بھی دلکش ہوگی۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ بس میں چاہتی ہوں کہ تو کاہوس کی خوفناک چالوں سے محفوظ رہے۔"

"مجھے کاہوس کے بارے میں بتا۔"

"کاہوس بے حد چالاک انسان ہے۔ وہ جڑی بوٹیوں سے خوب واقف ہے۔ اس نے ایسی بوٹیاں تلاش کی ہیں جو حیرت انگیز خاصیتیں رکھتی ہیں۔ یہی اس کا جادو ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک بڑی کمزوری ہے۔ عورت کے جسم سے ہم آغوش ہو کر وہ اپنی شخصیت بھول جاتا ہے اور کوئی بھی عورت، جو اسے پسند آ جائے۔ اس کا بھید معلوم کر سکتی ہے۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ لیکن اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔"

"اوہ۔ مثلاً کیا کیا۔؟"

"اپنے بہت سے جادو اس نے میرے سامنے کھول دیئے۔ معبد پہاڑوں میں وہ رہتا ہے وہ چھ درجہ ہیں۔ اس بڑی جگہ کے نیچے جہاں وہ دربار کرتا ہے، ایک اور غار ہے جو نیچے سے بہت کشادہ اور پیچیدہ ہے۔ اس کے بے شمار راستے ہیں جو نہ جانے کہاں کہاں نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھنے والے تھوڑی دیر قبل اسے دربار میں دیکھتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے غائب ہو جاتا ہے۔"

"خوب۔!" میں نے ان مفید معلومات سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اس نے جڑی بوٹیوں سے وہ کچھ زہر حاصل کئے ہیں جو ہواؤں میں شامل ہو کر انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے جڑی بوٹیوں سے ہی طویل عمری کا راز دریافت کیا ہے۔ چنانچہ وہ جس کو چاہتا ہے قیمتی زندگی بخش دیتا ہے اور جسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ وہ صرف ہواؤں میں سانس لے کر ہلاک ہو جاتا ہے۔!"

"بہت خوب۔ وہ آگ میں نظر آتا ہے۔ اس کا کیا راز ہے۔؟"

"پتھر کے ایک جار میں ایک بدبودار سیال ہے، جو کسی خاص جڑی کا دودھ ہے۔ اس کے چند قطرے پانی میں ڈال کر اس سے غسل کرنے کے بعد اگر وہ آگ کے سمندر میں کود جائے، تب بھی آگ اس پر بے اثر ہوگی۔"

"اوہ۔!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ ہے کاہوس کا طلسم۔"

"ہاں۔!" اس نے بے شمار جال پھیلا رکھے ہیں، اور خود کو بے حد مضبوط بنا لیا ہے۔"

"اب تم شیمونا کے بارے میں بتاؤ۔"

"شیمونا صرف ایک فریب ہے۔ اس کا انتخاب ہیگوں کا کام ہوتا ہے۔ کسی بھی خوبصورت لڑکی کو شیمونا منتخب کر لیا جاتا ہے۔ ہیگے اسے یوکا کے معبد میں پرورش کرتے ہیں۔ وہ ان کے درمیان رہتی ہے۔ اور جوان ہو کر دوسری شیمونا کی جگہ لے لیتی ہے۔ موجودہ شیمونا ایک حسین اور نوجوان لڑکی ہے۔ جسے کاہوس کہیں اور سے لایا تھا۔ شیمونا کے منہ میں ہیگوں کی زبان ہوتی ہے۔ وہ وہی کچھ کہتی ہے جو کاہوس کا ایما ہوتا ہے چنانچہ موجودہ شیمونا بھی کاہوس کی غلام ہے۔"

"اب صرف تمہاری بات رہ گئی۔؟"

"میں بہت چھوٹی تھی۔ میری عمر صرف گیارہ سال تھی، جب کاہوس کے آدمی مجھے سوا بستی سے اٹھا لائے تھے۔ میرے والدین تھے۔ بہن بھائی تھے۔ لیکن اب تو سب مجھے بھول گئے ہوں گے۔ چودہ سال کی ہوئی تو کاہوس نے مجھے دوشیزہ سے عورت بنا دیا۔ اور میں اسے اس قدر پسند آئی کہ اس نے مجھے صرف اپنے لئے پوشیدہ کر دیا۔ ورنہ عموماً لڑکیاں لائی جاتی ہیں۔ ایک سال وہ کاہوس کا دل بہلاتی ہیں، اور اس کے بعد دوسرے ہیگوں کے استعمال میں رہتی ہیں۔ عموماً لڑکیاں مر جاتی ہیں۔ جو نہیں مرتیں انھیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔"

"تم نے کبھی فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔؟"

"نہیں۔ میں گیارہ سال کی یہاں آئی تھی۔ اور آدھی ہی زندگی یہاں گزار چکی ہوں۔ میرے ذہن کے کسی خانے میں فرار کا خیال نہیں تھا۔ اگر تم میرے سامنے نہ آتے۔ اور کاہوس مجھے تمہارے سامنے بھیجنے کی بھول نہ کرتا تو شاید میں آخری دم تک اس کی وفادار رہتی۔"

"لڑکی۔! تم مجھے پسند آ گئی ہو۔ سنو۔ کاہوس جیسے ہزاروں افراد بھی تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

"مگر تم میری زندگی چاہتے ہو۔ تو کسی طرح مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔"

"ضرور۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن صرف دو کام چاہتا ہوں۔ اوّل تو اپنے دوست ہانو کو رہا کراؤں گا۔ دوئم۔ ایک بار شیمونا کی زیارت ضرور کروں گا۔"

"یہاں گزر بسر ہر لحظہ میرے لئے خطرناک ہے۔ کاہوس آسانی سے مجھے قتل کر سکتا ہے۔ لیکن میں تمہارے کسی ارادے میں رخنہ انداز نہ ہوں گی۔ ٹھیک ہے جو تم نے سوچا ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں دیکھوں گا کاہوس اب میرے خلاف کیا کرتا ہے۔"

لیکن پروفیسر۔ رات ہو گئی۔ اور کاہوس نے میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا کوئی کمزور قدم اُسے تباہی کی طرف لے جائے گا۔ وہ میری حقیقت کے بارے میں الجھن میں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیا ہوں۔ اور اپنے جادو سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا، اس نے سوچا کہ اس کا جادو اس شخص کے سامنے نہیں چلے گا، جس نے حقیقت میں آگ جذب کر لی تھی اور جس نے زہر کا نسخہ خود اس کے آدمی پر آزما ڈالا تھا۔

اگر فوری طور پر نتیجے میں ڈوب کر وہ میرے خلاف کوئی قدم اٹھا بیٹھتا تو نہ جانے اس کا جواب کیا ہوتا۔ چنانچہ وہ مصلحت کوش شخص خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی محبوبہ سے بھی ہاتھ دھو لئے تھے۔ ہاں میں یہ جانتا تھا کہ وہ کوئی اور سازش ضرور کرے گا۔ ایسی خاموش سازش، جو پہلے سے زیادہ سخت، اور پہلے سے زیادہ مؤثر ہو۔ وہ کھل کر سامنے آنے والوں میں سے نہیں تھا۔ ضرور کرے۔ میں تو اس کا شکر گزار تھا کہ اس نے میری تنہائیاں دور کر دی تھیں۔ وہ بھی قتیلہ جیسی زندگی سے بھرپور عورت سے۔ قتیلہ بھی مجھے پسند کرنے والی سابقہ لڑکیوں کی مانند۔ زیادہ سے زیادہ میری قربت کی طلبگار تھی۔ وہ ہر وقت میری آغوش چاہتی تھی۔ اور جب میری آغوش میں ہوتی تو کوشش کرتی کہ میرے جسم میں جذب ہو کر اسی کا جزو بن جائے۔

بہرحال میں نے بھی اُسے اپنی محبت سے محروم نہیں رکھا۔ اور اس کی ساری خواہشیں پوری کر دیں۔ ہیگے کی خاموش موت۔ اور کاہوس کی پُراسرار خاموشی سے وہ بھی حیران تھی اور کہتی تھی۔

"یقین کرو شہزادے اجنبی۔ اس سے قبل کسی ہیگے کی موت اتنی خاموشی سے قبول نہیں کر لی گئی۔ اس سے قبل کاہوس نے اپنے کسی دشمن کو اتنی زندگی نہیں دی۔ نہ جانے کیوں وہ خاموش ہے۔"

اور یہ بات میں جانتا تھا کہ کاہوس کیوں خاموش ہے۔ اپنی پہلی ناکامی۔ اور قتیلہ پر میرے قبضے کے بعد اُس نے سوچا ہوگا کہ ممکن ہے قتیلہ نے مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہو۔ اور میں اس کے حربوں سے واقف ہو کر ان سے بچاؤ کا مؤثر بندوبست کر چکا ہوں۔ بہرحال وہ سمجھ گیا تھا کہ حریف کمزور نہیں ہے۔!

اور میرے اس مکان تک قتیلہ کو پورے چار دن گزر گئے۔ قتیلہ میرے ساتھ تھی، کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں مل رہی تھیں۔ اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں بھی عیش کر رہا تھا۔ ہاں اس دوران رُوما کے نہ آنے پر کچھ حیرت تھی۔!

کیا بدنصیب رُوما کا راز کھل گیا۔؟ کیا کاہوس کو معلوم ہو گیا کہ مجھے حالات سے آگاہ کرنے والا رُوما ہے۔ اور اس نے سب سے پہلے رُوما کو سزا دی کیونکہ لیکن اسی رات میرے اس خیال کی تردید ہو گئی۔ رُوما مجھ سے ملنے آیا تھا۔ قتیلہ کو دیکھ کر اس نے ہچکچاتے ہوئے میری جانب دیکھا۔

"بے دھڑک ہو کر بات کرو۔ اب یہ میری دوست اور کاہوس کی دشمن ہے۔"

"اوہ۔ تو عظیم ہے دیوتا۔ تیرا سحر کاہوس کے سحر سے برتر ہے۔ میں نے ہانو کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔"

"کہاں ہے وہ۔؟"

"سارا کے قید خانے میں تھا۔ ملکہ کے حکم کے مطابق اسے صدر سراہی میں نیمون کی خدمت میں روانہ کیا جانے والا تھا۔"

"اوہ۔ پھر۔؟"

"میں نے اسے وہاں سے رہا کرا لیا ہے۔"

"رہا کرا لیا ہے۔؟" میں خوشی سے اچھل پڑا۔

"ہاں۔ تیری خدمت میں حاضر ہونے میں اسی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔"

"اب وہ کہاں ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"انتہائی محفوظ مقام پر۔ میں نے اُسے خاموشی سے فرار کرایا۔ بظاہر لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے وہ قید خانہ توڑ کر فرار ہوا ہے۔ وہ مختلف سمتوں میں اسے تلاش کریں گے۔ لیکن آزاد جگہوں پر انہیں اس کا نشان بھی نہیں ملے گا۔ تو غور کر دیوتا۔ کہ کیا وہ اسے کسی دوسرے قید خانے میں تلاش کریں گے۔؟ میں نے اسے وہاں سے آزاد کر کے اس قید خانے میں ڈال دیا ہے جو میری تحویل میں ہے۔ وہاں اسے ہر سہولت مہیا کر دی گئی ہے۔ تو جب چاہے گا اسے تیری خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔!"

"خوب۔ خوب۔!" میں رُوما کی فراست سے بہت خوش ہوا۔ درحقیقت اس نے نہایت ذہانت سے فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اُسے مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔

"مقدس کاہوس نے میرے خلاف اور کیا قدم اٹھایا ہے۔؟"

"وہ خاموش ہے۔!"

"صرف ایک سورج درمیان باقی ہے اس کے بعد والے دن کی رات کو شیمونا کا دربار عام ہوگا کیونکہ وہ پورے چاند کی رات ہو گی اور مجھے یقین ہے دیوتا کہ اس رات کاہوس تیرے اوپر آخری وار کرے گا۔ میں تجھے آگاہ کرتا ہوں۔"

"تو نے مجھے خوشی کی خبر سنائی ہے رُوما۔ میں تیری عزت کرتا ہوں۔ فکر نہ کر۔ میں اس آخری وار کے لئے تیار ہوں۔ وہ ساری زندگی میرے اوپر وار کرتا رہے، اسے اپنی بے بسی پر شرمندگی کے علاوہ اور کچھ نہ مل سکے گا۔"

"میرے لئے جو حکم ہوتا ہے۔؟"

"تو اپنا فرض انجام دے چکا ہے۔ اس کے بعد اگر مجھے تیری ضرورت پڑی تو میں تجھے تکلیف دوں گا۔ ہاں جب میں یہاں سے جاؤں گا تو اگر تو پسند کرے تو میرے ساتھ چل سکتا ہے۔"

"اگر تیرا قرب مجھے حاصل ہے تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔"

"بس۔ تو میرے ساتھ چلے گا۔ اب تو جا سکتا ہے۔"

اور رُوما چلا گیا۔ قتیلہ میری اور اس کی گفتگو غور سے سن رہی تھی۔ رُوما کے جانے کے بعد اس نے کہا" رُوما کی خوفناک قوت سے سبھی واقف ہیں۔ اس کی حیثیت بہت بڑی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ۔ جو کاہوس سے اندھی عقیدت رکھتا تھا۔ تمہارا غلام کس طرح بن گیا۔"

"میں اسے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہی سہی۔"

"تب اس کی مثال تم ہو قتیلہ۔"

"میری بات اور ہے۔" قتیلہ نے مسکراتے ہوئے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"اس کی بات بھی اور ہے۔" میں نے اُسے سینے سے بھینچ لیا اور وہ میرے سینے کے بوسے لینے لگی۔

اور پھر پورے چاند کی رات آ گئی۔ اس رات کی صبح سے بستی کے لوگوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس روز میرے مکان کے گرد بے شمار مسلح افراد جمع ہو گئے تھے۔ نہ جانے کیوں۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ میں فرار نہ ہو جاؤں۔ لیکن میں ایسی کوشش کیوں کرتا۔ میں تو خود انتظار کر رہا تھا کہ شیمونا کے درشن کروں۔ ہاں اگر میں فرار ہونا چاہتا تو یہ لوگ مجھے کیا روک سکتے تھے۔!

سورج چھپے۔ انسانوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا۔ اور ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مقدس کاہوس اعظم نے کہا ہے۔ کیا تم شیمونا کی زیارت کرو گے؟"

"مگر میں اس سے انکار کر دوں تو۔؟"

"ہم نے تمہارا انکار پہنچا دیں گے۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔ میں تمہاری ملکہ کی زیارت ضرور کروں گا۔!"

"تب کاہوس اعظم نے کہا ہے کہ تمہیں بڑوں کی جگہ دی جائے۔ کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے۔؟"

"بڑوں کی جگہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"شیمونا کے دربار میں لوگوں کو حفظ مراتب مقامات دیئے جاتے ہیں۔ یوکا کی سب سے بلندی پر شیمونا کا تخت ہے۔ اس کے نزدیک اُس سے کچھ نیچے مقدس کاہوس کی نشستگاہ ہے۔ اس کے بعد مقدس ہیگوں کا مسکن ہے۔ پھر وہ سردار، بہادر آتے ہیں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور پھر عمومی لوگ دلیرانہ کارنامے انجام دینے والے۔ سامنے عوام کا ہجوم ہوتا ہے۔"

"میری جگہ کونسی ہے۔؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا انتخاب مقدس کاہوس کرے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔؟"

"تمہیں اس حصے میں پہنچا دیں جہاں سے یوکا کی کنواریاں تمہیں تمہارے مقام پر لے جائیں گی۔"

"میری محبوبہ بھی میرے ساتھ ہو گی۔"

"یہ ممکن نہ ہوگا! ہر شخص کے مرتبے میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں کاہوس اعظم بہتر جانتا ہے۔"

"میں اسی شرط پر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں کہ قتیلہ میرے ساتھ ہو گی۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہم اعتراض نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اعتراض کا حق صرف مقدس کاہوس اعظم کو ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسے تیار کر کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور قتیلہ کی طرف چل پڑا۔ لیکن وہ اوٹ سے میری گفتگو سن رہی تھی۔ میری باتوں سے سرشار ہو کر اس نے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"اگر تم مجھے ساتھ نہ لے جاتے تو میں خوف سے مر جاتی۔" اس نے کہا۔

"میں تمہیں خود سے جدا نہ کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اس وقت تک جب تک تم زندہ ہو۔" اور قتیلہ نے میرا منہ چوم لیا۔ بہرحال وہ تیار ہو گئی اور پھر ہم اس گروہ کے ساتھ چل پڑے۔ بستی پیچھے رہ گئی۔ اور ہم یوکا کی بلند پہاڑیوں کی طرف چل پڑے۔!

"کیا تم ان علاقوں کے بارے میں جانتی ہو۔؟"

"کافی حد تک۔!"

"اگر ہمیں کسی مشکوک جگہ لے جایا جائے تو تم مجھے بتلا دینا۔"

"ہم ٹھیک چل رہے ہیں۔"

"امراء اور بہادروں وغیرہ کے بارے میں جو کچھ اس نے بتایا تھا ٹھیک تھا۔؟"

"ہاں۔ شیمونا کے درشن کے وقت ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے۔ کیا شیمونا وہاں مجرموں کے بارے میں فیصلے بھی

سُناتی ہے۔؟"

"ہاں۔ وہ مسائل جو بیگوں سے حل نہ ہوتے ہوں۔ اور عوام کے ذہن میں اُلجھے ہوئے ہوں۔ انھیں شیموناکے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں شیموناکا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا ہے۔"

"تب یہ مسئلہ بھی شیموناکے سامنے پیش ہوگا۔!"

"یقیناً۔! اور وہ فیصلہ صادر کرے گی۔ اس کے فیصلے کے بعد کسی کو زبان ہلانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ جس بارے میں وہ فیصلہ کرتی ہے۔ وہ مسئلہ ختم سمجھا جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے قتیلہ۔ میں تمہارے قبیلے کی رسم بدل ڈالوں گا۔ میں کسی کے کسی فیصلے کو بھی قبول نہیں کروں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک پہاڑی غار میں داخل ہوگئے اور قتیلہ نے جھک کر میرے کان میں کہا۔ "لوکا کے معبد کے اندرونی حصے کا سفر شروع ہوچکا ہے۔ یہاں سے روشنیاں ختم ہوجاتی ہیں۔"

"کیا مطلب۔؟"

"تاکہ کوئی معبد کی بھول بھلیوں سے واقف نہ ہوسکے۔ ہاں تمہیں قدم قدم پر ستارے والے ملیں گے۔"

"ستارے والے۔؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔!" قتیلہ نے تاریکی میں ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک چمکدار ستارہ لمحہ در لمحے میں کرنیں بکھیرتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اور پھر ایک آواز ابھری۔

"آؤ۔ مجھے تمہارا مقام معلوم ہے۔"

میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ تب میں صورتِ حال سمجھ گیا۔ چمکنے والی چیز سیاہ ہیرا تھا جو کسی لکڑی میں نصب اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ انہی کرنوں کی مدھم روشنی میں ہم سیڑھیاں طے کرنے لگے جو ایک تنگ سُرنگ میں بنی ہوئی تھیں۔ سُرنگ کی چھت ہمارے سروں سے لگ رہی تھی، لیکن وہاں گھٹن نہیں تھی۔ نہ جانے وہ سوراخ کہاں تھے جن سے ہوا آرہی تھی۔

سیڑھیاں بلندی کی طرف بڑھتی رہیں۔ پھر ایک مقام آیا جہاں ہم نے چند ساعت قیام کیا۔ وہاں ایک دوسرا ستارے والا ملا، جو ہمارا آگے کا راہنما تھا۔ اور ہم نے اس کی معیت میں دوسرا سفر شروع کردیا۔ سرنگوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور یقیناً وہ اس قدر ٹیڑھی میڑھی تھیں کہ اُن کے بارے میں اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔

اور پروفیسر سرنگوں کا یہ سفر اس قدر طویل تھا کہ میں حیران ہونے لگا۔ نہ جانے یہ لوگ ہمیں کہاں سے کہاں لے جارہے تھے۔ قتیلہ کے انداز سے تھکن نمایاں تھی۔ لیکن بہرحال وہ میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اور پھر شاید ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔!

یہ ایک چھوٹا سا غار تھا۔ جہاں دیواروں میں چند ہیرے نصب تھے۔ ان کی دھندلی روشنی غار کو منور کررہی تھی۔ یہاں آخری ستارے والے نے ہمیں چھوڑ دیا۔!

"سامنے دروازہ موجود ہے۔ اور اس کے سامنے تمہاری نشست ہے۔ چاند کی پہلی کرن آواز دے تو اپنی جگہ پہنچ جانا۔" اُس نے کہا اور خود دروازے سے باہر نکل گیا۔!

میں نے گہری سانس لیکر قتیلہ کی طرف دیکھا۔ قتیلہ کے چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔ اُس کے ہونٹ خشک تھے اور اس کے گہرے گہرے سانسوں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

"اس سے قبل کبھی یہاں تک آئی ہو۔؟"

"نہیں۔!" اس نے گردن ہلادی۔

"پہلے کبھی شیموناکا دیدار نہیں کیا۔؟"

"عام لوگوں کے ساتھ۔"

"اوہ۔ آؤ۔ دیکھیں۔ اس دروازے کے دوسری طرف کیا ہے؟!"

میں نے کہا اور اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا۔ دیوار میں چٹانی دروازہ موجود تھا۔ میں نے چٹانی دروازے کو دھکیلا۔ اور وہ کھل گیا۔ دروازے کے سامنے مجھے ایک چوڑا چبوترہ سا نظر آیا۔ میں نے اس پر قدم رکھا اور پھر اطمینان سے اس پر اُتر گیا۔ درحقیقت کمزور دل لوگوں کے لئے بڑا ہیبت ناک منظر تھا۔ یہ چبوترہ دراصل ایک پھیلی ہوئی چٹان تھی جو پہاڑ کی دیوار سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اور اس چٹان کے کناروں کے بعد کچھ نہیں تھا۔ بس تاریک گہرائیاں، جو نہ جانے کونسے جہنم کی سیر کراتی تھیں۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کھوکھلے پہاڑ میں جگہ جگہ یہ چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں۔ اور ایک بلند ترین جگہ ایک بہت بڑی اور سب سے اونچی چٹان تھی۔ غالباً یہیں سے شیموناکے درشن ہوتے تھے۔ چٹانیں حسبِ مراتب لوگوں کے بیٹھنے کے لئے تھیں۔ اور سامنے۔ پہاڑ کے عین سامنے۔ تاریکی میں عجیب سی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اور ایک طویل سانس لیکر رہ گیا۔

یہ سان بارے کے عوام تھے۔ جو سامنے کے میدان میں شیموناکے درشن کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ تاحدِ نگاہ انسان ہی انسان نظر آرہے تھے۔ میں نے چٹان کا اچھی طرح جائزہ لیا اور دروازے سے واپس پہنچ گیا۔

چاند آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ قتیلہ میرے شانے سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔ "سنہرے اجنبی۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا محسوس کررہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ میں پُرسکون ہوں۔ ہاں ملکہ شیموناکو میں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ تو کچھ نہیں محسوس کررہا۔؟"

"بالکل نہیں۔"

"لیکن میری عجیب کیفیت ہے۔ میرے کانوں میں انوکھی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ آوازیں جانی پہچانی ہیں۔ ہواؤں کے شور کی مانند۔ لیکن کوئی مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ نہ جانے کس کی آوازیں ہیں۔ شاید میرے اپنوں کی۔ جنھیں میں چھوڑ چکی ہوں۔ سنہرے اجنبی۔"

"تم اس جگہ سے بہت متاثر ہو۔ شاید تمہارے دل میں ابھی تک کاہلوں کا خوف ہے۔"

"خوف۔ یقین کرو سنہرے اجنبی۔ تم اسے خوف کہو۔ ایک عجیب سی کیفیت ہے۔ میں اسے بے پناہ خوشی بھی سمجھ سکتی ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے مضبوط سینے سے نہ چمٹاؤ گے۔"

"پاگل مت بنو قتیلہ۔ اطمینان سے کاہلوں کا ڈرامہ دیکھو۔!"

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا اور قتیلہ مجھ سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ چاند آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ پھر چاند کی ایک کرن کسی راستے سے اندر رینگ آئی اور میں چونک کر اس سوراخ کو دیکھنے لگا جس سے روشنی اندر آئی تھی۔ عمدہ انتظام کیا گیا تھا۔

بہرحال۔ میں نے قتیلہ کا ہاتھ پکڑا۔ دروازہ کھول کر چٹان پر اُتر آیا۔ قتیلہ میرے ساتھ تھی۔ ہم نے دیکھا۔ چاند دُور کی پہاڑیوں سے اُبھر رہا تھا۔ اور ہر چٹانی سائبان روشنی میں نہاتا جارہا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ جگہ جگہ سونے کی چٹانیں اُبھری ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ نہ جانے ان چٹانوں کو انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا یا یہ قدرتی تھیں۔

جو کچھ بھی تھیں۔ بہرحال حیرت انگیز تھیں اور میں پوری دلچسپی سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ تمام چٹانیں آباد ہوتی جارہی تھیں۔ اور پھر چاند غار کی چھت پر آگیا۔

تب اچانک رنگین کرنیں مختلف سمتوں سے پھوٹیں اور انھوں نے اس بلوری چٹان کو اپنی زد میں لے لیا۔ جو درشن کا تخت تھی۔! اور بلاشبہ پروفیسر تو کا یہ منظر دنیا کا سب سے دلکش اور سب سے حیرت انگیز منظر تھا۔ شاید چٹانوں میں بڑے اور مختلف رنگوں کے ہیرے نصب کئے گئے تھے جو چاندنی سے آگ اگلنے لگے تھے۔ ان کی ٹھنڈی اور پُراسرار روشنیوں نے ماحول کو عجیب حُسن بخش دیا تھا۔ پھر اس پُرسحر سناٹے میں ناقوس کی آوازیں ابھریں۔ اور اس کے ساتھ ہی کاہلوس اعظم اپنی چٹان پر نظر آیا۔ اور اس کے فوراً بعد رنگین روشنیوں میں ایک سحر جاگا۔ چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے لباس میں ملبوس ایک نوعمر نوخیز جسم نظر آیا۔ جو ایک چٹانی دروازے سے باہر نکلا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو خادمائیں ادب سے گردن جھکائے ہوئے باہر نکلیں اور چٹان کے دونوں سروں پر ایستادہ ہوگئیں۔ اور اس متناسب الاعضاء نوخیز لڑکی کو دیکھ کر میں مبہوت ہوگیا تھا۔!

بلاشبہ حُسن کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار تھی۔ ایسا شاہکار جو ہر صدی کی یادگار ہوتا ہے۔ پوری صدی ایک آدھ ہی روایت چھوڑتی ہے اور۔ یہ لڑکی اس صدی کی روایت تھی۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ روشنیاں اس کا احاطہ کئے اس پر نثار ہورہی تھیں۔ اور اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے چلنے کا انداز بھی عجیب تھا، جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔!

پھر وہ چٹان پر بنی ہوئی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اس طرح چمک رہا تھا کہ دور دور سے دیکھا جاسکے اور مجھے یقین تھا کہ میدان میں مجمع لوگ بھی اُسے بخوبی دیکھ رہے ہوں گے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور میں نے محسوس کیا۔ کہ اس وقت سے آج تک کی ساری تھکن رفع ہوگئی۔ جب میں یوکاس کے ساتھ جہاز میں سوار ہوا تھا۔! اس لڑکی کو دیکھنے کے لئے اس سے زیادہ جدوجہد کی جاتی۔ تب بھی کم تھی۔ میں نے اپنے دل میں نئی اُمنگیں محسوس کیں اور دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔

تب اس نے آہستہ آہستہ پلکوں کی جھالریں اُٹھائیں۔ اور پروفیسر۔ آج بھی وہ نگاہیں میری نگاہوں میں ہیں۔ ممکن ہے تم میری بات کو افسانہ طرازی سمجھو۔ ممکن ہے تم مجھے کوئی بوالہوس دیوانہ قرار دو۔

لیکن۔ لیکن پروفیسر۔ میری عمر کا اندازہ تم مشکل سے ہی لگا سکتے ہو۔ تم میری عمر کا تعین ہی نہیں کرسکتے۔ اور میں اس پوری عمر کی۔ میں صدیوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں پروفیسر۔ کہ ان سے زیادہ حسین، ان سے زیادہ پُرکشش ان سے زیادہ سحر انگیز آنکھیں دوبارہ میری نگاہوں سے نہیں گزریں۔ وہ۔ آنکھیں نہیں تھیں کہ پورا طلسم خانہ۔ کون تھا جو ان آنکھوں کو دیکھ کر دل سینے سے کھنچتا نہیں محسوس کرتا۔!

میری بھی یہی کیفیت تھی۔ بس محسوس کررہا تھا کہ میں اس لڑکی کے بغیر نامکمل ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی اس سارے طلسم کو برباد کردوں۔ ابھی اس پورے ڈرامے کو ختم کردوں۔ اور لڑکی کے پاس پہنچ کر اسے اپنی تحویل میں لے لوں۔ اسے قریب سے دیکھوں۔!

اور پھر میں نے اس کی آواز سُنی۔!

کون کون سی چیز کی تعریف کروں پروفیسر۔ وہ صدیوں کا مجموعہ حُسن تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ زندگی کا نکھار۔ ہر چیز حُسن سے مالا مال۔ سحر خیز آواز نے سان بارے کے لوگوں کو مخاطب کیا۔

"سان بارے کے لوگو۔ تمہاری ملکہ تمہاری عقیدت قبول کرتی ہے۔ وہ تمہارے لئے خوشحالی کی دُعا کرتی ہے۔ کیا تم خوش ہو۔؟"

"ہم خوش ہیں۔" ایک غلغلہ بلند ہوا۔

میں نے دل ہی دل میں اس طلسم کدے کو سراہا۔ ملکہ کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ لیکن ساکت پہاڑوں میں گونج کا ایسا نظام تھا کہ وہ دُور تک پھیل رہی تھی۔

"مقدس کاہن اعظم۔!" اس بار اس نے بوڑھے ہیگے کو مخاطب کیا۔
"عظیم ملکہ۔ عظیم شیمونا۔!"
"اس جاندار کی الجھن۔؟"
"عظیم الجھن ملکہ۔ عظیم ترین الجھن۔!" مکار کاہن نے کہا۔
"ہمیں آگاہ کرو۔" شیمونا کی آواز ابھری
"سرحد کے پہاڑوں سے ایک چپٹے چمکدار جسم والا اجنبی اندر داخل ہوا۔ وہ غیر معمولی طور پر طاقتور تھا۔ اس لیے اس نے ناقابلِ عبور پہاڑوں کو عبور کر کے سرحدی محافظوں کو مرعوب کیا اور خود کو دیوتا کہلوایا۔ اس نے کہا۔ وہ تیرے دیوتا نیموں کو قتل کر دے گا۔ اس نے اور بھی دعوے کیے۔ اور لوگوں کو بہکایا۔ اے عظیم ملکہ۔ وہ تیرے سامنے موجود ہے۔ تصدیق۔ یا تردید کر دے۔ تو بہتر جانتی ہے۔ کیا یہ دیوتا ہے۔؟ اگر یہ دیوتا ہے تو عوام کو بتا دے۔ تاکہ سب اس کی تعظیم کریں۔ اور اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کے لیے سزا ابھی تو ہی تجویز کر۔!"

اور پروفیسر۔ حسین آنکھیں میری طرف اٹھ گئیں۔ کھوئی کھوئی آنکھیں سحر بھری۔ سحر میں ڈوبی ہوئی۔ یہ آنکھیں مجھے دیکھتی رہیں۔ اور پھر ایک سوال ابھرا۔ "اجنبی۔ تو۔ کون ہے۔؟"

"شیمونا کا مہمان۔ کیا سان بابے کی زمین اس قدر تنگ ہے کہ وہ ایک مہمان برداشت نہیں کر سکتی۔" میں نے بے باکی سے کہا۔
"ہم اجنبیوں کو اپنے درمیان جگہ نہیں دیتے۔" شیمونا نے کہا۔
"میں آوارہ گرد ہوں۔ جس زمین پر جگہ نہیں ملتی۔ وہاں جگہ حاصل کر لیتا ہوں۔ تیری بستی میری پسند ہے۔ کچھ روز یہاں گزاروں گا۔ جس مقصد کے تحت آیا ہوں وہ حاصل کروں گا اور پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔!"
"تیرا مقصد کیا ہے اجنبی۔؟"
"میری پناہ میں آیا ہوا ایک شخص تیرا قیدی ہے۔ اسے رہا کر دے۔"
"کون ہے وہ۔ کیا نام ہے اس کا۔؟"
"مانو۔!"
"مانو۔ لیکن یہ تو ہمارا غلام ہے۔ اس نے ملکہ کے حکم سے غداری کی ہے۔ اس نے خود کو نیموں کے سامنے نہیں پیش کیا اور جس کے نتیجے میں نیموں نے بہت سے انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ یہ ہمارا مجرم ہے۔ ہم اسے سزا دیں گے۔ اور پھر یہ تیری پناہ میں کیسے آیا۔؟"
"ایک راہ گزر پر۔ یہ اور اس کے ساتھی بے بس کھڑے تھے۔ میں نے علاو کیا کہ میں ان کا محافظ ہوں۔ اور پھر میں ان سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ نیموں بھی اگر انہیں مجھ سے چھیننے آتا۔ تو۔ میں اسے ہلاک کر دیتا۔ میں نے سوچا۔ نیموں سے تیری زمین پاک کر دوں۔ اور میں بچنے والوں میں سے مانو کو لے کر نیموں کی تلاش میں نکلا۔ لیکن کیسی انوکھی بات ہے کہ تو نے۔ اور تیرے جوانوں نے اسے پسند نہیں کیا۔"

"اپنی باتوں پر غور کر اجنبی۔ سوچ۔ کیا تو تیرے دیوتا کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کر کے کفر نہیں بک رہا۔ کیا اس کے بعد تیرے لیے کوئی سزا تجویز نہ ہو۔؟"
"دے سکتی ہے تو صرف ایک سزا دے دے شیمونا۔!"
"کیا سزا پسند کرے گا۔!"
"مجھے نیموں کے سامنے پہنچا دے۔!" میں نے کہا۔
"اس کے ٹھکانے نامعلوم ہیں۔ ورنہ تیری خواہش ضرور پوری کی جاتی اور پھر شیمونا کے دربار اس لیے نہیں ہوتے کہ وہ مجرموں کو بہت دیں۔ تیرے لیے سزا تجویز کر لی گئی ہے۔ اور تجھے سزا دی جائے گی۔"
"مہمانوں کو سزا نہیں دی جاتی شیمونا۔"
"ہم نے تجھے مہمان نہیں تسلیم کیا۔ اس لیے۔ مقدس گہرائیاں تیرا مقدر بن گئی ہیں۔ جا ان گہرائیوں کو اپنا لے۔ تیرے لیے مناسب سزا ہے!" شیمونا کے منہ سے آخری الفاظ نکلے۔!

اور پروفیسر۔ یہ بات واقعی میں نے نہیں سوچی تھی کہ یہ چٹان جس پر میں کھڑا ہوں۔ کسی میکنزم کے تحت حرکت کر سکتی ہے۔ مجھے تو اس وقت احساس ہوا جب چٹان اچانک جھک گئی۔

بھلا اس جھٹکے کے بعد میں کیا توازن برقرار رکھ سکتا تھا۔ یا ایسی کونسی جدوجہد کر سکتا تھا جو خود کو ان گہرائیوں میں گرنے سے روک سکوں جن کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔

ہاں۔ مجھے اپنا کوئی خیال نہ تھا۔ تاریک خلاؤں سے نیچے جاتے ہوئے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قتیلہ کے جسم کی چمک تلاش کر رہا تھا۔ تاکہ اگر وہ میرے قریب سے گزرے تو اسے پکڑ لوں۔ اس کی دلدوز چیخ کی لے میں نے بہت اوپر سنی تھی۔ گہرائی سی گہرائی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خلاء کا یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔ لیکن بالآخر۔ اس سفر کا اختتام ہوگیا۔

پتھر نوکیلے تھے اور میرے جسم میں خوب زور سے چبھے۔ لیکن چند ساعت کے بعد میں کھڑا ہوگیا۔ مجھے قتیلہ کے جسم کی تلاش تھی۔ وہ کہاں گری۔ بدنصیب لڑکی۔ موت اس کا مقدر بن گئی تھی۔ اگر میں اسے وہاں چھوڑ دیتا تب بھی کالوکس اسے مار ڈالتا۔ یہاں بھی موت اسے لے آئی تھی۔ لیکن اس شقی القلب ملکہ پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ اتنی حسین۔ لیکن ایسی سنگدل۔!

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن قتیلہ کا بدن قرب و جوار میں نہیں تھا۔ تب میں ایک جگہ کھڑے ہو کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا! اچانک مجھے اپنی پشت پر آہٹ محسوس ہوئی اور میں چونک کر پلٹا۔!

آہ۔! قتیلہ کا ہلکا پھلکا جسم اب نیچے پہنچا تھا اور ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ مر تو وہ پہلے ہی گئی ہوگی۔ بلندیوں سے نیچے تک کے سفر میں ہی زندگی بچنا ممکن نہیں تھی۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ چند رنگین کپڑے کچلی ہوئی ہڈیوں سے ابلتا ہوا خون۔ بس۔ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میرا قرب بہت کم لڑکیوں کو راس آیا تھا لیکن شیمونا۔ حسین عورت۔ بے شک میں تجھے پسند کرنے لگا ہوں۔ بلاشبہ میں تیرے قرب کا خواہشمند ہوں۔ لیکن تو نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کی سزا تجھے ضرور ملے گی۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنے جسم پر رینگنے والی کوئی چیز پکڑ لی۔

خاصا موٹا کیڑا تھا۔ عجیب سا لگا۔ میں نے اسے ہتھیلی پر رکھا اور پھر قریب سے دیکھا۔ سیاہ رنگ کا ایک خوفناک بچھو تھا۔ اور سخت حیران تھا کہ یہ کونسی متحرک شے ہے جس پر بار بار ڈنک مارنے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگڑا حالانکہ یہ ان بچھوؤں میں سے تھا جن کے ڈنک مارنے سے پتھر سنکھیا بن جاتا ہے۔ میں نے اسے ایک طرف پھینک دیا۔

اور پھر میں اس جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ اوپر دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک عظیم الشان غار ہے۔ جو پہاڑوں سے شروع ہوتا ہے اور زمین کی گہرائیوں میں چلا گیا ہے۔ لیکن یہ کتنا طویل ہے اور اس میں کونسا راستہ اوپر پہنچنے کا ہے۔؟ ہے بھی یا نہیں۔؟ چاروں طرف نوکیلے پتھر بکھرے ہوئے تھے جن کے درمیان لمبے ڈنک والے سیاہ بچھو رینگ رہے تھے۔ کئی بار یہ بچھو میرے قدموں کے نیچے آئے۔ انہوں نے اپنی کوششیں کیں۔ لیکن ناکام رہے۔ لیکن میں نے ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

رات گزر رہی ہے۔ اور پھر میں دن کی روشنی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ روشنی ہونے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا مناسب ہوگا! ویسے جتنی گہرائی میں میں پہنچ چکا تھا اسے طے کرنا آسان کام نہ ہوگا۔ مجھے خاصی جدوجہد کرنی ہوگی۔ یہ بات جدوجہد کے بعد ہی طے کرنی تھی کہ ان لوگوں کے خلاف میرا غصہ کیا حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔

میں ایک نوکیلے پتھر سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ روشنی نکلنے تک میں اونگھتا رہا۔ اور پھر جب غار میں بھی صبح ہوگئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ایک بھیانک منظر میرے سامنے تھا۔ بےحد خوفناک غار تھا انتہائی کشادہ۔ پتھروں سے ویرانی برس رہی تھی۔ یہاں بے شمار سیاہ مخلوق موجود تھی۔ چھوٹی بڑی۔ ہر ایک اپنے زعم میں۔ میرے گرد ان کی پوری قوم جمع ہوگئی تھی۔ اور وہ حیران تھے کہ یہ کیا شے ہے جو جاندار ہے لیکن پتھر کی طرح بےحس ہے۔ میں نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر ان پر دے مارا۔ بے شمار بچھو پتھر کے نیچے آکر کچلے گئے اور ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ میں نے دوسرا پتھر اٹھایا۔ اور پھر تو یہ چالاک حشرات الارض بری طرح بھاگنے لگے اور ذرا سی دیر میں میدان صاف ہوگیا۔

تب میں اٹھا۔ میں ایک بار پھر بدنصیب قتیلہ کی لاش دیکھنا چاہتا تھا اور میں نے اس کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن دیوانے

پوپ کے روحانی جاسوس

یہ خیال کر لینا محض خوش فہمی ہے کہ ویٹی کن میں پوپ کی حکومت محض ایک روحانی ادارہ ہے اور اس کا سیاست کی سازشی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ روس تک ویٹی کن کی سیاسی طاقت کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ اسٹالن کے زمانے میں ایک موقع پر روس کے وزیر خارجہ مولوٹوف نے خبردار بھی کیا تھا کہ ویٹی کن کے خلاف اعلانِ جنگ کا نقصان دہ ہوگا مگر اسٹالن نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیا تھا: "بھلا پاپائے روم کے پاس کتنے ڈویژن فوج ہوگی؟" —— یہ صحیح ہے کہ پوپ کے پاس محض ایک روایت کو زندہ رکھنے کے لیے چند سوئیز گارڈز کے علاوہ کوئی فوج نہیں لیکن اسٹالن کا یہ اندازہ بھی غلط تھا کہ پوپ کے پاس کوئی طاقت ہی نہیں۔ اس کے ہاں تربیت یافتہ پادریوں کے ایسے دستے موجود ہیں جن کا مقصد روس اور مشرقی یورپ کے ان ملکوں میں خفیہ طور پر داخل ہو کر جاسوسی کرنا ہے جہاں مذہبی آزادی ختم ہو چکی ہے۔ جاسوسی کی تاریخ میں یہ انتہائی عجیب و غریب تنظیم ہے جس کے ارکان کو تخریبی کارروائیوں کے سوا ان تمام امور کی تربیت دی جاتی ہے جو دوسرے ملک کے اہم راز اڑانے کے لیے ضروری ہیں۔ اس تنظیم کے کئی پادری گرفتار ہو چکے ہیں۔ بعض اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہلاک بھی ہو گئے لیکن ان جاسوسوں کی اکثریت ابھی تک صرف اپنے مقاصد میں کامیاب رہی ہی بلکہ بہت سے جاسوس کئی کئی بار کمیونسٹ ممالک میں بھیس بدل کر داخل ہو چکے ہیں اور وہاں سے مغربی بلاک کے لیے بیش بہا معلومات اور قیمتی راز لے کر واپس آئے ہیں۔ دنیا کی دوسری جاسوسی تنظیمیں ان "روحانی جاسوسوں" کو بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، کیونکہ بعض مواقع پر ان جاسوس پادریوں نے وہ کام کر دکھایا ہے جو امریکہ کی سی آئی اے سے بھی نہ ہو سکا۔

اس کی لاش کہاں گئی۔؟

ہاں کچھ دُور پر مجھے ایک نگینی کپڑا ضرور نظر آیا۔ اور میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ تب پتھروں کے درمیان میں نے ایک نیلے رنگ کا سیال بہتا دیکھا جس میں جیلے سے اُٹھ رہے تھے۔ اور چند ساعت کے بعد صورت حال میری سمجھ میں آگئی۔ ناکا کرنے والے بچھو۔ تقیلہ کے مردہ جسم سے شغل کرتے رہے تھے۔ چنانچہ اس کی ہڈیوں کا برادہ بھی اس کے جسم کے پانی میں شامل ہوگیا تھا۔ اور اب تقیلہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔

"بدنصیب لڑکی۔!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ لیکن راستہ۔؟ اور اب میں سنجیدگی سے اوپر جانے والا راستہ تلاش کرنے لگا۔ ان سپاٹ دیواروں پر چڑھنا بے حد مشکل کام ہے۔ مجھے کسی نوکیلے پتھر کی مدد سے ان چٹانوں میں سوراخ کرنے پڑیں گے۔ اس طرح میں دیواروں کا یہ طویل فاصلہ طے کرسکوں گا۔ ! میں نے سوچا۔

اس کام کی طوالت کا مجھے احساس تھا۔ لیکن۔ بہرحال کام کرنا ہی تھا میں غار کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ اور پھر میں غار کی دیواروں کو ٹٹولنے لگا۔ ان دیواروں میں سوراخ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن مجھے اپنا کام شروع کردینا چاہیئے۔ تب میں نے ایک انتہائی سخت پتھر کا انتخاب کیا۔ اس کی جڑ زمین میں دفن تھی۔!

لیکن میں طیش میں تھا۔ میں نے پتھر کو گرفت میں لے کر زور لگایا۔

اور پتھر جڑ سے اکھڑ آیا۔ اس کے ساتھ ہی بچھوؤں کا ایک گروہ ابھرا اور باہر نکلا اور میرے پیروں پر سے گزرتا ہوا منتشر ہوگیا۔ میں نے پتھر دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔ اور اب میں اسے لئے ہوئے غار کی دیواروں میں نرم اور مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔

غار کا پورا چکر لگاتے ہوئے میری نگاہ ایک ابھری ہوئی چٹان پر پڑی۔ یہ چٹان گول تھی اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے کنارے خالی خالی سے تھے۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا! یہ خالی کنارے۔؟ یہ مجھے شبہے میں مبتلا کررہے تھے۔ میں نے وزنی پتھر نیچے رکھ دیا۔ اور چٹان کو ٹٹولنے لگا! پھر میں نے دونوں پنجے چٹان پر رکھے اور سینے کا زور مجتمع کرکے چٹان پر قوت آزمائی۔!

اور پروفیسر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کوئی پتھر ایک دھماکے سے ٹوٹا۔ اور چٹان گھوم گئی۔ اندر خلاء نظر آرہی تھی۔ میں نے بے اختیار اس خلاء میں ہاتھ ڈال دیئے اور چٹان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔!

یقیناً یہ کوئی سرنگ تھی۔ جس کے منہ پر یا تو یہ چٹان خود بخود آگئی تھی۔ یا پھر یہ۔ کوئی باقاعدہ دروازہ تھا۔ چٹان اس قدر گھوم گئی کہ میں اس کے دوسری طرف جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے جسم سکیڑا اور چٹان کے رخنے سے دوسری طرف پہنچ گیا۔ اور یہ۔ اس وقت کوئی اجنبی امداد تھی جو مجھے ملی۔ چٹان کے دوسری جانب تو ایک لمبی سرنگ تھی۔!

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ پھر میں نے چٹان کو کھسکا کر اس کی جگہ جمادیا۔ اور سرنگ میں آگے بڑھنے لگا! سخت تاریک سرنگ تھی۔ لیکن کافی کشادہ اور اوپر کی طرف جانے والی۔ امیرا سر دیوار سے نہیں ٹکراتا تھا۔ اس لئے میں بآسانی اس میں چل رہا تھا۔ لیکن سست رفتاری مجھے پسند نہیں تھی۔ میں جلد از جلد اس کے دوسرے سرے کو پانا چاہتا تھا۔!

چڑھائی کے سفر میں میں برق رفتاری سے دوڑنے لگا۔ الٹا میں نے اپنی ساری پوشیدہ قوتوں کو آواز دے لی تھی اور میری رفتار اس قدر تیز تھی کہ گیا کوئی گھوڑا کسی میدان میں دوڑ رہا ہو! یہاں تک کہ میں ایک دوشاخے کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں سے سرنگ دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ میں رک گیا۔ کونسا رخ اختیار کروں؟ میں سوچ رہا تھا۔!

اور پھر میں نے ایک طرف جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہاں رکنے سے کیا فائدہ۔ لیکن شکر ہے۔ یہ شاخ طویل نہیں تھی اور اس کا اختتام پتھر کے ایک باقاعدہ دروازے پر ہوا تھا۔ میں دروازے پر رک گیا۔ میں نے دروازے کے رخنے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ لیکن دوسری جانب کوئی آواز نہیں تھی۔ تب میں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ لیکن وہ آسانی سے نہ کھلا تو میں نے اس کے رخنے میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ اور دروازہ پتھر گھسنے کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اور میں اس کے دوسری طرف چلا گیا۔!

یہ بھی ایک عظیم الشان غار تھا۔ لیکن عجیب وغریب ساز و سامان سے آراستہ۔ دیواروں پر جانوروں کے سر لٹکے ہوئے تھے۔ پتھروں پر انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں سجی ہوئی تھیں۔ رنگین پروں کے بستر لگے ہوئے تھے۔ پھلوں کے ڈھیر تھے۔ جانوروں کی کھالوں کی مشک میں نہ جانے کیسے کیسے سیال بھرے ہوئے تھے۔ یہ مشکیں چھت سے لٹک رہی تھیں۔ زمین میں گڑھے تھے اور ان گڑھوں میں آتش روشن تھی۔ بعض گڑھوں میں رنگین سیال کھول رہے تھے۔

میں تعجب سے تمام چیزوں کو دیکھتا رہا۔ پھر مجھے ایک سیڑھی نظر آئی جو چھت کی طرف جارہی تھی۔ اور اچانک تقیلہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھے۔ تقیلہ نے مجھے اس راز سے آگاہ کردیا تھا۔ یقیناً یہ کالوس کی پراسرار تجربہ گاہ تھی۔ یہ اس کا سحر خانہ تھا۔ اور اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ اور پروفیسر میں اس خیال پر مسرت سے اچھل پڑا۔

بہرحال میں ایسی جگہ آگیا تھا جہاں سے باہر نکلنا ممکن تھا۔ چنانچہ اب مجھے کس بات کی پرواہ ہوسکتی تھی۔ میں نے سیال کے اس جار کی تلاش شروع کردی جسے بدن پر مل کر کالوس آگ میں گھس جاتا تھا۔ گو اس سیال کی تلاش مشکل تھی۔ میں صرف اندازے سے ہی یہ کام کرسکتا تھا۔ لیکن میرے اندازوں میں صدیوں کے انسان کا تجربہ تھا۔ میں سوچ سکتا تھا کہ ایسی چیز انسان کہاں رکھ سکتا ہے۔

چنانچہ تلاش کے بعد مجھے ایسی جگہ مل گئی جہاں کالوس کے لمبے لباس رکھے ہوئے تھے۔ یہاں وہ لباس تبدیل کرتا تھا اور یقیناً وہ جار یہیں کہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جلدی میں تیار ہونے والا انسان سہل پسند ہوتا ہے۔ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ میں نے مٹی کے ایک بہت بڑے جار کو دیکھا۔ اس کے نزدیک ہی بہت سے سیال کے قطرے بھی جم کر خشک ہوگئے تھے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

گویا میں نے مناسب جگہ اور مناسب چیز تلاش کرلی ہے۔ تب میں نے جار کھول کر دیکھا۔ اور اس میں بھرے ہوئے سیال کی بو سونگھنے لگا! اس کے بعد میں ان دوسرے جاروں کی طرف آگیا۔ جن میں سیال بھرے ہوئے تھے۔ میں انھیں کھول کھول کر دیکھتا رہا۔ بہت سے سیال اس سیال سے مختلف تھے۔ نہ جانے وہ کس کس کام آتے تھے۔

بہرحال میں نے اس سیال سے ملتے جلتے ایک سیال کا جار اٹھایا اور اس جگہ پہنچ گیا۔ میں نے اس جار کا سیال ایک مناسب جگہ پھینک دیا اور پھر اس جار میں دوسرا سیال اسی مقدار میں الٹ دیا اور اس کے بعد خالی جار اس کی جگہ رکھ دیا۔! اگر میری چال کامیاب ہوجائے۔ تو مقدس کالوس کا مزہ ہی آجائے گا۔ میں نے دل میں سوچا۔

اور پھر میں سوچنے لگا کہ اب مجھے باہر نکلنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے کیا اسی جگہ نکلوں جہاں کالوس دربار کرتا ہے۔ لیکن اچانک میرے ذہن میں سرنگ کی دوسری شاخ آگئی۔! وہ شاخ کہاں پہنچتی ہے۔ دیکھنا تو چاہیئے اور میں واپس پتھریلے دروازے کی طرف چل پڑا۔ دوسرے لمحے میں اس سے نکل آیا۔!

اور اب میں غار کی دوسری شاخ کی جانب جارہا تھا۔ یہ شاخ کافی طویل تھی اور خاصی بلندی کی طرف گئی تھی۔ اس کا اختتام بھی ایک ویسے ہی دروازے پر ہوا تھا۔ میں نے اس دروازے کو کھولا۔ اور اندر داخل ہوگیا پہاڑوں کے اندر خوب دنیا آباد کی تھی ان لوگوں نے۔ واقعی اس سے قبل میں نے ایسے پراسرار پہاڑ نہیں دیکھے تھے۔ یہ غار بھی خاصا کشادہ تھا۔ لیکن اسے انتہائی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ چاروں طرف رنگین کپڑوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ فرش پر ایک عجیب قسم کی گھاس بچھائی گئی تھی جو خشک اور بے حد نرم تھی۔ اس پر پتھر کی نشستیں تھیں۔ سوراخوں کا انتظام ایسا رکھا گیا تھا کہ یہاں خوب ہوا آرہی تھی۔ اور ماحول بہت خوشگوار تھا۔ سامنے کی دیوار میں ایک بڑا اور گول سوراخ نظر آرہا تھا جو انسانی ہاتھوں سے تراشا ہوا تھا۔

شاید کسی دوسرے غار میں جانے کا راستہ۔ میں نے سوچا اور اس

اوصاف حکمرانی

نوشیرواں نے کسی دانشمند سے پوچھا: "اچھے حکمران کی علامت بتاؤ۔"

دانشمند نے جواب دیا: "اچھا حکمران وہ ہے جس کا ہاتھ کھلا ہوا ہو، غصے میں معتدل، معاملات میں عادل، غریبوں اور کمزوروں کا ہمدرد، خوش کلام، رحم دل اور علم نواز ہو۔"

دوسرے راستے کی طرف چل پڑا۔ سوراخ سے گزر کر میں دوسری طرف پہنچا اور پھر ٹھٹھک گیا۔!

یہ چھوٹا سا غار تھا۔ اور یہاں بھی خاصی روشنی تھی۔ لیکن غار کے درمیان ایک سنگی حوض تھا جس میں شفاف پانی بھرا ہوا تھا۔ کنارے پر جڑی بوٹیوں کا خوشبودار پانی چمڑے کی مشکیزوں میں رکھا تھا۔!

اور اچانک میرے ذہن میں ایک خانہ کھل گیا۔! کہیں یہ شیمونا کی رہائش گاہ تو نہیں ہے؟ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں خوشی در آئی۔ لیکن دوسرے لمحے میں نے شیمونا کے بارے میں برے انداز سے سوچا۔ ٹھیک ہے وہ بے پناہ حسین ہے۔ لیکن اسی قدر سنگدل بھی ہے۔ اسے انسانیت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔

ہاں اگر وہ مل جائے تو اس سے کچھ گفتگو کی جائے۔

میں اس حمام سے بھی گزر گیا۔ اور اب میں دوسرے کمرے میں تھا میں اسے کمرہ ہی کہوں گا کیونکہ غار کے مختلف حصوں کو مختلف مرحلوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔! اور یہ کمرہ زبردست آرائشوں سے مرصع تھا۔ دیواروں میں ننھے ننھے ہیرے لگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سوراخوں کو بھی اسی طرح منور کردیا گیا تھا کہ سورج کی شعاعیں براہ راست اندر نہ آئیں۔ ہاں ہوا آتی رہے۔!

اور سامنے۔ بالکل سامنے ہی ایک آرام دہ پتھر پر۔ پروں کے نرم بستر پر۔ ملکہ شیمونا محو خواب تھی۔ وہ حسین عورت جس کی ایک جھلک دیکھ کر میں بھی لرز گیا تھا۔! میرے ذہن میں متضاد خیالات پیدا ہوگئے۔ اس کے قریب جاؤں یا نہ جاؤں۔ اس کا حسن مجھے متاثر کرے گا اور ممکن ہے میں اس سے اس کی سنگدلی کا انتقام نہ لے سکوں۔

لیکن اس کے اندر ایک اور جذبہ بھی ابھر رہا تھا۔ دیکھوں تو سہی کہ فنکار عالم کو۔ چاند کی روشنی میں پہاڑوں کو منور کرنے والی شکل نزدیک سے کیسی لگتی ہے۔ اور اپنے اس جذبے پر میں قابو نہ پاسکا اور دبے دبے قدموں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

آہ پروفیسر یقین کرو۔ ایسا حسن تصور میں نہیں آسکتا تھا۔

رات کو وہ بیرونی پرکاریوں سے آراستہ تھی لیکن اس وقت کا حسن سادہ رات کے حسن سے بھی زیادہ دلگداز تھا شاید وہ غسل کرکے سوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک باریک سا لباس تھا جس سے اس کا پورا جسم عریاں نظر آرہا تھا۔ اُف وہ نوخیزیت۔ وہ سادگی۔!

چند لمحات کے لئے میرا ذہن مفلوج ہوگیا۔ سب کچھ بھول گیا۔ دل چاہا۔ اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجاؤں۔ اور صدیاں گذر جائیں۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ ذہن بالکل خالی ہوگیا تھا۔ اس کا تنفس۔ اس کے نوخیز سینے کا زیر و بم میرا وجود ڈگمگا ہوگیا تھا پروفیسر۔ اگر میں غیر معمولی انسان نہ ہوتا۔ تو وہیں ٹکڑے ٹکڑے جان دے دیتا۔!

یہ حسن معصوم۔ یہ پاکیزہ سا چہرہ اس قدر سنگدل ہے۔ کیوں۔ آخر کیوں۔؟ یہ کیسے ممکن ہے۔

میں دل تھامے اُسے دیکھتا رہا۔ جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔؟ اور کافی وقت گزر گیا۔ وہ اسی طرح سوتی رہی۔ بے خبر پوری کائنات سے بے خبر۔

تب میں نے ایک گہری سانس لی۔ میں اس حسین لڑکی سے انتقام کیسے لوں۔ ممکن ہے۔ ممکن ہے یہ سب کاہوس کی کارستانی ہو۔ وہ اس سنگدلی میں ملوث نہ ہو۔ لیکن میں نے اس کے الفاظ خود سنے تھے۔ میں اسے کیسے اس جرم سے بری الذمہ قرار دوں۔ پھر میں سنبھل گیا۔ گو وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ اس طرح احمق بننا مناسب نہیں ہے۔ حالات کا جائزہ لینا چاہئے نہ جانے یہ غار در غار کہاں تک گئے ہیں؟

اور میں نے اس خواب گاہ کا دوسرا دروازہ تلاش کیا۔ لیکن اس سوراخ میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ یہاں دو حسین لڑکیاں موجود تھیں وہ دونوں دھیمے لہجے میں گفتگو کررہی تھیں۔ شاید وہ شیمونا کی خادمائیں تھیں۔ کیا کروں؟ کیا ان لوگوں پر خود کو عیاں کر دوں۔ کام نہ بگڑ جائے۔ نہ جانے یہاں کون کون ہو۔ لیکن۔ بہرحال میرا راز کھل جائے گا۔ پھر کیوں نہ میں خود ہی ان سے مل بیٹھوں۔ ممکن ہے میں انہیں متاثر کر سکوں۔ اوہ۔ وہ عورتیں ہیں اور عورتوں کی دکھتی رگ سے میں بخوبی واقف تھا۔!

چنانچہ میں نے اس دوسرے غار میں قدم رکھ دیا۔ اور وہ دونوں میرے قدموں کی آہٹ سن کر چونک پڑیں۔ پھر انھوں نے مجھے دیکھا۔ اور ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل پڑیں۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔

تب میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر گردن جھکا دی "کیا میں ایسی ہی بھیانک شکل ہوں خوبصورت لڑکیو کہ تم مجھے دیکھ کر اس قدر خوفزدہ ہوجاؤ" میں بڑی ملائم آواز میں بولا۔ اور اس لہجے اور الفاظ کا ردعمل صاف ظاہر ہوا۔

"مجھے افسوس ہے۔ اگر میں تمہاری پریشانی کا باعث بنا" میں نے پھر کہا

"لیکن۔ لیکن تم کہاں سے آئے ہو؟ ملکہ شیمونا۔؟"

"وہ سو رہی ہے۔ گہری اور پرسکون نیند"

"کیا مقدس کاہوس اعظم نے تمہیں بھیجا ہے؟"

"نہیں۔ میں اس کی اجازت کے بغیر آیا ہوں" میں نے کہا

"اوہ۔ لیکن تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ یہاں کاہوس اعظم کے علاوہ اور کوئی مرد قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہاں تک کہ دوسرے مقدس بیٹے تک نہیں۔ خود ملکہ کی بھی یہی ہدایت ہے۔؟"

"میرے بارے میں نہ کاہوس اعظم کو معلوم ہوگا۔ نہ ملکہ کو۔ میں تو تمہارے پاس آیا ہوں"

"ہمارے پاس۔؟" ان دونوں نے بیک وقت کہا

"ہاں خوبصورت لڑکیو! میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ مجھے تمہارے حسن نے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے یہاں آنے کا خطرہ مول لے لیا"

"اوہ۔ مگر تم کون ہو۔؟ ہم نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا"

"تم ان غاروں سے باہر کب جاتی ہو۔ لیکن میں تصور میں تمہیں دیکھتا رہا ہوں" میں نے کہا "میں سمجھ گیا تھا کہ لڑکیاں مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ نہ میری کہانی ان کے کانوں تک پہنچی ہے۔ ورنہ وہ ضرور مجھے پہچان لیتیں۔

"چلے جاؤ۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ خطرے میں پڑ جاؤ گے" ایک لڑکی نے کہا۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر ان دونوں کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہارے لئے زندگی کی بازی لگا دی ہے اور تم مجھے اس طرح چلے جانے کا مشورہ دے رہی ہو۔؟"

"مگر ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" وہی لڑکی بے چینی سے بولی

"چند لمحات مجھے خود کو پیار کر لینے دو۔ اس کے بعد میں خوشی سے جان دے دوں گا" میں نے ایک جانباز عاشق کے انداز میں کہا۔ اور دونوں لڑکیاں رام ہوگئیں۔ انھوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "کشکا۔ دیکھو ملکہ سو رہی ہے" ایک لڑکی دوسری سے بولی۔ دوسری جلدی سے ملکہ کے غار کی طرف چل دی۔ پہلی لڑکی نے باہر سے دروازے کے دوسری طرف جھانکا تھا۔

"ہاں۔ ملکہ سو رہی ہے۔" کشکا کے چہرے پر جذبات لرز رہے تھے

"ادھر بھی کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن ہم اس اجنبی کو کہاں پوشیدہ کریں۔ کیا یہ کاہوس اعظم کی نگاہوں سے بچ سکے گا۔؟"

"کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ہم اس کی زندگی خطرے میں بھی تو نہیں ڈال سکتے۔" اور پروفیسر خوب چکر چل گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ لڑکیاں مجھے عمدہ معلومات فراہم کر سکیں گی۔ لیکن۔۔!

بے گور و کفن

اثر نعمانی

سولی بنجو یوں تو ادنیٰ درجے کے سینکڑوں بدمعاشوں میں سے تھا جو اس بات کی پوری جدوجہد کر رہا تھا کہ اس کی سرگرمیاں اسے بھی بڑے جرائم پیشہ لوگوں کے زمرے میں شامل کردیں۔ لیکن اپنی بے بضاعتی کے باوجود ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ قصبے کے بیشتر لوگ اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ گزشتہ گرمیوں میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا ہو جب کسی نہ کسی قتل کے سلسلے میں سولی بنجو کا نام زیر بحث نہ آتا ہو۔ یا لوگ اس قتل کو اس سے منسوب نہ کرتے ہوں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ جنوب کا قاتل (وہ اس نام سے مشہور ہوگیا تھا) ان تمام وارداتوں کا ذمہ دار نہیں ہے لیکن سولی نے اس بارے میں کبھی کوئی بحث نہیں کی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جتنے زیادہ قتل اس کے نام سے منسلک کئے جائیں گے۔ بڑے بدمعاشوں میں اس کی شہرت اتنی ہی زیادہ بڑھ جائے گی۔

جرم و سزا کے موضوع پر ایک غیر معمولی تحریر

ایک مجبور و بے بس شخص کی درد انگیز کہانی

مقامی پولیس ناکافی ثبوت و شواہد کی وجہ سے کبھی اس پر مقدمہ چلانے کے قابل نہیں ہوسکی مگر ہر واردات یا قتل کے بعد اس سے پوچھ گچھ کرنے اس کے پاس آتی تھی یا اسے پکڑ کر پولیس ہیڈ کوارٹرز لے جاتی تھی۔ لیکن اخبارات میں ایسے کتنے ہی فوٹو شائع ہوچکے تھے جن میں سولی کو پولیس کی ناکام پوچھ گچھ کے بعد ہیڈ کوارٹر سے مسکراتے ہوئے رخصت ہوتے دکھایا گیا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک بازو کسی حسین و نوجوان عورت کی کمر میں پڑا ہوتا تھا۔

ویسے دیکھنے میں سولی بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ اور تقریباً قصبے کے ہر فرد کو اس بات پر افسوس ہوتا تھا کہ اس جیسا خوبصورت اور معصوم چہرہ نوجوان غنڈوں اور بدمعاشوں کی بری صحبت میں پڑ کر خراب ہو رہا ہے۔ وہ چاہتا تو ڈاکٹر یا پھر کسی ادارے کا کوئی اعلیٰ عہدیدار بھی بن سکتا تھا۔ لیکن اسے دولت کمانے کا آسان طریقہ پسند تھا۔ کام تو وہ بالکل کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اسے محنت سے روٹی کمانے کے نام سے چڑ تھی۔ اور اکثر کہتا تھا کہ صرف بیوقوف لوگ ہی محنت اور تندہی سے کام کیا کرتے ہیں۔

چنانچہ میرا خیال ہے کہ میں بھی ایک ایسا ہی احمق تھا کیونکہ میں گاڑھے پسینے کی کمائی کھاتا تھا۔ چودھویں سڑک اور سٹروٹر اسٹریٹ کے چوراہے پر میری اخبارات اور کتابوں کی دکان تھی۔ جہاں گاہکوں کو ان کی ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں بھی مل جاتی تھیں۔ میں سڑک پر لوگوں کو آتے جاتے بہت سی باتیں کرتے سنتا تھا جن میں سے زیادہ کا موضوع سولی کی ذات ہوتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ اسی گرد و نواح میں پل کر جوان ہوا ہے اور یہ علاقہ اپنے سرکش اور سخت مزاج باشندوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا لیکن جس قسم کی باتیں میرے کانوں میں پڑتی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ سولی بنجو علاقے کے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کا ہیرو بن چکا ہے۔ وہ سولی کے متعلق اسی لب و لہجے میں بات کرتے تھے جیسے اپنے کسی پسندیدہ فلمی اداکار یا کسی محبوب رہنما کا تذکرہ کر رہے ہوں۔

بوڑھے لوگ جو میری دکان سے اخبارات، رسالے، چیونگم یا کینڈی وغیرہ خریدا کرتے تھے کبھی کبھی سولی کے بچپن یا پھر اس کے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

”مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ یہ غنڈہ گردی دیر تک جاری نہیں رہ سکتی۔“ بوڑھے اینڈی نے ایک سہ پہر مجھ سے کہا۔ ”یہ لڑکا بہت تیزی سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ابل دماغ ہے۔“ اس نے اپنی پیشانی پر انگلی ماری۔ ”وہ ذہین لوگ جو جرائم پیشہ افراد کے گروہ بنا کر ان کے باس اور سردار بن جاتے ہیں اس لڑکے کو حسد سے جلد استعمال کر کے اسے ختم کر دیں گے۔“

”وہ کیوں۔۔؟“ میں نے پوچھا۔ اینڈی پرانے اخباروں کے ایک بنڈل پر بیٹھ گیا جو میں نے اپنے تقسیم کار کو واپس کرنے کے خیال سے باندھ رکھا تھا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ سولی بنجو مزاج کا بہت تیز اور شہرت کا بھوکا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جبکہ ایک بہترین ریوالور بازکی پہلی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ٹھنڈے مزاج سے کام لیتا ہے اور کبھی اشتعال میں نہیں آتا۔ پھر پبلسٹی تو کبھی پسند نہیں کرتا کیونکہ یہ اس کے حق میں بیحد نقصان دہ ہوتی ہے اور لوگ اسے بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔“

”لیکن ابھی تک تو اس پبلسٹی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ اس کے برعکس اس کی شہرت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔“

”میری بات یاد رکھنا۔“ اینڈی بولا۔ ”جلد یا بدیر اگر پولیس اسے گرفتار نہیں کرسکی تو کوئی گروہ اسے ختم کر دے گا جس انداز سے سولی کی سرگرمیاں جاری ہیں اس میں اس کا کسی نہ کسی سے ٹکرانا یقینی ہے۔ اور تم یہ بات شاید بھول گئے کہ تمہارے یہ دکان کھولنے سے پہلے میں لیوک مین کے گروہ میں شامل رہ چکا ہوں۔ اور اگر سولی نے کبھی اس سے یا اس کے کسی آدمی سے الجھنے کی کوشش کی تو وہ اس لڑکے کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

اس کے بعد اینڈی نے چیونگم کا ایک پیکٹ خریدا اور رخصت ہوگیا۔ میں بڑی دیر تک بیٹھا ہوا سولی بنجو کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب سولی بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا اور میری دکان پر میرا ہاتھ بٹاتا تھا۔ جب میں دوپہر کا کھانا کھانے جاتا تھا تو وہ دکان پر بیٹھا کرتا تھا، مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ وہ دیکھتے دیکھتے اتنا بدل گیا کہ اس سے پہلے کہ میں اسے الگ کرتا وہ خود ہی کام سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

لیکن سولی سے میرا تعلق اب ماضی کی بات بن گئی تھی اور مجھے جلد ہی ان خیالات کو ذہن سے نکال کر اپنی دکانداری کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یوں بھی میں نے اسے گزشتہ دس سال سے نہیں دیکھا تھا۔ میں دوپہر کے وقت جبکہ گاہکوں کا ہجوم نسبتاً کم ہوتا تھا بعض گاہکوں کے آرڈر کی تکمیل کرنے لگا، مگر میرے خیالات کی رو بدستور سولی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا۔

سولی کی ماں خدا اسے جنت نصیب کرے، بہت دن پہلے ہی انتقال کر گئی تھی اور اس طرح اس ذلت آمیز شرمندگی سے بچ گئی تھی جو وہ اپنے بیٹے کی حرکتیں دیکھ کر اور سن کر محسوس کرتی۔ اور پھر جب اس کے انتقال کے بعد اس کے باپ نے سولی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی میں کامیابی کا اصل سخت محنت اور جانفشانی سے ہی حاصل ہوتی ہے تو اس نے اپنے باپ کا اس قدر مذاق اڑایا کہ تنگ آکر اس نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔

تقدیر کچھ آدمیوں کے ساتھ بڑی بے رحمی سے پیش آتی ہے۔ اپنے تھرمس سے کڑوی کسیلی کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا۔ جب میں نے تمام آرڈرز کے باقاعدہ پیکٹ بنا چکا اور صرف اتنی کسر رہ گئی کہ

انہیں ڈاک خانے لے جا کر سپرد ڈاک کر سکوں تو ایک سیاہ رنگ کی سیڈان کار میری دکان کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سے تین آدمی اتر کر میری طرف بڑھے۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ ان میں سے ایک لیوک مین تھا اور باقی دو اس کے گرگے تھے۔ وہ میری دکان پر آئے اور لیوک مین نے ایک اخبار خریدا۔ اس نے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی اور تب پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”چاچا۔“ اس نے کہا۔ اور مجھے ہنسی ضبط کرنی پڑی کیونکہ لیوک مین تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا۔ بلکہ ممکن ہے مجھ سے دو چار سال بڑا ہی ہو۔ ”چاچا تم نے کبھی سولی بنجو کا نام سنا ہے؟“

”میں بھی اخبار پڑھتا ہوں۔“ میں نے براہ راست کسی اقرار یا انکار سے بچتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا اس کا بچپن اسی علاقے میں گزرا ہے؟“

”سننے میں تو یہی آیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ لیوک مین نے اخبار لپیٹ کر اپنی بغل میں دبا لیا تھا۔

”مجھے سولی بنجو کی تلاش ہے چاچا۔“ اس نے کہا۔ ”اگر اتفاق سے تمہیں یہاں کہیں نظر آجائے تو تم مجھے فون کر دینا میں تمہارا ممنون ہوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک کارڈ پکڑا دیا جس پر کوئی نمبر لکھا ہوا تھا۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ وہ اس جگہ آئے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے صرف اتنا کہا ہے چاچا کہ اگر وہ اتفاق سے آجائے تو مجھے اطلاع کر دینا۔“ لیوک مین مسکرایا اور یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بیس ڈالر کا نوٹ میرے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ تمہاری اس زحمت کا معاوضہ ہے۔“

وہ اس وقت تک رکا جب تک میں نے نوٹ نہیں اٹھا لیا پھر وہ اپنے ساتھیوں سمیت گھوما اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ بیس ڈالر کا نوٹ بہرحال بیس ڈالر کا نوٹ ہوتا ہے۔ پھر میں اسے اپنی جیب میں رکھنے سے کیوں ہچکچاتا۔ پھر جب اینڈی اپنے کسی کام سے جاتے ہوئے ذرا دیر کیلئے میری دکان پر رکا تو میں نے اسے اس واقعے کے بارے میں بتایا۔

”آخر لیوک مین سولی کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے سنا ہے۔“ اینڈی نے اپنا سگار جلاتے ہوئے بتایا۔ ”کہ گزشتہ ہفتے ایک بار میں سولی لیو سے الجھ پڑا۔ آپس میں مقابلہ کرنے کے لئے وہ دونوں بار سے باہر نکلے۔ ابھی وہ باہر آہی رہے تھے کہ سولی نے پیچھے سے لیو پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔ لیو کیبزی، لیوک مین کے گروہ کا آدمی ہے اور کوئی شخص لیوک مین کے کسی آدمی کو مار پیٹ کر اس کے انجام سے نہیں بچ سکتا، سمجھ گئے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اس سے قطع نظر کہ تم سولی بنجو کے بارے میں کیا احساسات رکھتے ہو میرا مشورہ ہے کہ اگر وہ سچ مچ اس علاقے میں نظر آئے تو لیوک مین

شیر کا دلچسپ شکار

امریکہ کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں ایسے ریکارڈ فروخت ہوتے ہیں جن میں مختلف جانوروں کے بولنے، دھاڑنے اور شور و غل مچانے کی آوازیں بھری ہوتی ہیں۔ ایک گلنے والی چڑیا سے لے کر شیر تک ہر پرندے، چرندے اور درندے کی ایسی بولیوں کے ریکارڈ دکانوں پر موجود ہیں جو وہ مختلف حالتوں میں نکالتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے شوقیہ طور پر ایک شیر کی آواز کا ریکارڈ خریدا اور اسے لے کر شکار کی غرض سے چل پڑا۔ جنگل میں پہنچ کر میں نے اپنا منی ٹرک گھنے درختوں کی اوٹ میں کھڑا کر دیا اور وہی ریکارڈ بجانے لگا۔ میں اور میرا ساتھی اسٹیوارٹ جلدی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں جا کر چھپ گئے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ابھی مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہماری نظر ایک جنگلی بیل پر پڑی جو کوئی تین سو گز کے فاصلے سے چھلانگیں لگاتا منی ٹرک کے قریب آ رہا تھا جہاں سے اس کے کانوں میں شیر کی آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ اسٹیوارٹ نے بندوق سنبھالی اور میں نے کیمرہ۔ ہم دونوں اس جنگلی جانور کا نشانہ باندھ ہی رہے تھے کہ ہمیں اپنے پیچھے پنجوں کے بل دوڑنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک چھوٹا سا شیر تھا۔ کچھ نہ پوچھئے کہ ہم دونوں کی کیا حالت ہوئی۔ وہ تو خیریت اس طرح ہوئی کہ شیر نے ہمیں دیکھا نہیں۔ وہ بھاگتا ہوا سیدھا منی ٹرک کے پاس چلا گیا جہاں شیر کی آواز کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ رک گیا اور اس انداز سے آگے پیچھے دیکھنے لگا گویا اس قسم کے مذاق کو اپنی ہتک اور بے عزتی سمجھ رہا ہو۔ اس نے ایک مرتبہ اس جانب بھی نہایت غضبناک نظروں سے دیکھا جہاں ہم دونوں چھپے بیٹھے تھے۔ ہماری آنکھیں اس وقت پتھرائی ہوئی تھیں اور بدن کانپ رہے تھے۔ تاہم وہ گولی کی سی تیزی کے ساتھ اس طرف نکل گیا جدھر سے آیا تھا۔ ہمیں اس وقت احساس ہوا کہ شیر کے لاؤڈ اسپیکر کے پاس کھڑے ہوتے وقت آسانی سے اس کی تصویر بھی لے سکتے تھے اور اسے گولی کا نشانہ بھی بنا سکتے تھے۔ لیکن یہ کیسے ہوتا؟ شیر کی یکایک آمد کی وجہ سے ہمارے ہاتھوں سے کیمرہ بھی گر چکا تھا اور بندوق بھی!

کو ضرور فون کر دینا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ پھر بعض حالات ایسے پیش آئے کہ میرے علاقے میں بھی سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور کیونکہ یہ سب کچھ سولی کی وجہ سے ہوا تھا اس لئے میں دوسرے لوگوں کی طرح جوش میں نہیں آیا۔ البتہ میری افسردگی کچھ اور زیادہ بڑھ گئی لیکن پھر

ایک ہفتے کے بعد حالات معمول پر آنے لگے۔ میں اپنی دکان کی مصروفیت میں لیوک مین کی آمد کو تقریباً فراموش کر چکا تھا۔

اچانک گرد و پیش کچھ ایسی افواہیں سنائی دینے لگیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ لیوک مین کے آدمیوں نے کسی جگہ سولی بنجو کو اکیلا پاکر پکڑ لیا۔ پہلے اس کی خوب ٹھکائی کی اور پھر اسے سمندر میں ڈال دیا۔ لیکن اینڈی کا خیال تھا کہ یہ افواہیں درست نہیں ہیں۔

"اگر کوئی ایسی بات ہوتی مجھے ضرور معلوم ہو جاتی۔" اس نے کہا۔ "مجھے اس قسم کی خبریں کسی نہ کسی طرح مل جایا کرتی ہیں۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ سولی بنجو کچھ مدت کیلئے کہیں پوشیدہ ہو گیا ہے۔ لیکن اسے جلد ہی سامنے آنا پڑے گا۔ آخر آدمی بغیر کھائے پئے کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اور پھر میرا یہ خیال بھی ہے کہ آجکل سولی روپے پیسے کے معاملے میں بہت تنگدست ہے۔"

بدقسمتی سے اینڈی کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ سولی جہاں کہیں پوشیدہ تھا اسے اپنا پیٹ بھرنے کیلئے باہر نکلنا پڑا اور اس کا نکلنا بیچارے مسٹر اور مسز ٹونر کیلئے قیامت بن گیا۔ مسٹر ٹونر میری دکان سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر سبزیوں اور پھلوں کا کاروبار کرتے تھے۔ دونوں میاں بیوی بہت نیک اور شریف تھے۔ کبھی کسی کو ان کی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ انھوں نے سولی کے ساتھ بھی نیکی کا سلوک کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب سولی کو کسی جرم کی پاداش میں سزا ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی نوعمری کا خیال کرتے ہوئے اسے بچوں کے اصلاحی ادارے میں بھیج دیا گیا تھا۔ جب وہ وہاں سے نکلا تو مسٹر ٹونر نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ممکن ہے اب سولی میں کچھ تبدیلی آگئی ہو اور وہ محنت و ایمانداری سے کام کرنے اور اپنا مستقبل بنانے کا ارادہ رکھتا ہو، اسے اپنی دکان میں ملازمت دے دی جبکہ کوئی اور شخص اس سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ اور ان کی اس ہمدردی کا اور شریفانہ برتاؤ کا صلہ انھیں یہ ملا کہ سولی بنجو نے نہ صرف ان کی دکان لوٹ لی بلکہ دونوں میاں بیوی کو قتل بھی کر دیا۔

O

اینڈی نے جس کا یہ دعویٰ تھا کہ اس نے یہ سارا واقعہ ایک چشم دید گواہ کی زبانی سنا ہے۔ مجھے بتایا کہ سولی، لیوک مین کے آدمیوں سے بچنے کے لئے اس علاقے میں اس خیال سے آیا تھا کہ شاید اسے کہیں پناہ مل جائے اور اتنی نقدی بھی کہ جس سے وہ کچھ دن خاموشی سے گزر کر سکے۔ وہ مسٹر ٹونر کی دکان پر گیا اور اس سے سو ڈالر طلب کئے جب ٹونر نے رقم دینے سے انکار کیا تو سولی نے ریوالور نکال لیا اور ریوالور کے بل پر اسے حکم دیا کہ وہ دکان کے کیش بکس سے تمام نقدی نکال دے۔ مسٹر ٹونر نے جتنی رقم دکان میں موجود تھی نکال کر سولی کو دے دی۔ لیکن جس وقت سولی رقم لے کر دکان سے نکل رہا تھا بوڑھے ٹونر نے پکار کر کہا: "خدا تجھے جہنم رسید کرے سولی بنجو۔"

بس یہ سنتے ہی سولی جاتے جاتے پلٹا اور دونوں میاں بیوی کو گولی مار دی۔ اس وقت اتفاق سے دکان کے باہر ایک گشتی پولیس کانسٹیبل گزر رہا تھا۔ اس نے فائرنگ کی آواز سنی تو دکان کی طرف جھپٹا۔ سولی نے بھاگنے کی کوشش کی کانسٹیبل نے گولی چلا کر اس کا بازو زخمی کر دیا۔ مگر اس کے باوجود سولی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ "مگر مجھے یقین ہے کہ اب اس کا انجام قریب آگیا ہے۔" اینڈی نے آخر میں کہا۔

اس دن میں نے دکان جلدی بند کر دی اور سیدھا گھر چلا گیا۔ میں نے کھانا کھانا چاہا تو لقمہ حلق سے نیچے نہیں اترا۔ مجھے ایک طرف سولی دکھائی دے رہا تھا اور دوسری جانب بیچارے مسٹر ٹونر اور اس کی بیوی کا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انھوں نے پندرہ سال پہلے کس طرح سولی بنجو کو اپنا مستقبل سنوارنے کا موقع دیا تھا اور سولی نے ان کی اس نیکی کا کتنا برا بدلہ دیا۔

میں نے اپنے بیڈروم میں رکھی ہوئی الماری کی اوپری دراز کھولی۔ اعشاریہ ۲۲ بور کا وہ ریوالور اب بھی وہیں رکھا ہوا تھا جسے سولی نے تقریباً زبردستی مجھے دے دیا تھا کہ اپنی حفاظت کے لئے مجھے ایک ریوالور ضرور رکھنا چاہئے۔ اور اب مجھے یقین ہے کہ وہ ریوالور بھی اس نے کہیں نہ کہیں سے چرا کر ہی مجھے دیا ہوگا۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ مجھے ریوالور کی ضرورت نہیں لیکن اسے غالباً میرے انکار سے دکھ ہوا۔ کہنے لگا کہ یہ میری طرف سے تمہارے لئے ایک تحفہ ہے اسے ضرور رکھ لو۔ اور چونکہ اس نے مجھے کبھی کوئی تحفہ نہیں دیا تھا اور مجھے اس کی دل آزاری کا بھی احساس تھا۔ اس لئے میں نے ریوالور لے لیا۔ مگر اس کے بعد یہ ریوالور ہمیشہ میری الماری کی دراز میں ہی پڑا رہا۔ میں نے ایک بار بھی اسے اپنے ساتھ رکھنے یا دکان پر لے جانے کی کوشش نہیں کی۔

O

معلوم نہیں کس خیال اور کس جذبے کے تحت میں نے پہلی مرتبہ اس ریوالور میں گولیاں بھریں۔ ممکن ہے اس کی وجہ میرا یہ عجیب احساس ہو۔ جسے آپ چاہیں تو ایک طرح کی پیش گوئی کہہ لیں۔ کہ مجھے عنقریب اس ریوالور کی ضرورت پڑنے والی ہے۔

پھر میں نے کمرے کی تمام بتیاں بجھا دیں۔ ریوالور اپنی گود میں رکھا اور اس تاریکی میں کمرے کے اندر پڑی ہوئی ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ ابھی مجھے انتظار کرتے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ میں نے کمرے کے باہر سرسراہٹ کی آواز سنی۔ میں نے کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ کوئی اسے چابی سے کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ قفل ایک ہلکی کھٹک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ پھر دروازے کا پٹ کھلا۔ کوئی اندر داخل ہوا اور اس نے دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔

"بڑے میاں تم کہاں ہو؟" ایک دوازنے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"میں یہاں بیٹھا ہوں سولی بنجو۔" میں نے جواب دیا۔ اور محسوس کیا کہ کسی نامعلوم وجہ سے میری آواز کپکپا رہی ہے۔

"تمہیں میری مدد کرنا ہے بڑے میاں۔" اس نے کہا۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہے اور وہاں دھڑک رہا ہے۔ میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"تم نے مسٹر ٹونر اور ان کی بیوی کو کیوں قتل کیا؟" آخر میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں احمق تھے۔ مجھے گولیاں دے رہے تھے۔ میں نے ان کا منہ بند کر دیا تو پھر کیا ہوا۔" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔ "میرے بازو پر زخم آیا ہے۔ اور تمہیں میری مدد کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس اس علاقے کا محاصرہ کرلے میں یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ہے تم بہت خوفزدہ معلوم ہوتے ہو سولی بنجو۔"

"دیکھو بڑے میاں میرے پاس بیکار باتوں میں ضائع کرنے کیلئے قطعی وقت نہیں ہے۔" سولی نے غصے سے کہا۔ "بتی جلاؤ اور جلدی سے میرے زخم کی مرہم پٹی کر دو۔ ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا۔"

"جو مسٹر ٹونر اور ان کی بیوی کا ہوا تھا۔" میں نے بھاری دل سے پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل ان ہی احمقوں کی طرح۔" اس نے بہت سنگدلی سے جواب دیا۔ میری آنکھیں تاریکی کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ اب میں اس کا ایک ہیولا سا دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں کھڑا ہو گیا۔ میرے دل و دماغ میں جو ایک موہوم سی ہچکچاہٹ تھی وہ بھی اس کے آخری جواب سے ختم ہو چکی تھی۔

"اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے سولی بنجو۔" میں نے کہا اور ٹریگر دبا دیا۔ فائر ہوا۔ گولی چلی۔ سولی کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور وہ فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔

میں نے پولیس کو فون کیا اور انہوں نے پہنچنے میں بڑی عجلت دکھائی۔

"تم نے بڑی جواں مردی کا مظاہرہ کیا بڑے میاں۔" سارجنٹ نے تعریف کی۔

"وہ مجھ سے مدد لینا چاہتا تھا مگر میں یہ نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم نے بہت اچھا کیا۔" سارجنٹ نے مجھے اطمینان دلایا۔ "اگر تم اسے نہ مارتے تو وہ تمہیں ختم کر دیتا۔"

میرا رہائشی کمرہ پولیس کے آدمیوں اور اخباری نامہ نگاروں سے بھر گیا تھا۔ پولیس کے کارکن سولی کی لاش کے مختلف زاویوں سے فوٹو لے رہے تھے۔ اور سارجنٹ مجھ سے بے شمار سوالات پوچھ رہا تھا۔ اخباری نمائندے بھی تفصیلات جاننے کیلئے بے چین تھے۔ مگر میں ان میں سے کسی کے سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرا دل بھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اتنے آنسو بہاؤں کہ مدتوں کا دل میں بھرا ہوا رنج و غم آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جائے۔ جسم بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے گزشتہ چند لمحوں میں ایک طویل سفر کیا ہو اتنا طویل کہ بند بند تھکن سے چور ہو گیا تھا۔

شاید سارجنٹ نے میرے چہرے سے میری کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے اخباری نمائندوں کے نرغے سے نکال کر میرے بیڈروم میں لے آیا۔ میں بے دم سا ہو کر بستر پر گر پڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے اسی حالت میں گزرے۔ سارجنٹ بھی خاموش تھا۔

"سارجنٹ۔" دفعتاً میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔ "اب ۔۔۔ اب اس کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی تجہیز و تدفین۔ تجہیز و تکفین ایک اس جیسے غنڈے بدمعاش اور قاتل کی۔"

سارجنٹ نے میری بات کاٹ دی۔ "کون اس قاتل کی تدفین کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگا۔ اسے لاوارث لاشوں کی طرح سرکاری خرچ پر معمولی انداز میں سپرد خاک کر دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر سارجنٹ جانے کے لئے گھوما۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ایک منٹ ٹھہرو سارجنٹ۔" میں نے کہا۔ "کیا تم مہربانی کر کے اس سامنے والی الماری کی تیسری دراز میں رکھا ہوا سگار بکس مجھے اٹھا دو گے۔"

"کیوں نہیں۔" سارجنٹ نے کہا۔ اور الماری کھول کر اس کی تیسری دراز سے سگار بکس نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے سگار بکس کھولا اور بڑی احتیاط سے شمار کرتے ہوئے ایک اور پانچ ڈالر کے نوٹوں کی شکل میں بکس سے تین سو ڈالر نکال کر سارجنٹ کی طرف بڑھا دیئے۔ یہ رقم میرے پس انداز سرمائے کے نصف سے بھی زیادہ تھی۔

"یہ لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کافی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی تجہیز و تدفین ذرا اچھے ڈھنگ سے کرا دو۔" سارجنٹ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ نوٹ تو اس نے لے لئے مگر اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس عجیب پوزیشن کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

"آخر تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ بستر پر لیٹتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ایک کم نصیب باپ اپنے بدنصیب بیٹے کے لئے کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "سولی بنجو میرا بیٹا تھا سارجنٹ۔"

شام کے چھ بجے تھے۔ پیٹر ہاکنز پلازہ فاؤنٹین کے کنارے بیٹھا دولت حاصل کرنے کا کوئی سہل اور اچھوتا طریقہ سوچ رہا تھا۔ فوارے کے ارد گرد تفریح کے لیے آئے ہوئے بے شمار خواتین و حضرات بیٹھے تھے جن کے ساتھ ایک کثیر تعداد بچوں کی بھی تھی۔ اکثر بچے چھوٹے چھوٹے سکے فوارے کے گرد بنے ہوئے حوض میں پھینکتے اور پھر خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔

پیٹر کی نظریں حوض کے ساتھ بنی ہوئی کئی منزلہ عمارت کی طرف اٹھتی چلی گئیں۔ پھر تیسری منزل پر لگے ہوئے سائن بورڈ پر رک گئیں جس پر نمایاں الفاظ میں "ڈائمنڈ شاپ" اور "ہیروں کے بیوپاری" لکھا ہوا تھا۔ بورڈ کے ساتھ ہی ایک کھلی ہوئی کھڑکی تھی جو عین حوض کے اوپر تھی۔ ان تمام تفاصیل کو دیکھ کر پیٹر کے ذہن میں ایک لاجواب منصوبہ جنم لینے لگا۔

وہ ٹہلتا ہوا عمارت کے کونے پر واقع ٹیلیفون بوتھ کے اندر گھس گیا اور جونی اسٹوپ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جونی ایک ہوشیار اور فیشن ایبل شاطر تھا۔ نہایت بارعب اور پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اگر وہ کسی اسٹور میں داخل ہو جاتا تو سیلز مین دوسرے گاہکوں کو چھوڑ کر ایکدم اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور خوش قسمتی سے مشرقی ریاستوں میں اس کا ریکارڈ بالکل صاف تھا۔ دس سال قبل اس نے کیلیفورنیا میں کئی ایک فراڈ کیے تھے۔ تاہم اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ پولیس والے اتنی پرانی کڑیاں ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ رابطہ ملنے کے بعد پیٹر نے کہا۔

"ہیلو جونی، میں پیٹر بول رہا ہوں۔ شکر ہے کہ تم گھر پر مل گئے۔"

"میرے پیارے میں دن کے وقت گھر پر ہی ہوتا ہوں۔ ویسے اس وقت باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے قیلولہ فرما رہا تھا۔"

"سنو! میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔"

"کیسا کام ہے؟" جونی نے پوچھا۔

"فون پر بتانے والا نہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "اگر تم فارغ ہو تو روبی اسنیک بار میں آجاؤ۔ وہاں بیٹھ کر تفصیلی بات ہو جائے گی۔"

"کتنے بجے؟"

"اب سے ایک گھنٹے کے بعد۔" پیٹر نے کہا۔ "یعنی سات بجے۔"

"سات بجے نہیں۔" جونی نے کہا۔ "مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ میں ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"او کے۔ تو پھر آٹھ بجے ملاقات ہوگی۔"

**

روبی اسنیک بار ایک خاموش اور پُرسکون علاقے میں واقع ہے۔ شام کے وقت وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا۔ پیٹر مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا اور عقبی حصے میں واقع ایک کیبن میں بیٹھ کر کافی کا آرڈر دیا۔

آٹھ بج کر دس منٹ پر جونی بار میں داخل ہوا اور گہری نظروں سے اندر کا جائزہ لیا۔ گویا وہ وہاں ڈاکہ ڈالنے یا کسی لڑکی کو اغوا کرنے آیا تھا۔ اندر دو تین گاہک بیٹھے تھے۔ بارمین فون پر کسی شخص کے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔

کیبن میں داخل ہو کر جونی کرسی پر بیٹھ گیا اور استفہامیہ نظروں سے پیٹر کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں برخوردار اب بتاؤ۔ تم کیسا کام تلاش کر کے لائے ہو؟"

پیٹر نے رسمی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے . . . رازداری کے ساتھ کہا۔

"فاؤنٹین پلازہ کی تیسری منزل پر جواہرات کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ یقیناً تم نے وہ دکان دیکھی ہوگی۔ اس دکان سے بڑی آسانی کے ساتھ ہیرے چرائے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ معمولی کوشش سے ہم پچاس ہزار ڈالر کی مالیت کے ہیرے اڑا سکتے ہیں۔"

"بظاہر بڑی پُرکشش بات ہے۔" جونی گرجا۔ "منصوبہ کیا ہے؟"

"اندر کی کارروائی تم کرو گے اور میں باہر سے تمہاری مدد کروں گا۔"

"ہوں پھر میں اندر سے اور اندر چلا جاؤں گا۔ اور تم باہر عیش کرو گے۔"

"تم آرام سے باہر آجاؤ گے۔" پیٹر نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "منصوبہ بالکل سیدھا سادا اور آسان ہے۔ ہم دوپہر کے قریب وہاں جائیں گے۔ اس وقت وہاں زیادہ گاہک نہیں ہوتے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ دکان تیسری منزل پر واقع ہے۔ تم اندر جا کر ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنا۔ جب سیلز مین ہیرے نکال کر تمہیں دکھائے گا تو میں مرکزی ہال میں کچھ گڑبڑ کر دوں گا۔ قدرتی طور پر سیلز مین کی توجہ ایک آدھ منٹ کے لیے ہنگامے کی طرف ہو جائے گی۔ اس دوران میں تم چند ہیرے پار کر لینا۔"

"ہیرے پار کر لوں یعنی نگل لوں۔ جس طرح خانہ بدوش جپسی کرتے ہیں؟"

"کوئی بے ڈھنگی بات نہیں جونی۔" پیٹر نے کہا۔ "پولیس والے اس قسم کی چالوں سے خوب واقف ہیں۔ تم ان ہیروں کو کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔"

"بس؟" جونی گرجا۔ "مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم نے کوئی بیہودہ منصوبہ بنایا ہوگا۔"

"میرے بھائی، میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ عام طور پر کھڑکیاں کھولی ہی نہیں جاتیں شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تازہ ہوا کے لیے اسٹور کے اندر ایئر کنڈیشنر لگا ہوا ہے اس لیے کھڑکی کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"آج میں نے اپنی آنکھوں سے کھڑکی کھلی دیکھی ہے۔ آج کل تیل کے بحران کی وجہ سے لوگ بجلی کم خرچ کرتے ہیں۔ ایئر کنڈیشنر بند رکھتے ہیں اور کھڑکیاں کھول دیتے ہیں۔ بہرحال یہ لوگ اس اصول پر پورے خلوص کے ساتھ عمل کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ کھڑکی تیسری منزل پر واقع ہے اس لیے وہاں سے کسی کے اندر داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ وہاں سے سامان باہر جا سکتا ہے۔ میرا اشارہ ہیروں کی طرف ہے۔"

"وہ نہایت غیر معقول بات نظر آتی ہے۔"

"سنو! تم کھڑکی والے کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ہونا۔ کاؤنٹر سے کھڑکی کا فاصلہ تقریباً دس فٹ ہے۔" اس نے کاغذ پر . . .

کھڑکی اور کاؤنٹر کا حالہ دیتے ہوئے کہا۔ یہ جب ہال کے اندر گڑبڑ ہو اور اسٹور کے تمام ملازمین کی توجہ اس طرف ہو جائے تو تم ہیرے کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔ کسی کا خیال اس بات کی طرف نہیں جائے گا کہ تم نے ہیرے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے ہیں، کیونکہ تم کھڑکی کے قریب نہیں گئے۔ اور کھڑکی کاؤنٹر کے پیچھے ہے۔ ہیرے باہر پھینکنے کے بعد تم دوسرے شوکیس کے قریب جا کر اندر رکھے ہوئے ہیرے دیکھنے لگ جانا۔ اگر ہیروں کی گمشدگی کا انکشاف ہو بھی گیا تو شک صرف تم پر نہیں کیا جائیگا بلکہ اسٹور میں موجود دیگر تمام گاہکوں پر کیا جائیگا۔ بہرحال وہ تمہاری تلاشی لیں گے اور طرح طرح کے سوالات کریں گے لیکن ظاہر ہے کہ تمہارے پاس سے مال مسروقہ برآمد نہیں ہوگا لہٰذا تمہیں جانے دیا جائیگا۔ یوں بھی تم ایک "معزز" اور "پرامن" شہری ہو۔"

"سوال یہ ہے کہ ان ہیروں کا کیا بنے گا جنھیں میں کھڑکی سے باہر پھینکوں گا کیونکہ تم اس وقت ہال کے اندر ہو گے۔"

"یہی تو اس منصوبے کا خوبصورت ترین حصہ ہے۔" پیٹر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس کھڑکی کے عین نیچے... فوارہ ہے۔ اور اس کا حوض خاصا بڑا ہے۔ جب تم ہیرے کھڑکی سے باہر پھینکو گے تو وہ سیدھے حوض کے اندر جا کر گریں گے۔ فوارے کی وجہ سے پانی کے اندر چھینٹے اُڑتے رہتے ہیں۔ اس لئے حوض کے قریب پھرنے والے لوگوں کو ہرگز ہیروں کے گرنے کا پتہ نہیں چلے گا اور سطح پر سے اُنکے نظر آنے کا بھی کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ پانی کی طرح شفاف ہوتے ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" جونی نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ جب حوض پر دھوپ پڑے گی تو...؟"

"اول تو حوض کی تہہ تک دھوپ پہنچتی ہی نہیں۔" پیٹر نے کہا "لیکن اگر دھوپ وہاں تک پہنچ بھی جائے تو جب تک کسی کو معلوم نہ ہو کہ تہہ میں ہیرے پڑے ہیں، کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ ویسے بھی ہم انھیں زیادہ دیر تک وہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔"

جونی نے سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "بات تو معقول ہے۔ اس منصوبے پر عملدرآمد کب کیا جائے گا؟"

پیٹر نے مسکراتے ہوئے بیئر کا گلاس بلند کیا اور کہا۔ "کل۔"

□□

ٹھیک سوا بارہ بجے جونی شاہانہ انداز میں ڈائمنڈ شاپ کے اندر داخل ہوا۔ اس وقت وہ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اسکے چہرے پر زبردست سنجیدگی اور متانت نظر آرہی تھی، گویا وہی اس پوری عمارت کا مالک تھا۔ دروازے پر موجود باوردی چوکیدار نے قدرے خم ہو کر دروازہ کھولا اور با ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

پیٹر پیچوم بال فرسے سے جونی کی حرکات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اسٹور کا بیرونی دروازہ شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اندر ہونے والی تمام کارروائی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ جیسے ہی جونی حسب پروگرام کھڑکی کے سامنے والے کاؤنٹر پر پہنچا ایک مستعد سیلز مین لپک کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر پیٹر نے اطمینان کا سانس لیا کہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

پھر جیسے ہی سیلز مین نے جونی کے سامنے ہیروں کی ٹرے رکھی پیٹر ٹہلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر کے سامنے پہنچ کر وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ ایک سیلز مین اور چوکیدار جلدی سے اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ سیلز مین نے جھک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب! آپکی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"م م... میں ٹھیک ہے سانس... اوہ پانی... میرا... دم گھٹ رہا ہے۔" چوکیدار جلدی سے پانی کا گلاس بھر لایا۔ پیٹر نے رک رک کر پانی پی لیا پھر اس نے سر اٹھا کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور بولا۔ "شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی دل کی تکلیف ہو جاتی ہے... شکریہ!"

"ٹھہرئیے جناب میں آپ کے لئے کرسی لے آتا ہوں۔" ایک سیلز مین نے کہا۔ "شاید آپ خریداری کے لئے تشریف لائے تھے؟"

"شکریہ... میرا خیال ہے کہ مجھے گھر جانا چاہیئے۔" وہ کھڑا ہو گیا اور کوٹ جھاڑتا ہوا بولا۔ "آپ صاحبان کا بہت بہت شکریہ میں پھر کسی وقت آجاؤں گا۔"

یہ کہتا ہوا وہ دھیرے دھیرے دروازے کی جانب بڑھنے لگا اس نے جونی کی طرف دیکھنے کی حماقت نہیں کی۔ تاہم اسے امید تھی کہ ہیرے حوض میں پہنچ چکے ہوں گے۔ لفٹ میں بیٹھ کر وہ نیچے آگیا اور ٹہلتا ہوا فوارے کے قریب پہنچ گیا۔ حوض کے ارد گرد دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں بیٹھی لنچ کر رہی تھیں۔ ان کے چاہنے والے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ بابو لوگ ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ فوارے کا پانی چھینٹے اُڑاتا ہوا واپس حوض میں گر رہا تھا۔ پیٹر کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ہیرے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوائے چھوٹے چھوٹے سکوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ بہرحال یہ بات خوش کن تھی کہ باہر سے دیکھنے پر ہیرے نظر نہیں آرہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد وہ گھر چلا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پولیس جونی سے پوچھ گچھ کر رہی ہوگی دو گھنٹے بعد جونی نے فون کیا۔

"سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "پولیس کسی طرح چھوڑنے پر تیار نہ تھی لیکن ثبوت کے بغیر وہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔"

"یہ بتاؤ کام ہو گیا کہ نہیں...؟"

"بالکل ہو گیا۔" جونی نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ انھوں نے لنچ کے لئے مجھے وہاں روک لیا تھا۔ ایسے کرو ایک گھنٹے کے بعد روبی اسنیک بار میں ملو۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس میرے پیچھے نہ لگی ہو۔"

ایک گھنٹے کے بعد دونوں روبی اسنیک بار میں اکٹھے ہوئے جونی نے پیٹر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "دوست معاملہ بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ منصوبے کا اگلا حصہ بھی کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائیگا۔"

"پولیس کو تم نے کیا بتایا؟"

"میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے گمشدہ ہیروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" جونی نے جواب دیا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اس دوران اسٹور کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بس دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی حقیقت حال سے آگاہ ہونے کے لئے اُدھر چلا گیا۔ میرے علاوہ اسٹور کے اندر چار گاہک اور تھے۔ پولیس والے کسی ایک شخص پر بھی شک کا اظہار نہیں کر سکے۔ پھر وہ ہم پانچوں کو ایکسرے کے لئے ہیڈ کوارٹر لے گئے وہ اس بات کی تسلی کرنا چاہتے تھے کہ کسی نے ہیرے نگل تو نہیں لئے۔"

"میں بھی حیران تھا کہ اتنی دیر کہاں لگ گئی۔" پیٹر نے کہا۔

"خوش قسمتی سے مجھے سب سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔" جونی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوسرے گاہکوں کا رویہ کچھ زیادہ ہی مشکوک تھا۔ غالباً وہ گھبرا گئے تھے بلکہ ایک نے تو کسی زمانے میں کار چوری کی تھی، یہ بات ریکارڈ سے نکل آئی۔ پولیس والے یہ سمجھے کہ جو شخص کار چوری کر سکتا ہے وہ ہیرے بھی چرا سکتا ہے۔ احمق کہیں کے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اچھی طرح میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔"

"میرے متعلق کسی نے شبہے کا اظہار تو نہیں کیا؟" پیٹر نے پوچھا۔ "میں نے چونکہ گڑبڑ پھیلائی تھی اس لئے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ میں نے دانستہ یہ حرکت کی تھی۔"

"تمہارا کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔" جونی نے کہا۔ "آج رات ہیرے حوض سے نکال لیں گے اور ایک دو روز کے بعد یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

"ہیروں کی تعداد کتنی تھی...؟"

"پانچ۔" جونی نے کہا۔ "پانچوں بڑھیا کوالٹی کے تھے۔"

شام کے اخبارات نے اس "پُراسرار ڈکیتی" کی تصدیق کر دی۔ انھوں نے ہیروں کی قیمت کا تخمینہ پچیس ہزار ڈالر لگایا تھا آخر میں اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا تھا کہ پولیس مجرم کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔

آدھی رات کے قریب دونوں حوض پر پہنچ گئے۔ لیکن پیٹر جلد بازی کے حق میں نہیں تھا۔

"دوست جلد بازی میں بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری نگرانی کی جارہی ہو۔ اس لئے ایک روز انتظار کر لینا اچھا ہے۔ ہیرے بہرحال محفوظ ہیں۔"

جونی راضی ہو گیا اور دونوں واپس چلے گئے۔ اگلے روز ہیروں کی چوری کی خبر پرانی ہو گئی۔ بلکہ اس کی جگہ بنک میں ہونے والی ایک ڈکیتی نے لے لی۔

اگلی رات دونوں تقریباً تین بجے حوض کے کنارے پہنچ گئے۔ جونی ٹارچ لے کر کنارے پر بیٹھ گیا اور پیٹر جوتے اتار کر اور پتلون کے پائنچے چڑھا کر حوض میں اُتر گیا۔ فوارہ رات کو بند کر دیا جاتا تھا اس لئے حوض کے اندر گھسنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پیٹر نے دو ہیرے تو اندر جاتے ہی ڈھونڈ لئے۔ پھر تقریباً دس منٹ کے بعد تیسرا ہیرا بھی مل گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تین ہی کافی ہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "اب ہمیں چلے جانا چاہیئے۔"

"نہیں، نہیں۔" جونی نے کہا۔ "جلدی نہیں کرو۔ دو ہیروں کی قیمت کم از کم پچیس ہزار ڈالر تو ضرور ہوگی۔ ذرا اچھی طرح تلاش کرو۔"

پیٹر پھر تلاش کرنے لگا۔ دفعتاً دونوں ایک تیز روشنی میں نہا گئے۔ "خبردار" ایک آواز سنائی دی۔ "اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ کوئی حرکت نہیں کرنا۔ ہم پولیس افسر ہیں۔"

"لعنت ہو تمہاری پولیس افسری پر۔" جونی نے ٹارچ پھینک کر کہا اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن دو پولیس افسر اسکواڈ کار سے نکل کر ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ بلکہ ایک نے پستول بھی نکال لیا تھا۔ جونی نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ پیٹر نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اور حوض سے باہر نکل کر بولا۔

"آخر تم لوگوں نے ہمیں دھر ہی لیا؟"

"بالکل دھر لیا۔" پستول بردار افسر گرجا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حوض کے اندر پائے جانے والے سکے ہر ماہ خیراتی فنڈ میں دیئے جاتے ہیں۔ ان کو چرانا نہایت ہی گھٹیا حرکت ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجسٹریٹ تم دونوں کو کم از کم تین مہینے کی سزائے قید دے گا۔ اب ذرا کار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ تاکہ تم دونوں کی تلاشی لی جاسکے۔"

ابوسلمان

موسم انتہائی گرم اور حابس تھا۔ میں اپنی بینچ پر بیٹھا ہوا جنوبی پہاڑیوں پر ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسی گرم رات میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں گھس جانے کا خیال ہی پسینے میں نہلانے کیلئے کافی تھا۔ چنانچہ میں جو عموماً نصف شب تک اُٹھ جایا کرتا تھا اس توقع میں ٹھہرا ہوا تھا کہ کچھ گرمی کم ہو تو جاؤں۔ میرے سامنے کورٹ ہاؤس کی شاندار وسیع عمارت واقع تھی جس کو قصبے کے شیرف کا دفتر بھی موجود تھا۔ ایک بجے کے قریب میں نے شیرف لیرائے کو اپنے دفتر سے نکل کر اپنی کار میں جاتے دیکھا۔ جمیدار سالٹر نے جو مجھ سے عمر میں دس سال چھوٹا لیکن اپنی تجسس پسندی میں کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا ہوٹل میں اپنے کمرے سے شیرف کو نکلتے دیکھا تو باہر آ کر اس وقت تک کورٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر ہوشیار رہا جب تک شیرف واپس نہیں آ گیا۔ اس نے شیرف سے کچھ بات کی اور کسی نہ کسی طرح اس سے بہت سی باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شیرف اپنے دفتر میں گیا تو سالٹر میرے پاس آیا۔

"شیرف نے لاشیں برآمد کر لی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کیسی لاشیں؟" میں نے پوچھا۔

"جوآن برگز اور سایڈ گرینیر کی لاشیں۔" سالٹر نے جواب دیا۔ "وہ قصبے سے ایک میل کے فاصلے پر زور روڈ پر پڑی ہوئی پائی گئیں۔ دونوں کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ بالکل جے رینڈا اور ویڈنی ویلز کی طرح جنھیں گزشتہ سال قتل کیا گیا تھا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اپنے چھوٹے سے قصبے میں اس طرح کی سنگین وارداتیں مجھے افسردہ کر دیا کرتی تھیں لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بعض حالات کو معمول پر لانے کے لئے اس قسم کی سرگرمیاں لازمی حیثیت رکھتی ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ شیرف نے کلارک برگز کو گرفتار کر لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اور بس وقت اس سے گفتگو کر رہا ہے۔" سالٹر نے بتایا۔

"تمہارا مطلب ہے اس سے سوال و جواب کر رہا ہے۔؟"

"غالباً۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل کلارک نے کئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔؟"

میں نے کندھے اُچکائے۔ یہ شیرف کی دردِ سری تھی۔ میں بینچ سے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا بھئی میں تو اب اپنے گھر جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیرائے کہہ رہا تھا کہ وہ تم سے بھی بات کرنا چاہتا ہے۔" سالٹر نے بتایا۔

"وہ کیوں۔؟"

"اس لئے کہ تمہیں عموماً قصبے کے ہر معاملے سے آگاہی رہتی ہے۔ شاید وہ تمہاری گواہی لینا چاہتا ہے۔"

"کیا وہ ہمیشہ میری گواہی نہیں لیتا رہتا۔؟"

"ہاں اکثر ہوتا تو یہی ہے۔" سالٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ تم قصبے کا شعور ہو۔ کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ اگر کبھی کوئی واقعہ ہو جائے اور تم اس سے ناواقف ہو تو غالباً قصبے کے لوگ اس کی حقیقت ہی سے منکر ہو جائیں گے۔ دراصل ہم لوگ تم پر حد سے زیادہ انحصار کرتے ہیں۔"

"ہاں یہ ممکن تو ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ایک بات ہے۔" سالٹر بولا۔ "تم سے سوال و جواب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی جادو کی پٹاری لے کر بیٹھ جائے کیونکہ جس طرح اس میں سے کسی بھی لمحہ کوئی غیر متوقع چیز برآمد ہو سکتی ہے ٹھیک اسی طرح تمہارے بیان سے بھی عجیب و غریب انکشافات سننے میں آتے رہتے ہیں۔"

میں ہنسنے لگا۔ سالٹر کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ مبالغہ کرنے لگتا تھا۔

"تم بھی تو ساری شام یہاں موجود رہے تھے ممکن ہے شیرف تم سے بھی کچھ معلوم کرنا چاہے۔" میں نے کہا۔

"میری ایسی قسمت کہاں۔" سالٹر نے منہ بنایا۔ "بینچ پر بیٹھنے والوں کے چودھری تو تم ہو۔ کیا تم اس وقت لیرائے سے ملنے جاؤ گے؟"

میں نے شیرف کے دفتر کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے ایک جماہی لی۔

"آج کی رات اس کی مصروفیت کافی سے زیادہ ہے۔ میں اس میں اور اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔"

اس رات مجھے مشکل سے نیند آئی۔ کمرے میں ہوا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں نے بستر پر لیٹے ہوئے کلارک برگز اور اس کی اس مصیبت کے بارے میں سوچا جس میں وہ پھنس گیا تھا۔ قصبے میں کوئی فرد اس بات پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں تھا کہ اگر کلارک کو اپنی بیوی اور ایڈگرینر کے تعلقات کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا تو وہ انھیں فراخ دلی سے معاف کر دیتا۔ کلارک بے حد جذباتی اور گرم مزاج آدمی تھا۔ ایسی بات پر اس کا اشتعال میں آنا لازمی تھا۔ چنانچہ قصبے کے لوگ صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ یہ قتل صرف کلارک ہی کر سکتا ہے۔

قصبے میں کلارک کی شہرت کچھ اسی قسم کی تھی۔ وہ بچپن ہی سے کینہ پرور اور تند خو واقع ہوا تھا۔ اور اپنی اس گرم مزاجی کی بدولت اکثر حادثات میں ملوث ہوتا رہتا تھا جو شیرف کو مسلسل مصروف رکھتے تھے۔ اگر ایڈگرینر اس قصبے کا باشندہ ہوتا تو اسے بھی کلارک کی فطرت کا اندازہ ہو جاتا اور وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا لیکن اسے اور اس کی بیوی ایکیلی کو قصبے میں آئے بمشکل چھ ماہ گزرے تھے اور جب ہی سے دونوں میاں بیوی ہوٹل میں مقیم تھے۔

کورٹ ہاؤس کے سامنے میدان میں پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھے ہوئے میں نے ان حالات کو اپنی نظروں سے پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ اس معاشقے میں کوئی انوکھی یا غیر معمولی بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ جوآن اور ایڈ اس سلسلے میں دوسرے جوڑوں سے کچھ زیادہ لاپرواہ واقع ہوئے تھے۔ میں اس قسم کے کھیل گزشتہ بیس سال سے دیکھ رہا تھا اور یہ سب باتیں مجھے پسند نہیں تھیں۔ اس سے قبل میں آرمی میں تھا جہاں سے مجھے دو سال پہلے ہی ریٹائر کر دیا گیا تھا کیونکہ میرا ایک بازو ایک اتفاقاً پھٹ جانے والے بم کی زد میں آ گیا تھا اور کہنی کے پاس سے غائب ہو گیا تھا۔

ہمارے اس قصبے میں مجھ جیسا ایک بازو سے محروم ادھیڑ عمر آدمی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لئے روپے پیسے کی کوئی تنگی نہیں تھی لیکن شغل بیکاری کے طور پر میں نے کوئی ملازمت تلاش کرنا چاہی تو اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ اس بینچ پر بیٹھ کر گزارنے لگا۔ اور یہ بات مجھے اتنی دلچسپ معلوم ہوئی کہ میں نے ملازمت کی مزید تلاش ترک کر دی۔ اگر آج سے بیس سال پہلے کوئی یہ کہتا کہ سارجنٹ جمیس منرو مستقبل میں ایک بوڑھا اور کسی قدر نکما بینچ پر بیٹھنے والا ثابت ہوگا تو میں شاید اس وقت اس کا مذاق اُڑاتا اور اسے پاگل قرار دیتا۔ لیکن عملاً ایسا ہی ہوا تھا۔ بیس سال کے طویل عرصے میں میرے دیکھتے دیکھتے ایک نئی نسل پروان چڑھ چکی تھی جو مجھے بینچ پر بیٹھنے کی عادت کی وجہ سے بینچر منرو کے نام سے جانتی تھی۔

جتنا وقت میں اس بینچ پر گزارا کرتا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ قصبے کے بہت کم راز ایسے تھے جو مجھے معلوم نہ ہوں۔ وہ قطعۂ زمین جہاں میں بیٹھتا تھا قصبے کے بالکل مرکز میں واقع تھا اور قصبے کے ایک سرے سے دوسرے کنارے تک جانے کیلئے ہر فرد کو میری بینچ کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ چاہے وہ کار میں ہو یا پیدل جا رہا ہو۔ مجھے تسلیم کریں بینچ پر بیٹھنے کو اپنے چھوٹے سے کمرے میں رہنے کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ دلچسپ کو

ایک ایسے شخص کی
عجیب و غریب کہانی
جو بزعم خود پورے علاقے کیلئے
خدا کا فوجدار تھا!

کرتا تھا کیونکہ میرے چاروں طرف شاذ و نادر ہی بات کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا رہتا تھا۔ خاص طور سے اس ہوٹل میں جو شیرف کے دفتر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ لوگ آتے تھے۔ لوگ جاتے تھے۔ مدیہ کہ بس اسٹاپ بھی وہیں تھا جہاں بسیں اپنے کچھ مسافروں کو اتارتی تھیں اور کچھ کو ان کی جگہ بٹھا کر آگے بڑھ جاتی تھیں اور اگر آدمی اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اسے دیکھنے کیلئے بہت کچھ مل جاتا تھا۔

جب میں دوسرے دن اپنی نیند سے جاگا تو گرمی کے علاوہ قصبے کو تجسس کی ایک لہر نے بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ان کی دلچسپی دوسرے معاملات سے کم ہو گئی تھی اور وہ اس طرح معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اگر کلارک نے جوآن اور ایڈ کو قتل نہیں کیا تھا تو پھر ان کا قاتل کون ہے۔؟

شیرف لیرائے مجھے اپنے دفتر میں ہی مل گیا۔ اس کے سیاہ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور دبلے پتلے چہرے سے فکرمندی و تشویش عیاں تھی۔ اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"بہت گرمی ہے مینیجر۔" وہ بولا۔ اور میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

"ممکن ہے کل رات تم نے کوئی خاص بات دیکھی ہو مینیجر۔" اس نے کہا۔

"مثلاً کیا۔؟"

"کلارک کا دفتر قصبے کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ اور ریڈ لاڈ مشرق میں ہے۔ وہاں جانے کے لئے اسے کورٹ ہاؤس اسکوائر کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیا تم نے اسے دیکھا تھا۔"

میں اپنی چھڑی اٹھا کر اس کی نوک کو غور سے دیکھنے لگا۔ میرے اندر ایک خاص بات یہ تھی کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

"ہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اس وقت کیا ٹائم تھا۔؟" لیرائے نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اسے دو مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ آٹھ بجے اور دوسری بار دس بجے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں دس بجے کے بارے میں یقین ہے۔؟" لیرائے کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔

"کیا اس کی کوئی خاص اہمیت ہے۔؟" میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

"ہاں یہ بہت اہم ہے۔" لیرائے نے بتایا۔ "اگر کلارک بوقت واردات سے اپنی عدم موجودگی کا کوئی جواز پیش کرتا ہے تو تم نے بھی اس امکان کو بالکل ختم کر دیا۔ پولیس سرجن کا کہنا ہے کہ جوآن اور ایڈ گزشتہ رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان قتل کئے گئے ہیں۔ اگر دس بجے تم نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ یہ جرم کر سکتا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی جوآن کو غائب پایا۔ وہ اس کی تلاش میں نکلا۔ اسے ایڈ کے ساتھ دیکھا اور دونوں کو شوٹ کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے کلارک کی بیوی اور ایڈ کو بھی دیکھا ہوگا۔"

"وہ دونوں دس بجے سے کچھ پہلے گزرے تھے۔" میں نے بتایا۔

"مجھے بھی اسی بات کا اندیشہ تھا۔" لیرائے کا دبلا پتلا چہرہ کچھ اور فکرمند ہو گیا۔

"تم کوئی اور بات تو معلوم کرنا نہیں چاہتے۔؟" میں نے پوچھا۔

"سر دست تو نہیں۔ لیکن خیال ہے کہ تمہیں بطور گواہ عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔"

"کیا استغاثہ کی جانب سے نیلز ینگ اس مقدمے کی پیروی کرے گا۔؟" میں نے پوچھا۔

"اور کون کر سکتا ہے۔" لیرائے نے کچھ ترش لہجے میں کہا۔ "وہ بھلا ایسا یقینی مقدمہ جیتنے اور اپنے ریکارڈ میں ایک شاندار اضافے کے موقع کو نظر انداز کر سکتا ہے۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی کلارک کو مجرم قرار دے دیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس کے علاوہ کون قاتل ہو سکتا ہے۔ اسے موقع بھی حاصل تھا۔ قتل کا مقصد بھی واضح ہے اور آلۂ قتل سے اس کا تعلق بھی ظاہر ہوتا ہے۔"

"تو کیا جس ریوالور سے گولی چلائی گئی وہ کلارک کا ریوالور تھا۔؟"

"ابھی یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کیونکہ وہ ریوالور پولیس کو نہیں مل سکا ہے۔ کلارک کا بیان ہے کہ اسے ریوالور کے بارے میں کچھ یاد نہیں آتا کہ وہ گھر میں سے کہاں غائب ہو گیا ہے۔" لیرائے نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس وقت اس جگہ جا رہا ہوں جہاں مجھے ان کی کار ملی تھی۔ ممکن ہے ہمیں ریوالور بھی ہاتھ آ جائے۔"

"اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔" میں بولا۔ "وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری تحقیقات میں حارج نہیں ہوں گا۔"

"گویا آج اتنی گرمی ہے کہ تم حسب معمول اپنی بینچ پر نہیں بیٹھنا چاہتے۔" لیرائے مسکرایا۔

"ہاں اور ممکن ہے کہ دریا کے کنارے اتنی گرمی نہ ہو۔" میں نے تسلیم کیا۔

کار سڑک سے ایک جانب ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے دریا کا کنارہ تقریباً پچاس فٹ دور تھا۔ گھاس کہیں بہت زیادہ گنجان تھی اور کہیں بہت کم۔ کار کے ٹائروں کے نشان اب بھی سرخ رنگ کی مٹی میں کہیں کہیں جہاں گھاس نہیں تھی۔ نظر آ رہے تھے۔

"یہ ہی مٹی کلارک کے جوتوں پر بھی پائی گئی ہے۔" لیرائے نے بتایا۔

"یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے۔ مگر یہ ایک اور نکتہ ہے جو کلارک کے خلاف جاتا ہے۔" لیرائے نے کہا۔

وہ زمین پر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر اس نے براؤن رنگ کے کاغذ کی ایک چھوٹی سی تھیلی اٹھائی۔ اسے دیکھا۔ اور پھر پھینک دیا۔ میں دریا کے کنارے جا کر کھڑا ہو گیا اور ایک پتھر پانی میں پھینک کر اس سے پیدا ہونے والی لہروں کو پھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں بھی کچھ ایسی ٹھنڈک نہیں تھی۔ ہوا بھی بہت ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ لیرائے کو ریوالور نہیں مل سکتا خواہ وہ کتنا ہی تلاش کرے۔ اگر کسی کو ریوالور جیسی چیز سے چھٹکارا پانا ہی تھا تو اسے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر جتنی دور اسے پھینک سکتا ہو دریا میں پھینک دے۔ دریا کی تہہ کی مٹی بہت نرم اور دلدلی تھی۔ ماہر سے ماہر غوطہ خور کے لئے بھی اس نرم مٹی میں جہاں کوئی بھاری چیز گرتے ہی اندر دب جائے۔ ریوالور کو تلاش کرنا ایک امر محال تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس وقت سرکاری وکیل نیلز ینگ کے دماغ میں کس قسم کے خیالات موجود ہوں گے۔ آلۂ قتل کو پیش کئے بغیر عدالت سے کلارک کو سزا دلوانا خاصا مشکل کام تھا بشرطیکہ اس کے پاس کوئی اور ٹھوس ثبوت یا گواہ نہ ہو جس کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔

میں نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ یہ بہرحال نیلز کا کام تھا۔ میں اس کے بارے میں خواہ مخواہ سوچ کر اپنا ذہن کیوں تھکاؤں وہ کاؤنٹی کا سرکاری وکیل تھا اور مجھ سے بہتر طور پر یہ جانتا تھا کہ اس کے پاس کسی کو مجرم قرار دلوانے کیلئے کافی ثبوت و شواہد موجود ہیں یا نہیں۔

"ریوالور کی تلاش کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے۔" میں نے لیرائے سے کہا۔ "میں پیدل ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

سڑک پر آ کر میں نے جوتوں پر لگی ہوئی مٹی پیر پٹک کر جھاڑی۔ کلارک کے جوتوں پر دریا کی مٹی کا پایا جانا کوئی مضبوط دلیل نہیں تھا بہت سے لوگوں کے جوتے اس مٹی سے آلودہ ہو سکتے تھے۔ اگر کل رات کوئی میرے جوتوں کو دیکھتا تو مجھے محض دریا کی مٹی ان پر موجود ہونے کی وجہ سے مشتبہ خیال کر لیا جاتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں کسی طرح کلارک کی مدد کر سکتا ہوں۔ ہم دونوں کے تعلقات اس کے بچپن سے ہی خاصے اچھے تھے۔ اور یہ وقت ایسا تھا جب اسے ہمیشہ سے زیادہ کسی دوست کی ضرورت تھی۔

ممکن ہے یہ گرمی کا اثر ہو لیکن مجھے کھانے میں کوئی مزہ نہیں آ رہا تھا۔ اور بینچ پر بیٹھنے سے بھی کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جیسا کہ میرا خیال تھا قصبے کے لوگوں کی باہمی گفتگو کے لئے صرف دو موضوعات رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک تو کلارک برگز تھا اور دوسرا موسم۔ اور اگرچہ بیشتر لوگوں کو یقین تھا کہ کلارک ہی قاتل ہے لیکن اس کے باوجود میں نے اس شام کسی جوڑے کو دریا کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ ایک دن شیرف لیرائے میرے پاس آیا اور بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے مجھے گواہوں کا سمن پکڑا دیا۔

"یہ تمہارا سمن ہے مینیجر۔" اس نے کہا۔ "مقدمے کی سماعت کل سے شروع ہو رہی ہے۔"

"نیلز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مجھے اپنے گواہ کے طور سے پیش کرنا چاہتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ اتنا ہی اہم ہے۔"

"نیلز کا خیال ہے کہ اسے اپنا کیس ثابت کرنے کے سلسلے میں جتنی بھی مدد مل سکے اچھا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ وکیل صفائی ڈیوس رینر کو مقرر کیا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی وکیل کلارک کو سزا سے بچا سکتا ہے تو وہ ڈیوس ہی ہے۔"

”کلارک کے باہر سے در آمد شدہ وکیل صفائی کو بھول جاؤ“ لیرائے بولو۔ ”اگر کلارک بری کر دیا گیا تو اس کا مقدمے کی کارروائی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس نے جو کچھ کیا ایک غیرت مند شوہر کو اس موقع پر وہی کرنا چاہئے تھا۔ وہ اسے حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی کہ کچھ ایسے ہی خیالات رکھنے والے افراد جیوری کے ممبر کی حیثیت سے منتخب کر لئے جائیں۔“

کئی سال پہلے کی بات ہے کہ کاؤنٹی کو کہیں سے اتنی رقم مل گئی کہ اس نے کورٹ ہاؤس کو ایئر کنڈیشنڈ کرا دیا تھا چنانچہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہجوم مقدمے کی کارروائی سننے کیلئے آیا تھا یا وہ اس وجہ سے آیا تھا کہ اسے کلارک کے مقدمے سے کوئی دلچسپی تھی یا یہ کہ لوگ اس بہانے گرمی سے بھاگ کر کمرۂ عدالت کی ٹھنڈی فضا سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ اس قدر ہجوم تھا کہ نہ صرف تمام نشستیں بھر گئی تھیں بلکہ لوگ دیوار کے ساتھ ساتھ قطار میں بھی کھڑے ہوئے تھے۔

نیلز نے اپنا کیس بڑی احتیاط کے ساتھ پیش کیا۔ کوئی معمولی سے معمولی بات بھی نظر انداز نہیں کی۔ اور اس وقت تک جبکہ اس نے مجھے گواہی کے لئے طلب کیا، کمرۂ عدالت میں موجود ہر فرد یہ خیال کر رہا تھا کہ نیلز اپنا مقدمہ جیت کر رہے گا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ جج صاحب کلارک کو کتنی سزا سناتے ہیں۔ گواہوں کے کٹہرے سے میں نے ہجوم کی طرف دیکھا۔ کلارک بڑی سنجیدگی و متانت کا پیکر بنا بیٹھا۔ اس کے پیچھے شیرف لیرائے کے چہرے سے معمولی فکرمندی کے تاثرات نمایاں تھے۔ کلارک کے برابر اس کا وکیل ڈریوس بیٹھا تھا۔ اس کے بال بالکل سفید تھے اور وہ تقریباً میرا ہم عمر معلوم ہو رہا تھا پھر نیلز تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ غالباً یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اس کا کیس کس عمدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ مقتول ایڈگر منر کی بیوی ایمیلی بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید نظر آ رہا تھا۔

نیلز نے اپنے ابتدائی سوالات بڑی تیزی سے ختم کر دیئے اور پھر اہم سوال پر آیا جس کے جواب میں میں نے بتایا کہ میں نے بلاشبہ کلارک کو دس بجے گزرتے دیکھا تھا۔ اس سوال کے بعد نیلز نے گھوم کر ڈریوس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اب تم جرح کے سوالات کر سکتے ہو۔“

ڈریوس میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور مجھے یہ احساس ہوا کہ اس شخص کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مجھے کوئی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔

”تمہیں جینجر کہا جاتا ہے؟“ وہ بولا۔ ”کیا اس لئے کہ تم اپنا بیشتر وقت کورٹ ہاؤس کے سامنے میدان میں پڑی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ کر گزارتے ہو؟“

میں نے تسلیم کیا کہ یہی بات ہے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ قصبے میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ بہت کم تمہاری نظروں سے اوجھل رہتا ہوگا۔“

”ہاں اگر اس کیلئے میں کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کرتا۔“

”میں نے سنا ہے کہ بینچ پر بیٹھے ہوئے تم کبھی کبھی اونگھ بھی جاتے ہو؟“

”ہاں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب میری آنکھیں دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہیں۔“

کمرۂ عدالت میں ایک ہلکا قہقہہ پڑا۔

”تب پھر یہ ممکن ہے کہ تم اس رات بھی اونگھ گئے ہو اور وقت کے بارے میں غلطی کر بیٹھے ہو۔“

”جب میرے سامنے کورٹ ہاؤس کا اتنا بڑا کلاک لگا ہو تو وقت کے بارے میں کسی غلطی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اگر تم اتنے ہی ہوشیار تھے تب پھر ہمیں یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے علاوہ اور کیا کچھ دیکھا؟“ ڈریوس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے اس سوال پر اعتراض ہے حضور والا۔“ نیلز نے فوراً کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنے سوال کو دوسرے انداز میں پوچھ سکتے ہیں۔“ جج صاحب نے فیصلہ دیا۔

ڈریوس میری طرف دیکھ کر دوبارہ مسکرایا۔

”مسٹر منرو کیا تم نے اس رات دس بجے کسی اور کو بھی دیکھا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

میں اس معاملے کو اس طرح سامنے لانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرے پاس دوسرا چارۂ کار نہیں تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بات بیان کرے۔ کیونکہ میں اس کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کسی کے ساتھ جھوٹ بولنا بھی میرے لئے ممکن نہ تھا۔ ڈریوس نے میری ہچکچاہٹ سے محسوس کر لیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔

”تم جواب کیوں نہیں دیتے۔؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ رات کے دس بجے؟“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے وضاحت چاہی۔

”ہاں دس بجے۔“

”ایک تو ایمیلی گرینر کو دیکھا تھا۔“

نیلز اچھل کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”مسز گرینر دھیں قریب میں واقع ہوٹل میں رہتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”چنانچہ اسے دیکھنا قطعی ایک فطری بات تھی۔“

لیکن ڈریوس نے سمجھ لیا تھا کہ اگر میرا ایمیلی کو دیکھنا ایک فطری بات ہوتی تو میں کبھی اس کا ذکر نہ کرتا۔

”کیا یہی بات تھی جینجر؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیا مسز گرینر قطعی

فطری انداز میں دکھائی دے رہی تھی؟“

”یہ اس بات پر منحصر ہے کہ تم اس بات کو کس انداز سے دیکھتے ہو۔“

”تم نے اسے کس انداز میں دیکھا تھا۔؟“

”مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اسے دیکھے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہوٹل کے عقبی دروازے سے باہر آئی اور اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔“

”کس سمت میں۔؟“

”مشرق کی جانب۔“

”کیا رورر روڈ کی طرف۔؟“

”ہاں۔“

”کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنے شوہر اور مسز ہرگز کا تعاقب کر رہی تھی۔؟“

”میں اس سوال پر اعتراض کرتا ہوں۔“ نیلز چیخا۔ ”یہ گواہ سے اس کا ذاتی خیال معلوم کرنا ہے۔“

”اعتراض درست ہے۔“ جج صاحب نے کہا۔

اب پورے کمرۂ عدالت میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

”لیکن وہ ان کے پیچھے ہی روانہ ہوئی تھی؟“ ڈریوس نے پھر پوچھا۔

”وہ اسی طرف گئی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ نیلز دوبارہ اعتراض کرنے کھڑا ہو گیا۔

”حضور والا یہاں مسز گرینر پر مقدمہ نہیں چل رہا ہے۔“

”جبکہ مقدمہ اسی پر چلنا چاہئے تھا۔“ ڈریوس بڑبڑایا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

”کیا تم نے اسے واپس آتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں اب کوئی اور سوال کرنا نہیں چاہتا۔“ ڈریوس نے کہا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور گواہوں کی کرسی سے نیچے اتر آیا۔ نیلز کھڑا ہو گیا۔ کمرۂ عدالت میں دفعتاً خاصا شور ہونے لگا تھا جسے جج صاحب اپنا ہتھوڑا میز پر بجا کر خاموش کرانا چاہتے تھے۔ نیلز نے اسی ماحول میں چیختے ہوئے کہا کہ وہ معزز عدالت سے سردست مقدمہ کی سماعت ملتوی کرنے کی درخواست کرتا ہے۔

* * *

بینچ پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا سو رہے ہو۔؟“ سالٹر کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"نہیں ابھی تو نہیں سو رہا۔" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے نیلز کے کیس کا کباڑا کر دیا ہے۔" سالٹر نے کہا۔

"اسے پورا موقع حاصل تھا کہ وہ خود مجھ سے یہی سوال کرتا۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات کہنے کی کوشش نہیں کرتا۔ مجھے افواہیں پھیلانا پسند نہیں ہے لیکن اسے اپنی فتح کا اتنا یقین تھا کہ اس نے کچھ اور سوچنے یا پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔"

"تو تمہارے خیال میں ایملی نے اپنے شوہر اور جوآن کو قتل کیا ہے؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کلارک کو تو اب شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا جائے گا۔"

"بہت سے لوگ نہیں چاہتے تھے کہ اسے سزا دی جائے۔"

"اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" سالٹر ہنسنے لگا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تم اس قصبے کا شعور ہو۔ لیرائے اور نیلز کلارک کو مجرم ثابت کرنے کے لئے اس قدر بے چین تھے کہ انھوں ایک لمحے کے لئے بھی اسے بےگناہ خیال کرنے کا تصور نہیں کیا۔ اگر وہ تم سے وہی سوال کرتے جو ڈیوس نے کیا تو یقیناً تم انھیں بتا دیتے۔"

"تم نے سوالات کر کے میرا دماغ چاٹ لیا۔" میں نے کچھ ناگواری سے کہا۔ "اب دفع ہو جاؤ اور مجھے سونے دو۔"

جیسا کہ میں نے کہا تھا اس بینچ پر بیٹھنے کے بعد آدمی خود کو اپنے گرد و پیش ہونے والی سرگرمیوں میں حصہ دار محسوس کرنے لگتا ہے اور مجھے بھی یہی بات پسند تھی۔

اب جب مقدمے کی سماعت دوبارہ شروع ہوگی تو کچھ مزید سوالات کیے جائیں گے۔ ایملی سے پوچھا جائے گا کہ وہ اس رات کہاں گئی تھی۔ اور مجھے شبہ تھا کہ وہ اس سوال کا جواب دینا چاہے گی جس دن سے اس نے قصبے میں قدم رکھا تھا تقریباً اسی دن سے اس کا شیرف لیرائے سے رومان چل رہا تھا۔ اور وہ دونوں اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ عام لوگوں کو اس بارے میں کچھ بھی معلوم ہو۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے اس معاملے میں بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ لوگ ہمیشہ معاملات کو اتنا الجھا دیا کرتے ہیں کہ مجھے انھیں درست کرنے میں خاصی مشکل پیش آتی ہے۔ کبھی میں ایک گمنام فون کال کر دیتا ہوں یا کوئی گمنام خط لکھ دیتا ہوں۔ اور کبھی کبھی ایک احتیاط سے سوچی ہوئی کہانی مشہور کرنا پڑتی ہے۔

لیکن کبھی معاملات ایسے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے کسی بات سے کام نہیں چلتا۔ جوآن اور ایڈمیری ان تمام کوششوں کے باوجود اپنی عشق بازی سے باز نہیں آئے۔ چنانچہ مجھے انھیں سزا دینے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑی۔ اس توقع میں کہ قصبے کے لوگ ان کے انجام سے عبرت پکڑیں گے۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ میں اس سلسلے میں کبھی پکڑا جا سکوں گا۔ کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ خود میں اس رات کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ اور نہ ہی کسی کے دماغ میں اس سوال کا پیدا ہونا بظاہر ممکن تھا۔ اسی وجہ سے مجھے اس بات میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ میں کلارک کا ریوالور چھپا کر ایک محفوظ مقام پر دفن کر دوں۔ اور تب پھر موقع ملنے کا انتظار کروں۔ اس رات میں نے انھیں کار میں ریور روڈ کی طرف جاتے دیکھا۔ فاصلہ ایک میل سے زیادہ نہیں تھا اس لئے خود بھی پیدل ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میں نے وہاں پہنچ کر وہی کچھ دیکھا جسے دیکھنے کی توقع تھی۔ میرا اپنا اعشاریہ ۴۵ بور کا ریوالور کاغذ کی ایک تھیلی میں رکھا ہوا میرے کٹے ہاتھ کی بغل میں پوشیدہ تھا۔

میں کلارک کے لئے کوئی پریشانی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا مجھے امید تھی کہ آلۂ قتل کی عدم موجودگی میں وہ احمق نیلز، کلارک پر مقدمہ چلانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ چنانچہ میرے لئے یہ بات خاصی دشوار ثابت ہوئی کہ میں اسے آزاد بھی کرا دوں اور خود اپنے آپ پر بھی حرف نہ آنے دوں۔ یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ ڈیوس نے بالکل صحیح قسم کے سوالات پوچھے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ قصبے کے لوگ بہت جلد اس حادثے کو بھول جائیں گے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ جلد یا بدیر مجھے پھر کسی اور کو سزا دینا پڑے گی۔ جیسا کہ بیس سال سے کرتا چلا آ رہا ہوں۔ اب تک کتنے لوگوں کو اس طرح سزا دے چکا ہوں۔؟ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا لیکن گرمی اتنی زیادہ تھی کہ میں اصل تعداد یاد کرنے سے قاصر رہا۔ میں نے اپنی پسینے میں بھیگی ہوئی قمیض کے گریبان کے بٹن کھول دیئے۔

میں صرف ایک بینچر تھا۔ ایک سست، آرام طلب بوڑھا آدمی جو ایک بینچ پر بیٹھ کر قصبے کے لوگوں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ میں نے اس قسم کے کام کا کبھی تصور تک نہیں کیا تھا لیکن مجھے یہ بات معلوم کرنے میں زیادہ دن نہیں لگے کہ میرے قصبے کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ اگرچہ سالٹر نے یہ بات محض مذاق میں کہی تھی لیکن اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کس قدر حقیقت بیانی سے کام لے رہا ہے۔ میرے بغیر یہ خوبصورت، صاف ستھرا چھوٹا سا قصبہ ہر بات کے صحیح شعور و ادراک سے محروم رہتا۔ میں اس قصبے کا شعور تھا، ضمیر تھا، احساس تھا۔

میں نے بینچ پر سر رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو ایسی اہم بات نہ ہوگی جسے میں دیکھنے سے محروم رہ جاؤں گا۔ اس قدر گرمی میں دوپہر سے سہ پہر تک عموماً کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوا کرتی۔

سکون کے تاجر
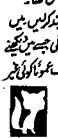
والمر ایک کاروباری علاقے میں دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑکوں پر بڑے اطمینان سے چل رہا تھا۔ اگرچہ اس کی عمر صرف اڑتالیس سال تھی لیکن اس کے سفید بال اور آگے کو جھکے ہوئے کندھے اسے اپنی عمر سے بیس سال زیادہ ظاہر کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ گرد و پیش ہر شے کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا اس نے دیکھا کہ اس سے چند قدم آگے ایک نوجوان جوڑا ایک بچہ گاڑی دھکیلتا جا رہا ہے۔ بچے نے نیلے رنگ کی فراک پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا جھنجھنا دبا ہوا تھا۔ اس کے والدین اگرچہ معمولی قیمت کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے مگر ان کے کپڑے صاف ستھرے اور انداز شریفانہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے قدم بڑھا رہے تھے جب وہ ایک فرنیچر کی دکان کے شوکیس کے پاس کچھ دیکھنے کے لئے رکے تو والمر جلدی سے قدم بڑھا کر ان کے قریب پہنچا۔ پہلے اس نے بچے کو چند لمحے دیکھا پھر جب بچے کے والدین اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ پلٹ کر ان سے مخاطب ہوا۔

"یہ بچہ تمہاری طرح تو نہیں معلوم ہوتا۔" اس نے شوہر سے کہا۔

نوجوان شوہر نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر سوالیہ انداز میں اپنی نظریں والمر کی طرف اٹھائیں۔

"یہ لڑکا تمہاری طرح نہیں معلوم ہوتا۔" والمر نے بچے کی طرف اشارہ!

کرتے ہوئے پھر کہا: "تمھاری اور تمھاری بیوی کی آنکھیں نیلی ہیں جبکہ بچے کی آنکھیں بھوری رنگت کی ہیں۔ تمھیں یقین ہے کہ یہ تمھارا ہی لڑکا ہے؟"

بیوی کچھ گھبرائے ہوئے انداز میں مسکرائی اور اپنے شوہر کے بازو سے چمٹتے ہوئے بولی: "ہسپتال میں غلطیاں تو نہیں ہوا کرتیں۔" اس نے کہا

"لیکن لوگوں سے غلطیوں کا صدور ممکن ہے۔" والمر نے جواب دیا

"دیکھو مسٹر..." اس نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ والمر نے بات کاٹ دی

"کیا تمھیں یقین ہے کہ یہ تمھارا اپنا بچہ ہے؟" وہ پھر بولا

نوجوان نے غصے میں بھر کر والمر کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا۔ لیکن والمر نے خود کو چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس نے بڑے اطمینان سے، خوف کے کسی شائبے کے بغیر، نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے دیکھا

"اگر تم بوڑھے نہ ہوتے تو میں تمھاری ہڈیاں توڑ ڈالتا۔" اس نے غصے سے کہا، مگر والمر پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔

"واقعی بہت بہادر آدمی ہو۔" وہ بولا۔ "مگر عقل کا خانہ خالی ہے۔ ورنہ ضرور سوچتے کہ بچہ تمھارا ہے یا نہیں؟"

نوجوان نے والمر کو زور سے دھکا دے کر چھوڑ دیا۔ والمر چند قدم لڑکھڑایا، پھر سنبھل کر چلا گیا اور پھر اس طرح جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو، گھوم کر دوسری طرف چل دیا۔

"آخر اس بوڑھے کا مطلب کیا تھا ہارلی...؟" اس نے اپنے پیچھے بیوی کو شوہر سے پوچھتے سنا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ بلند ہوتی ہوئی آواز میں مسلسل یہی سوال پوچھتی گئی۔ اس طرح جیسے اسے خود سوال کا جواب معلوم تھا مگر وہ اسے اپنی زبان سے ادا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ والمر نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور لاپروائی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

کافی دور جا کر وہ رکا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی نوٹ بک نکال کر اس میں کچھ لکھا۔ اور پھر آگے چلنے لگا۔ پھر اس کی توجہ ایک شاندار قیمتی کار نے اپنی طرف کھینچ لی جو آگے موڑ کے نزدیک سڑک کے ایک جانب رک رہی تھی۔ کار رکی تو اس میں سے ایک طویل قامت آدمی نیلے رنگ کی اسپورٹ جیکٹ پہنے ہوئے نیچے اترا۔ اس نے اپنی گردن میں ایک زرد رنگ کا ریشمی رومال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ کار کے سامنے سے گزرا تو اپنا سیدھا ہاتھ کار کی باڈی پر بڑے فخر و پیار کے انداز میں پھیرا۔ یوں جیسے وہ کار نہ ہو کوئی حسین لڑکی ہو جس کی رفاقت اس کے لیے باعثِ افتخار ہو۔

والمر اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک وہ آدمی ایک اسٹور کے اندر نہیں چلا گیا۔ پھر اس نے تیزی سے سڑک پار کی اور کار کے قریب آیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک ناخن گھسنے کی ریتی نکالی اور اسے اس طرح مٹھی میں پکڑ لیا کہ اس کا نچلا سرا باہر نکلا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ نیچا کر کے مٹھی اپنی ٹانگ کے ساتھ لگا لی۔ اور کار سے بالکل لگتا ہوا اس طرح آگے بڑھا کہ نوک دار ریتی شاندار پینٹ میں ایک گہری لکیر بناتی چلی گئی۔

وہ اسی طرح اطمینان سے آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ تقریباً دو بلاک کا راستہ طے کر لیا۔ تب پھر وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور اپنی سبز نوٹ بک میں دوسرا اندراج کیا۔ وہ کار کے مالک کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جب وہ اپنی نئی کار میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک وہ گہری لکیر دیکھے گا تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔

اس وقت دوپہر کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ والمر کو بھوک نہیں لگی تھی مگر کسی ریسٹورنٹ میں قدم رنجہ فرمانے کے لیے یہ بہترین وقت تھا۔ اس نے سڑک پر ادھر ادھر کسی ریسٹورنٹ کے بورڈ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر سب سے نزدیک ترین ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔ جیسا کہ اس کا اندازہ تھا، ریسٹورنٹ کے تمام بوتھ اور ریسٹورنٹ کاؤنٹر سے لگی ہوئی تقریباً تمام میزوں پر زیادہ تر گرد و پیش میں واقع دفاتر کے چھوٹے بڑے عہدے دار موجود تھے۔ صرف کاؤنٹر کے سامنے لگے ہوئے اسٹول بھی بیشتر زیرِ استعمال تھے۔ اس نے بھی ایک خالی اسٹول کا انتخاب کیا اور بیٹھتے ہی اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ پہلے اس نے جیب سے رومال نکال کر کاؤنٹر کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں صفائی کی عدم موجودگی کے بارے میں شکایات بھی کرتا گیا۔ پھر اس نے ریسٹورنٹ کے کھانے پر طرح طرح کے اعتراضات کرنا شروع کر دیے۔ اس نے کہا کہ سالن میں جو گوشت استعمال کیا گیا ہے وہ سڑا ہوا اور ناکارہ تھا اور پھر اس کے بعد اپنے ہوٹل اور ریسٹورنٹ کے انتظام، کھانا سرو کرنے کے طریقے، کھانے کی مہنگی قیمتوں اور حد درجہ بدذائقہ اور خراب کھانے کے بارے میں ہر طرح کے بیانات دیتا رہا۔ وہ یہ تمام باتیں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور گردن کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

پھر جب ویٹرس اس کی باتیں سن کر رو پڑنے کے قریب تھی، کئی تماشا کرتے ہوئے گاہک خاموشی سے باہر کھسک گئے تھے اور منیجر کوئی اور چارہ کار نہ دیکھ کر پولیس کو فون کرنے والا تھا، وہ اطمینان سے اپنے اسٹول سے اٹھا۔ اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ کافی دور جانے کے بعد وہ ایک بار پھر فٹ پاتھ پر رکا، جیب سے سبز نوٹ بک نکالی اور اس میں مزید کچھ تحریر کرنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس کا آخری مظاہرہ اتنا کامیاب رہا تھا کہ اس نے ایک دوسرے ریسٹورنٹ میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، ریسٹورنٹ کے منیجر اور کلرک سمیت تمام ویٹروں نے اسے گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ گویا یہ بات ظاہر تھی کہ وہ یہاں پہلے بھی کبھی آ چکا ہے۔

"تم لوگوں کو کھانے کے نام پر زہر کھلاتے ہو۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میں عنقریب اپنے وکیل کے ذریعے تم پر مقدمہ چلانے والا ہوں پھر تمھیں معلوم ہوگا کہ عوام کی صحت برباد کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔" اس نے ہوا میں مکا لہراتے ہوئے دھمکی دی۔ اور جلدی سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ چوراہے پر پہنچ کر جبکہ وہ ٹریفک سگنل کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا اس نے اپنی نوٹ بک میں مزید

آپریشن لانگ جمپ

جنگِ عظیم دوم ایک آندھی تھی جو لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلاتی، نئے نئے خطرناک ہتھیاروں کو جنم دیتی، ایک نئے عہد کا آغاز کر کے رخصت ہوئی اور اپنے پیچھے ہزاروں چھوٹی بڑی کہانیاں چھوڑ گئی۔ اس آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والوں میں ایک طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان تھے تو دوسری طرف برطانیہ، روس اور امریکہ ——— یورپ کے دوسرے ممالک کا تو پہلے ہی جھونکے میں خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس جنگ میں جہاں خطرناک ٹینکوں، ہوائی جہازوں، بموں، مشین گنوں، بحری جہازوں، آبدوزوں اور ایٹم بموں سے کام لیا گیا، وہیں دوسرے قسم کے خفیہ ہتھیار بھی استعمال ہوئے۔ یہ خفیہ ہتھیار تھے عجیب سازشیں اور منصوبے ——— دشمن کو نقصان پہنچانے، اس کے لیڈروں کو ہلاک کرنے، اس کے سائنسدانوں کو اغوا کر کے ہر قیمت ان کے راز حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے خوفناک منصوبے بنائے گئے۔ اور ان منصوبوں کے عجیب و غریب نام بھی رکھے گئے تھے جیسے یورپ پر چڑھائی کا منصوبہ "آپریشن اوور لورڈ" کہلاتا تھا۔ یورپ اور جرمنی کے سائنسدانوں کو امریکہ پہنچانے کا منصوبہ "آپریشن پیپر کلپ" کہلاتا تھا۔ جرمنوں نے مالی بحران پیدا کرنے کی غرض سے برطانوی اور امریکی نقلی نوٹ تیار کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اسے وہ "آپریشن برن ہارڈ" کہتے تھے۔ انہی میں ایک نہایت خطرناک منصوبہ تھا ——— "آپریشن لانگ جمپ"۔ جو اگر کامیاب ہو جاتا تو شاید آج دنیا کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ انھوں نے یہ زبردست اور عجیب ترین منصوبہ چرچل، روزویلٹ اور اسٹالن کو بیک وقت قتل کرنے کا بنایا تھا۔ جرمن جاسوسوں کو کسی نہ کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ نومبر یا دسمبر ۱۹۴۳ء میں تین بڑوں کی کانفرنس تہران میں ہونے والی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری سے پہلے کسی جانباز پیراشوٹ کے ذریعے ایران میں اتار دیے تھے۔ تہران کانفرنس کی تیاریاں انتہائی رازدارانہ طور پر کی گئی تھیں۔ تمام ایرانی سرحدیں بند کر دی گئی تھیں۔ بیرونی دنیا سے ٹیلی فون، ٹیلیگراف اور ڈاک کے رابطے منقطع کر دیے گئے تھے۔ کوئی جہاز سوائے سرکاری اور فوجی جہازوں کے پرواز نہیں کر سکتا تھا لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود جرمن جاسوس اور قاتلوں کی ٹولی تہران پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ لیکن ان سے ایک زبردست غلطی ہوئی کہ انھوں نے ایک ایرانی پہلوان مصباح ابتہاج پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیا تھا۔ یہ شخص دراصل ڈبل ایجنٹ کا رول ادا کر رہا تھا اور جرمن اور امریکیوں دونوں سے اپنی خدمات کے عیوض بھاری رقمیں وصول کر رہا تھا۔ چنانچہ ابتہاج نے عین موقع پر جب کہ عملی اقدام کے لیے جرمن کانفرنس ہال میں داخل ہو چکے تھے، امریکیوں اور روسیوں دونوں کو اس سے آگاہ کر دیا اور وہ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ بہتوں نے آخر وقت تک مقابلہ کیا اور مارے گئے۔ اس طرح "آپریشن لانگ جمپ" کا خاتمہ اس کے عمل میں آنے سے قبل ہی ہو گیا اور دنیا کی تاریخ میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی واقع نہ ہو سکی۔

——— مرسلہ: اقبال یوسف۔ ڈرگ کالونی، کراچی ———

اندراج کیا۔ نوٹ بک جیب میں رکھ کر اس نے گرد و پیش نگاہ ڈالی تو ایک آدمی کو قریب ہی کھڑا پایا۔ وہ کچھ بے چینی کے عالم میں اپنا پیر سہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا تھیلا تھا جس میں دوائیں معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ تھیلے پر ایک میڈیکل اسٹور کا نام چھپا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد، ستا ہوا اور ہونٹوں کی رنگت نیلاہٹ مائل تھی۔ والمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"معاف کرنا۔" وہ بولا۔ "میں تمھیں دیکھ کر بات کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ کیا تم نے حال میں کسی ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرایا۔ اگر نہیں۔ تو پہلی فرصت میں کرا لو۔ تمھیں اس کی شدید ضرورت ہے۔"

اس آدمی نے چونک کر والمر کی طرف دیکھا اور حیرت سے پلکیں جھپکیں۔ اس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

"تمھیں ضرور کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔" والمر نے پھر کہا۔ "تمھیں دیکھ کر مجھے اپنے دو کزن یاد آ رہے ہیں۔ ان بے چاروں کی حالت بھی بہت نازک ہو گئی تھی۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر فوری طور پر صحیح علاج ہو جائے تو صحت یاب ہو سکتے ہو۔"

اس آدمی کے ہونٹ کپکپاتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے کھلے۔ مگر اتنی دیر میں سگنل کی روشنی سبز ہو چکی تھی۔ والمر نے اسے وہیں چھوڑا اور تیزی سے سڑک پار کرنے لگا۔ نوٹ بک میں ایک اور اندراج کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

سڑک پار کر کے اس نے سوچا اب فون کالیں کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ وہ آخری ایک دو گھنٹے فون کرنے میں ضرور صرف کرتا تھا۔ خاص طور سے جمعے کے دن جبکہ اسے اپنی رپورٹ پیش کرنا ہوتی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک پبلک فون بوتھ خالی تھا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ اپنی نوٹ بک نکالی

میں گھسے ہوئے تختے پر رکھ دی۔ جیب سے بہت سی ڈمی (امریکہ کا ایک سکہ جسے فون میں ڈال کر کال کی جاسکتی ہے) نکالیں۔

اور پھر اس نے یونہی جو نمبر بھی ذہن میں آیا ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ جواب میں اگر کسی مرد کی آواز سنائی دی تو اس وقت تک گہری گہری سانسیں لیتا رہا جب تک دوسری طرف سے ریسیور رکھ نہ دیا گیا۔ اور اگر کسی عورت نے فون کا جواب دیا تو بلا تکلف انتہائی رومانی قسم کی باتیں کرنے لگا اور وہ بھی ایسی، یہاں تک کہ عورت خواہ کتنی ہی بے باک ہو گھبرا کر فون رکھ دے۔ ہر فون کال کے بعد وہ اپنی نوٹ بک میں بنے ہوئے کچھ خانوں میں ایک نشان لگا دیتا تھا۔

جب دس کالیں مکمل ہو گئیں تو وہ بوتھ سے باہر نکل آیا اور کسی دوسرے بوتھ کو تلاش کرنے لگا۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ اپنی فون کالیں ایک فون ایکسچینج کے علاقے سے دوسرے فون ایکسچینج کے علاقے میں کرے کیونکہ ایک ہی ایکسچینج کے علاقے میں فون کرنے سے اس بات کا خطرہ رہتا تھا کہ اس کی کال پکڑی جائے۔ جبکہ دوسرے فون ایکسچینج کے علاقے میں فون کرنے سے یہ بات تقریباً ناممکن تھی کہ کوئی یہ معلوم کر سکے کہ کون سے فون بوتھ سے فون کیا جا رہا ہے۔ پھر مزید احتیاط وہ یہ کرتا کہ کسی بھی بوتھ سے دس سے زیادہ کالیں نہ کرتا تھا۔

پھر جب وہ دوسرے فون بوتھ میں داخل ہوا تو اس نے ایسے لوگوں کے نام چنے جن کو اس نے آج صبح کے اخبار میں دیکھ کر انتخاب کیا تھا۔ فون کر کے انہیں موت کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ اس کے بعد وہ تیسرے بوتھ میں پہنچا اور دس کالیں بم سے اڑا دینے کی دھمکیوں کے بارے میں کیں۔ ان میں نصف کالیں ہوائی جہازوں کی کمپنیوں کو کیں اور باقی نصف بڑی بڑی عمارتوں کے مالکوں کو۔ یہاں سے نکل کر وہ چوتھے فون بوتھ میں داخل ہوا اور یہاں کی کالوں کا انداز کچھ مختلف تھا۔ ہر کنکشن ملنے پر وہ کہتا۔

"کیا تم جانتے ہو یا جانتی ہو کہ تمہاری بیوی یا شوہر اس وقت کیا کر رہی یا رہا ہے؟"

پانچویں فون بوتھ سے اس نے دس کالیں اور کیں اور ان کا انداز وہی پہلے جیسا تھا یعنی تیز تیز سانسیں اور شرمناک فقرے بازی۔ ہر تماشے کے دوران اس کی سبز نوٹ بک میں نشانات کا اضافہ ہوتا رہا۔

لیکن اس وقت تک اس کی تمام ڈمیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ ہوا بھی ہفتہ وار رپورٹ پیش کرنے کا وقت بھی قریب آچلا تھا۔ وہ آج صبح جب اپنے مکان سے نکلا تھا تو اس کا رخ اپنی کمپنی کے مین آفس کی طرف تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنی فون کالیں مکمل کر چکا تو کمپنی کا دفتر کچھ زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ یہ فاصلہ اس نے نسبتاً تیز قدموں سے طے کیا اور جلد ہی کمپنی کے دفتر پہنچ گیا۔

دی ٹالبوٹ کمپنی کا مین آفس ایک جدید ترین عمارت میں واقع تھا اور اس کی آرائش و زیبائش پر کافی محنت کی گئی تھی۔ والمر کچھ جلدی آگیا تھا۔ لیکن وہ رکے بغیر لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچا۔ اور کمرۂ انتظار میں داخل ہوتے ہوئے خوبصورت استقبالیہ کلرک لڑکی کو اپنا نام نوٹ کرا دیا۔ کچھ ہی دیر میں کمرۂ انتظار بہت سے لوگوں سے بھر گیا جن... کے ہاتھوں میں سبز رنگ کی نوٹ بکس نظر آ رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی والمر کا نام پکارا گیا وہ کمرۂ انتظار کے آخر میں واقع ایک پرائیویٹ آفس کی طرف بڑھ گیا۔ آفس کے اندر ایک موٹا سا آدمی میز کے دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا۔

"تم سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی والمر۔" موٹے آدمی نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تمہارا ہفتہ بہت اچھا گزرا ہوگا۔"

"جی ہاں مسٹر ٹالبوٹ۔" والمر نے جواب دیا۔ "یہ ہفتہ بہت کامیاب رہا۔ ہیجان اور سنسنی خیزی کی لہریں میرے ابتدائی رابطوں کے ذریعے اسی تیزی سے پھیل رہی ہیں جس طرح کسی تالاب میں بھاری پتھر پھینکنے سے متلاطم لہریں کناروں کی طرف بھاگتی ہیں۔" اور یہ کہتے ہوئے اپنی سبز نوٹ بک مسٹر ٹالبوٹ کے سامنے رکھ دی۔

ٹالبوٹ نے نوٹ بک کے صفحات جگہ جگہ سے کھول کر دیکھے۔ کہیں کہیں رک کر اس نے نوٹ بک کے اندراجات کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر اس نے پسندیدگی کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ پھر اس نے میز سے ایک فارم اٹھا کر اس پر کچھ لکھا اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیے۔

"یہ رہی تمہاری واؤچر۔" اس نے کاغذ والمر کی طرف بڑھا دیا اور میز کی دراز کھول کر ایک نئی سبز رنگ کی نوٹ بک بھی اس کے سامنے رکھ دی۔ "اسی طرح محنت سے کام کرتے رہو والمر۔" ٹالبوٹ نے کہا۔ "امید ہے آئندہ ہفتے پھر ملاقات ہوگی۔"

والمر نے مسٹر ٹالبوٹ کا شکریہ ادا کیا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس نے نوٹ بک اپنی جیب میں رکھ لی اور دوسری منزل پر جا کر کمپنی کے خزانچی کے دفتر میں جا کر اپنا واؤچر پیش کر کے اس کے بدلے ایک چیک حاصل کیا اور عمارت سے باہر نکل آیا۔ تقریباً ایک بلاک کے فاصلے پر بینک واقع تھا۔ والمر نے چیک کی پشت پر اپنے شناختی کارڈ کے ساتھ کیش کاؤنٹر پر پیش کیا۔ کھڑکی کے پیچھے ایک لڑکی رقم کی ادائیگی کر رہی تھی۔ اس نے چیک پر ادائیگی کی مہر لگائی اور رقم شمار کرنے لگی۔

"چیک سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ٹالبوٹ کمپنی میں کام کرتے ہو۔" اس نے محض کچھ گفتگو کرنے کے خیال سے کہا۔ "وہ لوگ کسی قسم کی گولیاں بناتے ہیں نا؟"

"ہاں سکون آور گولیاں۔" والمر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "ذہن اور اعصاب کو تسکین دینے والی، ہیجان اور قنوطیت کا بہترین علاج۔"

اب جبکہ وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا اس نے اپنی گفتگو کا انداز بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی خوش مزاج آدمی کی طرح بات کر رہا تھا۔

"میں جس شعبے میں کام کرتا ہوں۔ اس کا کام کمپنی کی دواؤں کی سیل بڑھانے کے مختلف طریقوں پر غور کرنا اور انہیں بروئے کار لانا ہے۔"

فریڈ

جیسلے کے ساتھ اصل پریشانی اس وقت شروع ہوئی جس دن مولی ریٹلیف میرے پاس آئی تھی۔ مولی کی اس بے وقت آمد پر میری طبیعت جھنجھلا گیا تھا کیونکہ تاش کا جو کھیل میں اس وقت کھیل رہا تھا ایک طویل عرصے بعد مجھے اس میں جیتنے کا موقع ملا تھا۔ بہرحال چونکہ مولی غیر معمولی طور پر پرجوش نظر آ رہی تھی اس لیے دل پر پتھر کی سل رکھ کر میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔

"میں ہمیشہ تم سے کہتی رہی ہوں کہ فریڈ جیسلے اچھا آدمی نہیں ہے۔" کمرے سے باہر آتے ہی بڑھیا ایک دم شروع ہو گئی۔ "لیکن میری بات پر تم نے کبھی کان نہیں دھرے۔ یہی سمجھتے رہے کہ پاگل بڑھیا ہے بکنے دو۔ اس کے علاوہ تمہیں تاش کھیلنے ہی سے فرصت نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں سے تم نے دنیا بھر کے آوارہ گرد اور لفنگے اکٹھے کر لیے ہیں جو ہر وقت تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ میں نے بار بار کہا کہ فریڈ ایک برا آدمی ہے۔ بہت برا۔ اب دیکھ لو کہ میری پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی یا نہیں؟ مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ یہ حرکت ضرور کرے گا۔"

جب وہ سانس لینے کے لیے ذرا رکی تو میں نے کہا۔ "آخر بات کیا ہے؟ تم نے تو آتے ہی ڈاک گاڑی بھگا دی۔ فریڈ جیسلے نے کیا کیا ہے؟"

"کیا کیا ہے؟ گویا تمہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ اس نے کیا کیا ہے؟ اسے اس بدمعاش نے اپنی بیوی کورا کو قتل کر دیا ہے، خدا اس پر اپنا رحم کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کورا ایسے غلط آدمی کے ساتھ زندگی کیسے گزار رہی تھی۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مولی کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا۔ میری نظر میں فریڈ جیسلے ایک سیدھا سادا اور شریف آدمی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح تاش وغیرہ کھیلنے کے بجائے مچھلی کے شکار کو زیادہ پسند کرتا تھا لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی وجہ سے اسے برا سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مولی فریڈ کے پڑوس میں رہتی ہے اور ان لوگوں کے تعلقات آپس میں ٹھیک نہیں ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر فریڈ نے کبھی کسی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا تو وہ خود مولی ہوگی۔

"دیکھو مولی۔" میں نے کہا۔ "فریڈ پر تم بہت بڑا الزام لگا رہی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس اپنے الزام کے سلسلے میں کوئی ثبوت تو ہوگا؟"

سالم چبا نگلی ہوئی کسی بلی کی طرح اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت جو تم چاہتے ہو میرے پاس موجود ہے اس نے اپنی بیوی کو اپنے گھر کے احاطے میں عین میری کھڑکی کے نیچے ہی تو دفن کیا ہے، اس سے بڑا ثبوت تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"تم نے فریڈ کو اسے دفن کرتے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تمہارا یہ مطلب ہے کہ کیا میں نے کورا کی لاش دیکھی ہے۔ تو لاش تو میں نے بے شک نہیں دیکھی لیکن آدھی رات کو قبر کھودنے کی آوازیں ضرور سنی تھیں اور صبح اٹھ کر دیکھا تو وہاں قبر موجود تھی۔"

قانونی حدود اور شخصی آزادی کا دلچسپ کھیل

ایک عجیب و غریب کہانی

● آفریدہ وقار

"کسی قتل کے کیس میں صرف قبر مناسب ثبوت نہیں ہوتا، مولی۔ اس سلسلے میں مکمل ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف لاش سے بھی کام نہیں چلتا۔ یہ بھی ثابت کرنا پڑتا ہے کہ قتل وقوع پذیر ہوا ہے۔"

"مجھ سے اس قسم کی الجھی ہوئی باتیں مت کرو شیرف۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ غریب کورا کو قتل کیا گیا ہے اور فریڈ جیسے اس کا قاتل ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

"دیکھو، تم زیادہ پریشان مت ہو۔ جیسے ہی تاش کا یہ راؤنڈ ختم ہوگا میں فریڈ سے جا کر ملوں گا۔"

میری بات سے مولی کچھ پریشان نظر آنے لگی۔ وہ ہر معاملے میں بے صبری کا مظاہرہ کرتی ہے اس لئے جلدی سے بولی۔ "شیرف، بہتر یہ ہے کہ تم جا کر فوراً فریڈ کو گرفتار کر لو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ فرار نہ ہو جائے۔"

"معلوم ہوتا ہے آج کل تم کثرت سے جاسوسی کہانیاں پڑھتی رہی ہو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"میں کیا کر رہی ہوں اور کیا نہیں اس سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، ایک شیرف کی حیثیت سے تمہارا فرض ہے کہ اس پر عمل کرو۔"

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ بڑھیا گرم ہو رہی ہے تو اُسے ٹھنڈا کرنے کے لئے بولا۔ "اوکے، مولی۔ اگر تم بضد ہو تو میں ابھی فریڈ کے پاس چلا جاؤں گا۔"

مولی سے رخصت ہو کر میں فریڈ کے گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے توقع تھی کہ اب مولی سارے شہر کو اپنا کارنامہ سناتی پھرے گی۔ جب میں پہنچا تو فریڈ برآمدے میں بیٹھا مچھلیاں پکڑنے کی ڈور سلجھا رہا تھا۔

"صبح بخیر، فریڈ۔" میں نے کہا۔

"صبح بخیر، شیرف۔ آؤ بیٹھو۔ آج صبح صبح کہاں نکل کھڑے ہوئے۔ کسی خطرناک مجرم کو گرفتار کرنے نکلے ہو یا ایسے ہی ٹہلتے ہوئے ادھر آ گئے ہو۔ کافی پینے کا موڈ ہو تو بناؤں؟"

"اس وقت تو میں تمہارے پاس ایک نیم سرکاری کام سے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس کوئی نیم وغیرہ تو نہیں ہے۔ اس لئے تم نے محض اپنا وقت ہی ضائع کیا ہے۔" کہہ کر اس نے اس طرح قہقہہ لگایا گویا کوئی بہت ہی پُر مذاح بات کہی ہو۔

میں ایک آدھ منٹ خاموش رہا تاکہ اپنے مذاق سے وہ اچھی طرح لطف اندوز ہو لے اور پھر فوراً ہی اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ "فریڈ، تھوڑی دیر قبل مولی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اپنے مکان کے احاطے میں تم نے جو کھدائی وغیرہ کی ہے اس سلسلے میں وہ پریشان ہے۔ وہ کچھ احمقانہ سی باتیں کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں تم سے ملاقات کر کے صورتِ حال معلوم کر لوں تو زیادہ بہتر ہے۔" "مجھے تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نظر نہیں آ رہی ہے شیرف۔

کل رات اپنے احاطے میں میں نے تھوڑی سی زمین کھودی تھی۔ کیا یہ زمین کھود کر میں نے غلطی کی ہے؟"

"اگر تم نے احاطے کی ذرا سی زمین ہی کھودی ہے تو میرے خیال میں یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔"

"بالکل۔ زمین ہی تو کھودی ہے۔ تم خود چل کر دیکھ لو۔"

یہ خیال مجھے بہت مناسب معلوم ہوا۔ اس لئے ٹہلتا ہوا مکان کے دوسری طرف بنے ہوئے احاطے کی طرف چلا آیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مولی کا خیال تقریباً ٹھیک ہی تھا۔ وہاں واقعی ایک قبر بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی درمیانے سائز کی قبر کے برابر تھی۔ اس پر پڑی ہوئی مٹی دور ہی سے نئی معلوم ہو رہی تھی۔ البتہ کتبہ کے بجائے اس پر جیرانیم کے پودے لگے ہوئے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صورتِ حال دیکھ کر تو مجھے بھی یقین سا ہو گیا کہ یہ قبر ہی ہے البتہ پریشانی یہ تھی کہ آخر کون شخص ایسا بے وقوف ہو سکتا جو اپنی بیوی کو مار کر اس کی قبر مکان کے احاطے میں بنائے گا۔ اسی وقت فریڈ بھی ٹہلتا ہوا وہاں آ گیا۔ "کیوں، اچھا معلوم ہوتا ہے نا؟" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

"یہ تو اپنے اپنے خیال کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ جس طرح چاہے اپنے احاطے کو خوبصورت بنائے۔"

"میرے خیال میں اس طرح یہاں گھاس کے تختے کی یکسانیت ختم ہو گئی ہے۔" فریڈ نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں یا کیا کروں۔ فریڈ نے اپنی بیوی کو مار کر یہاں دفن کر دیا ہے یا واقعی نئے انداز سے پودے لگانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے سوچا کہ کلب میں جا کر دو چار بازیاں تاش کی لگاؤں تاکہ دماغ کچھ تازہ ہو جائے اور پھر بہتر انداز میں سوچا جا سکے۔ جانے سے پہلے فریڈ سے ایک آدھ سوال کر لوں تو بہتر ہے۔

"آج کل کورا کی طبیعت کیسی ہے۔ فریڈ؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "میرے خیال میں تو وہ ٹھیک ٹھاک ہی ہوگی۔"

"میرے خیال میں کیا مطلب۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے؟"

"ہاں ٹھیک طرح معلوم نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مغربی علاقے سے کل رات اس کی بہن آئی تھی۔ وہ اُسے چند دن کے لئے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔" فریڈ نے کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔

"اچانک چلی گئی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "آخر کتنے دن کے لئے گئی ہے؟" "مجھے ٹھیک طرح نہیں معلوم، ممکن ہے طویل عرصے کے لئے گئی ہو۔"

"اس سے قبل کورا کی زبانی تو میں نے اس کی کسی بہن کا ذکر نہیں سنا تھا۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ گئی ہے؟"

"اوہ، شیرف خدا کے واسطے اپنے یہ احمقانہ سوالات بند کر دو۔ مجھے مچھلیوں کے شکار کی تیاریاں کرنی ہیں پھر ملاقات ہوگی۔" کہہ کر وہ احاطے کے باہر چلا گیا اور میں تنہا کھڑا قبر کو دیکھتا رہ گیا۔

میں اسی وقت پوسٹ مین جم ہولے آتا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہو سکے تو جم سے بھی کچھ معلومات اکٹھی کر لی جائیں۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ایک سرکاری کام کے سلسلے میں جم تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

حسبِ معمول جم اس وقت بھی کچھ بیزار سا نظر آ رہا تھا۔ میری بات سن کر وہ بولا۔ "میرا خیال بھی یہی تھا کہ اس وقت تاش کھیلنے کے بجائے تمہارا یہاں نظر آنا یقیناً کسی سرکاری کام کی وجہ سے ہے۔"

"میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کبھی مغربی ساحلی علاقے سے کورا کو اس کی بہن کی طرف سے خطوط وغیرہ وصول ہوتے تھے یا نہیں۔"

"میرے لئے تمہارے سوال کا جواب دینا ناممکن ہے شیرف۔ ڈاک خانے کے ملازمین کو کسی شخص کے خطوط کے بارے میں گفتگو کرنے کی ممانعت ہے۔"

"لیکن میں نے تو اکثر تمہیں، لوگوں کے پوسٹ کارڈ پڑھتے دیکھا ہے۔"

"یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ اگر تم کسی شخص کی ڈاک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو تو بہتر ہے کہ واشنگٹن میں پوسٹ ماسٹر جنرل سے رابطہ قائم کرو۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"دیکھو جم۔" میں نے کہا۔ "اگر تم اپنے علاقے کے شیرف سے سرکاری معاملے میں تعاون نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو لیکن خواہ مخواہ ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں تو صرف احکامات کی پابندی کر رہا ہوں۔ شیرف۔" کہہ کر وہ ایک پوسٹ کارڈ پڑھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اور میرے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ کاش اس وقت اسے پوسٹ ماسٹر جنرل یہ خط پڑھتے ہوئے دیکھ لے۔

اسپورٹس کلب کے ایک کمرے میں بیٹھ کر میں نے صورتِ حال پر نظر ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ فریڈ نے اپنے گھر میں گھاس کا قطعہ کھودا ہے۔ اس کی بیوی کورا اپنی بہن سے ملنے گئی ہے اور میں نے صبح ہی صبح دو آدمیوں فریڈ اور جم کی ناراضگی مول لے لی ہے۔

اسی دن دوپہر کے وقت میں بڑی سڑک پر جا رہا تھا کہ مولی نے پھر آ پکڑا۔ میں نے اُسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی نظروں سے بچ کر ادھر اُدھر ہو سکتا اس نے مجھے گھیر لیا۔

"شیرف، کیا تم نے اس دیوانے قاتل کو گرفتار کر لیا؟"

"دیکھو، مولی۔" میں نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "فریڈ جیسے کو اس انداز میں پکارنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے اس طرح تم پریشانی میں پڑ سکتی ہو۔ ممکن ہے وہ ہتکِ عزت یا ازالۂ حیثیت عرفی کے سلسلے میں تم پر مقدمہ قائم کر دے۔"

"اوہ، شیرف، تم نے تو مجھے بیزار کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں نے تم جیسے ڈھیلے ڈھالے اور کاہل الوجود اور ڈرپوک شخص کو شیرف کی حیثیت سے کیوں منتخب کیا۔ میرے خیال میں تو تم اپنے سائے سے بھی خوفزدہ

رہتے ہو گے۔ اس قسم کے کیس میں تو ہمیں ایک ایسے بہادر اور دلیر قانون کے محافظ کی ضرورت تھی جو کسی عیار قاتل کا آسانی سے سامنا کر سکے۔"

"ایک منٹ خاموش تو رہو، مولی۔" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ "فریڈ کا کہنا ہے کہ کورا اپنی بہن کے ساتھ مغربی ساحل پر اس کے گھر گئی ہے۔ ابھی تک مجھے ایسی کوئی شہادت نہیں ملی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ کوئی جرم کیا گیا ہے۔ صرف اس لئے کہ کسی شخص نے اپنے مکان کے احاطے کی زمین کھودی ہے اسے دیوانہ قاتل نہیں کہا جا سکتا۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ اسے جیل میں ہونا چاہیے۔ اور میں اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھوں گی جب تک اسے کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دوں۔" کہہ کر وہ چل دی۔

مولی کی فطرت کے پیشِ نظر مجھے یقین تھا کہ وہ واقعی چین سے نہیں بیٹھے گی۔

دوسرے دن صبح کو مولی نے پھر مجھے آ پکڑا اور اسپورٹس کلب سے باہر لے آئی۔ اس طرح اس نے میری تفریح کے دو دن غارت کرا دیئے۔ میں اس صورتِ حال سے خاصا بیزار ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں سراغ رسانی کی کہانیوں کا کوئی گھٹیا سا پرچہ دبا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم ضرور میری بات کو اہمیت دو گے شیرف۔ ذرا یہ کہانی پڑھو۔ یہ کہانی فریڈ کے کیس سے بہت مطابقت رکھتی ہے۔"

"فریڈ کے کیس؟ اوہ، مولی، فریڈ کے کیس کا کوئی وجود نہیں ہے ویسے اگر تم چاہتی ہو تو میں یہ کہانی پڑھ لوں گا۔"

"تم یہ کہانی پڑھو اور پھر اس دیوانے قاتل کو گرفتار کر لو۔"

"اچھا، اچھا، میں پڑھ لوں گا۔ رسالے کے لئے تمہارا شکریہ۔"

"یہ رسالہ مجھے واپس مل جانا چاہیے۔ صرف کہانی پڑھنے کے لئے دیا ہے تاکہ تمہیں اپنے فرائض کا احساس ہو سکے۔"

رسالہ لے کر میں نے مولی سے کہا کہ میں پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ جو کہانی وہ مجھے پڑھوانا چاہتی تھی اس کہانی میں بتایا گیا تھا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کر کے مکان کے احاطے میں دفن کر دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس آدمی نے بیوی کی قبر بنا کر اپنے جرم کا اشتہار نہیں بنایا تھا۔ کہانی پڑھ کر میں نے رسالہ مولی کو واپس بھجوا دیا۔ اور پھر تاش کھیلنے کلب گیا تو تیس سینٹ ہار گیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے لئے یہ معاملہ کتنا الجھن آمیز ہوتا جا رہا تھا۔

اور جب تیسری صبح پھر مجھے اسپورٹس کلب سے باہر آنے پر مجبور کیا گیا تو میں قریب قریب پاگل ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اس مصیبت سے بچنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دوں۔ اس مرتبہ مجھے باہر لانے والا، روڈی پارسن وکیل تھا۔

"شیرف۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "فریڈ کے کیس کے سلسلے میں آج صبح مولی مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس معاملے میں وہ بہت زیادہ پُرجوش تھی۔ تمہارے

خیال میں ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔؟"

"اس سلسلے میں بہترین اقدام یہ ہوگا کہ ہمیں یہ سارا معاملہ بھلا دینا چاہیے۔ مجھے توقع ہے کہ چند دن بعد کورا جیسے واپس آجائے گی۔"

روڈی نے فوراً ہی میرے خیال کی تردید کر دی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ روڈی تین سال سے ڈسٹرکٹ اٹارنی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور اس دوران کاؤنٹی کے لیے کوئی بڑا کیس حل کرنے کا اسے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔

"دیکھو شیرف" وہ چند لمحے بعد بولا۔ "میں چند دن کورا کی واپسی کا انتظار کروں گا۔ اگر اس دوران وہ نہ آئی اور فریڈ نے ہمیں اس کی قیام گاہ سے آگاہ نہ کیا تو میں کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھاؤں گا۔"

"ڈسٹرکٹ اٹارنی کی حیثیت سے میں اچھی طرح تمہارے فرائض سے واقف ہوں۔ میں اس سلسلے میں دو تین دن بعد ایک بار پھر فریڈ سے ملنے جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس سے سختی سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں دوسروں کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔"

مزید تین دن انتظار کرنے کا وعدہ کر کے روڈی چلا گیا جبکہ مولی کہتی تھی، جیسے کیس کی غیر معمولی پریشانی کی وجہ سے میں ٹھیک طرح تاش بھی نہیں کھیل سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ڈالر ہار گیا۔ اگر مجھے مستقبل کے بارے میں معلوم ہوتا تو میں دو ڈالر کی اس ہار پر خدا کا شکر ادا کرتا۔

تیسرے دن، کچھ گفتگو کرنے کے لیے میں ایک بار پھر فریڈ کے گھر گیا۔ فریڈ بڑے دوستانہ انداز میں پیش آیا اور کچھ دیر تک ہم لوگ مچھلی کے شکار اور بعض دوسرے معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں مطلب پر آیا اور اس سے کورا کے بارے میں پوچھا۔

کورا کے بارے میں میرا سوال سن کر وہ ایک دم بھڑک گیا اور غصے سے بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ وہ بڑھیا کھوسٹ لوگوں سے کیا کہتی پھر رہی ہے اس کی یہ حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کورا اپنی بہن کے ساتھ قصبے سے باہر گئی ہوئی ہے۔"

"فریڈ، تم میرے صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ مکان کے احاطے میں بنی ہوئی اس قبر میں کون دفن ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے قبر کہتا کون ہے؟" فریڈ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "میں نے تو نہیں کہا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ مکان کے احاطے میں گھاس کے قطعے کی یکسانیت ختم کرنے کے لیے میں نے یہ پوٹ لگائے ہیں۔ اگر تم مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہو تو آگے بڑھو اور گرفتار کر لو لیکن یہ یاد رکھنا کہ اپنے اس غلط اقدام کے لیے تمہیں عدالت میں جواب دہی کرنی پڑے گی۔"

اس طرح یہ ملاقات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ روڈی کے پاس جا کر میں نے اسے نتیجے سے آگاہ کر دیا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ فریڈ مقدمے کے لیے تیار ہے۔ میری بات سن کر روڈی بہت پرجوش ہو گیا۔ فریڈ کے مجرم ہونے کا اسے اور زیادہ یقین ہو گیا تھا۔ میں نے روڈی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ روڈی نے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھائے گا۔

دوسری صبح جب کوئی شخص مجھے بلانے اسپورٹس کلب نہیں آیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے روڈی نے فریڈ کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کر دیا ہو۔ اس خیال سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں نے لگاتار چار بازیاں جیت لیں۔

سہ پہر سے کچھ دیر قبل روڈی مجھے ڈھونڈتا ہوا ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ بہت زیادہ بے تاب ہے۔ وہ اس وقت اتنا اضطراب پسند بنا ہوا تھا کہ ریسٹورنٹ میں کچھ بتانے کے بجائے مجھے باہر اٹھا لایا۔ باہر آ کر بھی اس نے اتنے آہستہ لہجے میں گفتگو کی کہ قریب کھڑے ہوئے کسی شخص کے لیے بھی اس کی بات سمجھنا مشکل تھا۔

"شیرف!" اس نے کہا۔ "میں نے عدالت سے اجازت لے لی ہے کہ تم فریڈ جیسلے کے مکان کے احاطے میں بنی ہوئی قبر کھود سکتے ہو۔ اپنے لیے دو تین نائب تلاش کر لو پھر ہم آج ہی شام کو یہ کام نمٹا لیں گے۔"

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو، روڈی۔" میں نے کہا۔ "فریڈ اس بات کو ناپسند کرے گا۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اپنے ذاتی معاملات میں لوگوں کی مداخلت اسے پسند نہیں۔"

"اس کی پسند یا ناپسند کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "میرے پاس اس قبر کو کھودنے کے لیے عدالتی حکم موجود ہے تم دو تین نائبین اور پھاوڑوں کا بندوبست کر کے میرے آفس میں مجھ سے ملو۔"

مجھے اپنے نائب تلاش کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں تو ہر شخص نائب بننے کے لیے تیار تھا لیکن جب میں یہ بتاتا کہ انھیں نائب ہونے کی صورت میں ایک قبر کھودنی ہے تو وہ منہ بنا کر چل دیتے تھے۔ آخر کار بڑی مشکل سے دو آدمی تین تین ڈالر لے کر قبر کھودنے پر راضی ہو گئے۔ چند پھاوڑوں کا بندوبست کر کے میں روڈی کے آفس پہنچ گیا۔ روڈی کی خواہش تھی کہ میں سب لوگوں کو سرکاری گاڑی میں لے کر فریڈ کے گھر جاؤں لیکن میں نے اسے بتایا کہ سرکاری گاڑی تین مہینے سے خراب پڑی ہوئی ہے۔ یہ سن کر روڈی کو بہت کوفت ہوئی اور ناچار ہم لوگ پیدل ہی فریڈ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ روانگی سے پہلے اس نے کفن دفن کرنے والے سرکاری آدمی کو فون کر کے موقع واردات پر موجود رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔

فریڈ کے گھر پہنچ کر جیسے ہی روڈی نے اسے یہ بتایا کہ وہ کس کام کے لیے آیا ہے تو وہ بری طرح چیخنے چلانے اور دھمکیاں دینے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ کاؤنٹی پر ہتک عزت، مداخلت بے جا اور ازالۂ حیثیت عرفی کے سلسلے میں مقدمہ قائم کرے گا۔ اس سلسلے میں وہ روڈی کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے روڈی نے اسے عدالتی حکم دکھایا اور ہم سے کام شروع کرنے کے لیے کہا۔

میرے نائبوں نے جیسے ہی قبر کھودنی شروع کی لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ میں نے تمام لوگوں کو فریڈ کی پراپرٹی سے دور رکھا اور نائب قبر کھودتے رہے جب تین فٹ کے قریب قبر کھودی گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس میں سے کچھ نہیں نکلے گا لیکن روڈی نے انہیں کام جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ اسے یقین تھا کہ وہ لوگ جلد ہی کوئی اہم چیز برآمد کر لیں گے۔ مولی اپنی کھڑکی میں کھڑی ایسے لوگوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی جو اپنی بیوی کو قتل کر دیتے ہیں۔ تابوت بردار گاڑی فریڈ کے مکان کے پورچ میں کھڑی تھی۔

قبر چار فٹ کے قریب کھودی گئی تھی کہ ایک شخص آئس کریم بار بیچتا ہوا ادھر آ نکلا۔ کام روک کر ہم لوگ مقبرے کے قریب کھڑے کھڑے آئس کریم کھانے شروع ہی کی تھی کہ مکان میں ایک کار داخل ہوئی۔

کورا جیسلے کے کار سے برآمد ہوتے ہی لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر تقریباً پانچ آئس کریم بار زمین پر گر پڑیں۔ اس نے آگے بڑھ کر فریڈ کو ایک طویل بوسہ دیا اور بولی "آخر یہ کیسا مجمع ہے یہاں، یہ لوگ کیا کر رہے تھے؟" اس نے قبر کھودنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا گٹر لائن پھر خراب ہو گئی؟"

فریڈ نے روڈی کی طرف دیکھا اور پھر کورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آؤ مکان کے اندر چلیں۔ میں تمہارے سفر کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ پھر میں بتاؤں گا کہ یہ احمق لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

روڈی کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے مر کر گر پڑے گا۔ اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید پڑا ہوا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جلدی سے اس گڑھے کو بھر دیں" کہہ کر وہ سڑک کی طرف چل دیا۔

کفن دفن کرنے والے سے میں نے کہا کہ وہ گاڑی لے جائے۔ مولی نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا اور مجمع منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ گڑھا بند کرنے میں تقریباً دس منٹ لگے اس کے بعد ہم لوگ بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

دو دن بعد ایک مرتبہ پھر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بھی لمحے روڈی کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ فریڈ نے کاؤنٹی اور روڈی کے خلاف دس ہزار ڈالر ہرجانے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے اپنے دعوے میں کئی طرح کے الزامات لگائے تھے۔ روڈی نے بتایا کہ چونکہ عدالت کے پاس کوئی بڑا مقدمہ نہیں ہے اس لیے یہ معاملہ اگلے ہفتے ہی عدالت میں پیش ہو جائے گا۔

مقدمے کے دن تقریباً پورا قصبہ ہی عدالت میں آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی کہ وکیلوں کی بحث تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو گئی۔ فریڈ نے مقدمے کی پیروی کے لیے شہر سے ایک بہت چالاک اور تیز وکیل کو لایا تھا۔ صرف بیس منٹ کے وقفے میں جیوری نے فیصلہ کر دیا کہ فریڈ حق پر ہے اور کاؤنٹی کو ہرجانے کے طور پر اسے پانچ سو ڈالر ادا کرنے چاہئیں اور روڈی کو ... ڈالر جرمانہ کیا جاتا ہے جو فریڈ وصول کرے گا۔

اس کے ساتھ ہی جج نے روڈی کو بر سرِ عدالت خوب برا بھلا کہا۔

ریویو

از
شفیق الرحمٰن

کاغذ کھردرا، لکھائی بے کار، چھپائی اور بھی بے کار، گٹ اپ سرے سے غائب۔

سب سے پہلے تو ہمیں اس کتاب کا نام بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نام سے فوراً سعادت حسن منٹو یاد آ جاتا ہے۔ تبصرہ کا منہ سر نہایت منحوس ہوتا ہے۔ اس پیارے افسانوں پر نحوست برس رہی ہے۔

صفحات کی تعداد چار سو ہیں سے ہے جو نہایت خطرناک ہندسہ ہے۔ کاغذ نہ صرف کھردرا بلکہ ردی میں خریدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ڈھائی روپے کی قیمت ہمارے خیال میں بہت ہے۔ اس مجموعے کی قیمت آٹھ یا دس آنے کافی تھی۔ یہ مجموعہ قلندر علی اینڈ قلندر علی نے چھاپا ہے جو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انھیں اکثر لوگ پسند نہیں کرتے۔ اس کارخانے کے مالک کا بڑا لڑکا اس وقت جیل میں ہے اور چھوٹا لڑکا اس قدر شرابی ہے کہ کیا بتاتے ہیں، اور معاف کیجیے۔ اس کتاب کا ٹائٹل ایک فلمی سین کا چربہ ہے۔ یہ سین ریاضیات کی بابا اٹھ سے لیا گیا ہے۔ کتاب کے ساتھ مصنف نے اپنی تصویریں شامل کی ہیں جن میں بےشمار خامیاں ہیں۔

مرسلہ: رعنا زبیری، دستگیر، کراچی

میرا خیال تھا کہ یہ واقعہ روڈی کو سبق سکھانے کے لیے کافی ہوگا اور اب وہ خاصے عرصے خاموش رہے گا۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی روڈی سے خاصے ناراض تھے۔ ان سب کا خیال تھا کہ کاؤنٹی کو محض روڈی کی وجہ سے پانچ سو ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ اگلے ہفتے روڈی کافی چپ چاپ اور خاموش رہا، یہاں تک کہ مولی نے بھی کچھ عرصے کے لیے افواہ سازی بند کر دی۔

مجھے اندازہ تھا کہ روڈی اور مولی دونوں ہی اس واقعے سے خاصے ناراض تھے اور منتظر تھے کہ موقع ملتے ہی فریڈ سے بدلہ لیں گے۔ یہ موقع انھیں چھ ماہ بعد ملا۔

اس مرتبہ مجھے واقعہ سنانے والا روڈی تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس مرتبہ پھر فریڈ نے گڑبڑ کی ہے۔ رات کے وقت ... اس کے مکان کے احاطے میں زمین کھودنے کی آوازیں واضح طور پر سنی گئیں اور پھر صبح کو پہلی قبر کے برابر ہی ایک اور قبر نظر آئی۔ اس مرتبہ اس میں تھوڑا سا فرق یہ تھا کہ زمین کھودنے کی آوازوں سے قبل مولی نے فائر کی آواز بھی سنی تھی۔ فریڈ نے فائر اور قبر کے بارے میں گفتگو کرنے یا کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کورا کہاں ہے۔ کورا دوبارہ غائب ہو گئی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس مرتبہ یہ سارا معاملہ خود مجھے بھی خاصا مشکوک

محسوس ہو رہا تھا۔ مولی کا خیال تھا کہ اس مرتبہ فرید نے یقیناً کورا کو مار کر دفن کر دیا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ پہلے واقعے کے بعد دوسری قبر کھودنے کی کسی میں بھی ہمت نہیں ہوگی۔ میں اور روڈی تھوڑی دیر تک اس معاملے پر بحث کرتے رہے اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سلسلے میں پہلے فرید سے گفتگو کر لی جائے تو بہتر ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر فرید نے کورا کو گولی ماری ہے تو اس سلسلے میں اس کے مکان میں کہیں کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا۔

فرید نے پہلے ہی کی طرح عدم تعاون کا مظاہرہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنے مکان کے احاطے میں وہ جو کچھ بھی کرے، اس کا ذاتی معاملہ ہے اور ہمیں اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارے اصرار پر فرید نے بتایا کہ اس نے اپنے بیڈ روم میں ایک چوہے کو گولی ماری تھی اور بعد میں اسے دفن کر دیا تھا۔ جب روڈی نے بیڈ روم دیکھنے کی خواہش کی تو حیرت انگیز طور پر فرید نے کوئی انکار نہیں کیا۔

بستر پر کوئی چادر وغیرہ بھی ہوئی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ میٹرس کا غلاف بھی غائب تھا۔ روڈی نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید کوئی ثبوت مل جائے، فرید سے بستر اور میٹرس کور کے بارے میں پوچھا۔

فرید کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ ابھر آئی جیسے وہ اس سوال سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس نے روڈی سے کہا "پہلی بات تو یہ کہ تمہیں میرے بستر کی چادر اور میٹرس کور سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا تمہیں احساس ہو گیا ہوگا کہ دخل در معقولات کرنے والا وکیل ہونا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔"

روڈی کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو گیا۔ اپنے غصے کو بمشکل ضبط کرتے ہوئے وہ بولا "میرا اندازہ ہے کہ پہلی بار تم نے جو کیا تھا وہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے تھا مگر جب تم اصل قدم اٹھاؤ تو کوئی تمہارے خلاف کارروائی کی ہمت نہ کر سکے لیکن تمہیں یہ بتا دوں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں اس علاقے کا قانونی طور پر منتخب ڈسٹرکٹ اٹارنی ہوں۔ میں نے اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھانے کا حلف اٹھایا ہے۔"

فرید نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میرے سامنے اس طرح بڑھ چڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ میرا ارادہ آئندہ تمہیں ووٹ دینے کا ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بس اب روڈی پھٹ پڑے گا لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولا "فرید، تم مجھے زیادہ بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ بستر کی چادریں کہاں گئیں اور میٹرس میں یہ گولی کا سوراخ کیسا ہے۔ مجھے اپنے سوال کا جواب ابھی چاہیے۔"

"مسٹر ڈسٹرکٹ اٹارنی" فرید نے بڑی نرمی سے کہا "جیسا کہ تم کو پہلے ہی بتا چکا ہوں میں نے یہاں ایک چوہے کو گولی ماری تھی اور چونکہ بستر کی چادروں پر اس کا خون لگ گیا تھا اس لئے میں نے انہیں جلا دیا۔" پھر ایک لمحہ توقف کر کے وہ دوبارہ بولا "تم اپنے دفتر جا کر آخر میرے خلاف قانونی کارروائی کیوں نہیں کرتے۔ میرے خیال میں تو تمہاری قابلیت کا تمام تر انحصار تمہارے تب ذاتی اقدامات پر ہے۔"

روڈی اپنی ایڑیوں پر گھوم کر فوراً ہی باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساتھ ہی منہ ہی منہ میں وہ کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے جاتے ہوئے میں نے فرید کو زوردار قہقہہ لگاتے سنا۔

جوش میں بھرا ہوا روڈی کچھ زیادہ ہی تیزی سے جا رہا تھا۔ اس لئے اس کے پاس پہنچنے کے لئے مجھے خاصی تیزی سے چلنا پڑا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو غصے اور جوش میں اسے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ بڑی مشکل سے میری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ اس کا خیال ہے کہ اس مرتبہ فرید کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بستر پر چوہے کو گولی مارنے والی بات پر روڈی کو بالکل یقین نہیں تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس دوران ہم سپورٹس کلب پہنچ چکے تھے۔ وہاں آکر وہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ کچھ انتظار کرے گا۔

ہر روز صبح کے وقت روڈی یہ جاننے کے لئے کہ میں نے کوئی نئی بات معلوم کی یا نہیں، اسپورٹس کلب میں میرے پاس آتا تھا۔ میں ہر روز انکار کر دیتا تھا کیونکہ مجھے کوئی نئی بات معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں مولی کو ہر روز روڈی کے آفس کی طرف جاتا دیکھتا تھا اور پھر وہ ایک گھنٹے بعد وہاں سے واپس آتی نظر آتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں نام نہاد جیسے کیس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوں گے۔

اس دوران جب بھی مولی سے میرا سامنا ہوتا وہ یہی کہتی کہ میں ایک ناکارہ شیرف ہوں جس نے ایک دیوانے قاتل کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

اسی طرح دو ہفتے گزر گئے لیکن کورا کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اس دوران مولی پوری شد و مد کے ساتھ گاؤں بھر میں کورا کو دفن کئے جانے کی کہانی سناتی پھر رہی تھی۔ گاؤں والے بھی آخر انسان تھے مولی کے غیر معمولی جوش و خروش اور واقعے کی تکرار سے کچھ لوگوں نے متاثر ہو کر میرے اوپر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کروں۔ میرے پاس ایک ہی جواب تھا "میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ کوئی جرم وقوع پذیر ہوا ہے اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

فائر کی آواز سنائی دینے، کورا کے غائب ہونے اور قبر کھودے جانے کے تین ہفتے بعد روڈی نے قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن میرے پاس آکے اس نے مجھے ایک اور عدالتی حکم دکھایا۔

میرا خیال تھا کہ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے اس لئے میں نے روڈی کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ضرورت سے زیادہ جوش میں بھرا ہوا تھا اس لئے میرا مشورہ یکسر نظر انداز کر دیا۔

اسی دن دوپہر کے بعد قبر کھودنے کے لئے دو تین آدمیوں کا بندوبست کر کے ہم لوگ فرید کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولی نے پہلے ہی یہ خبر گاؤں والوں کو سنا دی تھی اس لئے لوگوں کی ایک خاصی تعداد جمع ہو گئی تھی۔

قبر دو فٹ کی گہرائی تک ہی کھودی گئی تھی کہ پھاوڑا کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ چیز انتہائی خراب اور خستہ ایک لاش تھی لیکن یہ لاش ایک بڑے سمت چوہے کی تھی، جس میں گولی کا سوراخ صاف نظر آ رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اب مزید قبر کھودنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فرید کے بیان کی تصدیق ہو گئی تھی لیکن روڈی نے قبر کھودنے والوں کو اپنا کام جاری رکھنے کا حکم دیا۔ لمحہ بہ لمحہ قبر کی گہرائی بڑھتی رہی یہاں تک کہ جب سات فٹ کے قریب قبر کھودی جا چکی تو شام ہو چکی تھی۔ اس گہرائی پر قبر کھودنے والوں کو احساس ہوا کہ سخت اور پتھریلی زمین کی وجہ سے مزید کھدائی ناممکن ہے۔

قبر کھودنے والوں کو کام بند کرنے کا حکم دیتے وقت روڈی کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ فرید کے مکان سے واپسی پر میں حیران تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ میری حیرت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی کیونکہ راستے میں مجھے فرید کا چالاک اور عیار دوست جس نے اس کا پہلا مقدمہ لڑا تھا، فرید کے گھر کی طرف جاتا نظر آگیا تھا۔

میرے خیال میں آپ نے بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ بعد میں کیا ہوا۔ فرید نے ایک اور مقدمہ قائم کر دیا تھا۔ اس مرتبہ جج غصے سے کھول رہا تھا۔ اس نے روڈی کو اپنے دفاع میں پوری طرح بولنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی اس معاملے میں روڈی کو مجرم سمجھ رہے تھے۔ کل تک جو گاؤں والے فرید کے معاملے میں قدم اٹھانے کے لئے میرے اوپر دباؤ ڈال رہے تھے آج وہی لوگ روڈی کو مجرم سمجھنے میں پیش پیش تھے۔ مقدمے کا فیصلہ کرنے میں جیوری کو پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا جیسا کہ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا فرید کو ہرجانے کے طور پر کاؤنٹی کی طرف سے بیس ہزار ڈالر دینے کا اعلان کیا گیا اور روڈی پر ایک شیرف کو بے عزت کرنے کے جرم میں پانچ ہزار ڈالر جرمانہ کیا گیا۔ یہ رقم بھی فرید کو ادا کی جاتی تھی۔

اس فیصلے پر فرید کو جتنی خوشی ہوئی کم تھی اس نے کہا کہ چونکہ کاؤنٹی کے خزانے میں اس وقت صرف سات ہزار ڈالر ہیں اس لئے فی الحال وہ انہی پر اکتفا کرے گا اور بقیہ رقم قسطوں میں وصول کر لے گا۔ روڈی کے بارے میں اس کا یہ فیصلہ تھا کہ اگر وہ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے کر گاؤں سے چلا جائے تو وہ اس سے پانچ ہزار ڈالر وصول نہیں کرے گا۔ دو دن بعد روڈی گاؤں سے چلا گیا۔ اس کے بارے میں آخری خبر یہ تھی کہ واشنگٹن میں گورنمنٹ کے کسی دفتر میں کام کر رہا ہے۔

جیسا کہ میرا خیال تھا، مقدمے کے فیصلے کے ایک ہفتے بعد کورا اسپیلے بھی نہ جانے کہاں سے واپس آگئی۔ کچھ دنوں بعد جب ایک پادری اور گرجا میں حمد گانے والی ایک لڑکی کے متعلق اسکینڈل کھڑا ہوا تو گاؤں والے فرید کے واقعے کو تقریباً پوری طرح بھول گئے۔ یہ خاموشی تقریباً چار پانچ ماہ تک برقرار رہی۔

اس کے بعد ایک بار پھر فرید گاؤں والوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ فرید کی پڑوسی مولی غائب ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی فرید کے مکان کے احاطے میں تیسری قبر نمودار ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں لوگ باتیں تو بہت بناتے تھے لیکن عملی قدم اٹھانے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ دراصل کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ فرید کے خلاف عملی اقدام کرے۔ میں فرید کے احاطے میں نمودار ہونے والی تیسری قبر کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کسی اور شخص میں بھی اس ..... معاملے میں ملوث ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ابھی تک کاؤنٹی فرید کا قرض ادا کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں نیا ڈسٹرکٹ اٹارنی فرید کا وہی چالاک اور عیار دوست تھا جس نے اس کا مقدمہ لڑا تھا۔

آج کل جب بھی چند آدمی کہیں اکٹھے ہوتے ہیں ان کا پسندیدہ موضوع گفتگو یہی ہوتا ہے کہ تیسری قبر میں مولی دفن ہے یا نہیں۔ میں؟ جہاں تک میرا سوال ہے، میں تو یہی کہوں گا کہ اس معاملے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ایک غریب شیرف کی تنخواہ میں اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے کہ وہ ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے کا بار اٹھا سکے، آپ کا کیا خیال ہے؟

آخری گواہ

ادریس ناصر

میں نے کافی بنا کر میز پر رکھی۔ دودھ کا ڈبہ پہلے ہی کھول چکا تھا۔ انڈا ابھی بس ایک منٹ میں تیار ہونے والا تھا۔ میں نے ڈبل روٹی کے توس کاٹ کر ٹوسٹر میں رکھے۔ ڈبل روٹی میں نے دس سینٹ میں خریدی تھی۔ کیونکہ وہ دو دن کی باسی تھی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر راہ داری میں آیا تاکہ صبح کا اخبار کچھ دیر کے لئے عاریتاً حاصل کر سکوں۔ اخبار والا روزانہ صبح کو ایک پرچہ میری مالکہ مکان کے دروازے کے سامنے ڈال جاتا تھا۔ اور چونکہ ابھی اس کے اٹھنے اور اخبار دیکھنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اس لئے اخبار اٹھانے اور سرسری نظر سے اسے دیکھ کر واپس وہیں رکھ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اخبار کھولا تو تالبوٹ کے مقدمے کی خبر ایک دو کالمی سرخی اور تین تصویروں کے ساتھ شائع کی گئی تھی۔ مجھے اس مقدمے سے کچھ ذاتی نوعیت کی دلچسپی تھی۔ دلچسپی کی ایک وجہ یہ تھی کہ میری سابقہ بیوی مجھ سے شادی کرنے سے پہلے اس کی سیکریٹری رہ چکی تھی اور شادی کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ ابھی ہماری شادی کو پچیس دن ہی گزرے تھے کہ ہمارے جھگڑوں کی ابتدا ہو گئی۔ مجھے نہیں کہ وہ کیا بات تھی جس پر میرلین نے چمک کر جواب دیا تھا کہ تم سے شادی کر کے میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اب اس بات کا خیال آتا ہے تو پچھتاتی ہوں کہ اگر میں چاہتی تو اس شخص سے بھی شادی کر سکتی تھی۔ اس شخص کا اشارہ ظاہر ہے تالبوٹ کی طرف تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ اس سے شادی کرنے میں کامیاب بھی ہو سکتی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ تالبوٹ نے اس وقت تک اپنی دوسری بیوی سے طلاق حاصل نہیں کی تھی۔

میں نے اس دو کالمی خبر کو گہری توجہ اور دلچسپی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جین تالبوٹ — اسٹافورڈ تالبوٹ کی دوسری سابقہ بیوی اپریل کی ایک صبح کو اپنے فلیٹ میں مُردہ پڑی پائی گئی تھی۔ کسی نے گزشتہ رات میں اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے یعنی جمعرات کو ایک نائٹ کلب میں اس کے اور تالبوٹ کے درمیان اتنی زبردست تکرار ہوئی کہ لوگ کلب میں ہونے والا اسٹیج شو دیکھنا بھول کر ان کا جھگڑا دیکھنے لگے تھے۔ پھر جمعہ کی رات کو دو افراد نے ایک شخص کو جس کا قد و قامت تالبوٹ کی طرح تھا، ٹھیک اسی وقت جین کے مکان میں جاتے دیکھا جو پولیس سرجن کی رپورٹ کے مطابق جین کی موت کا وقت تھا۔ اس وقت اتنا اندھیرا تھا کہ کسی کو پوری طرح دیکھنا اور پہچاننا ناممکن تھا — پھر ایک عورت نے دیکھا کہ مکان کے باہر کھڑی ہوئی ایک کار کی رجسٹریشن پلیٹ کے آخری تین عدد وہی ہیں جو خود اس کی اپنی کار کے ہیں اور سوئے اتفاق سے جو کار تالبوٹ کے پاس تھی اس کی پلیٹ کے آخری تین عدد بھی وہی تھے۔ اس کے علاوہ اس کی انگلیوں کے نشانات بھی جین کے فلیٹ میں جگہ جگہ پائے گئے۔

لیکن اس بارے میں تالبوٹ کا کہنا تھا کہ وہ اس واقعے سے ایک دن پہلے جین سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ مقدمے کا ایک معنی خیز پہلو یہ بھی تھا کہ تالبوٹ کو غصہ بہت جلدی آجاتا تھا اور غصہ بھی ایسا کہ لوگوں کے خیال کے مطابق وہ اس غصے کی حالت میں سب کچھ کر سکتا تھا۔

ان سب باتوں کے جواب میں تالبوٹ کا یہ کہنا تھا کہ وہ جمعہ کی رات کو اپنے گھر میں تھا اور اکیلا تھا۔ مجھے اس بات پر یقین تھا۔ کیونکہ اگر تالبوٹ نے اپنی سابقہ بیوی کو قتل کیا ہوتا تو اس کا وکیل اسے کوئی اور معقول اور قابل یقین کہانی تیار کر کے دیتا۔ چنانچہ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے اس بیان سے اس کی صفائی پیش کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی اور یہ کہ اسے اس قتل کے جرم میں اتنی لمبی مدت کی سزا مل سکتی ہے کہ جو اس کی زندگی کے بہترین سال چھین کر لے جا سکتی ہے تالبوٹ کو اپنے اس بیان پر اصرار تھا تو میرے نزدیک اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ حقیقت بھی یہی تھی اور تالبوٹ سچ بول رہا تھا۔

دوسری طرف استغاثہ کا کیس بھی بہت مضبوط نہیں تھا۔ کم از کم قانونی طور پر — اگرچہ اخبارات نے اپنی خبروں کے انداز اور تبصروں سے اپنے نزدیک اسے عدالت کے فیصلے سے قبل ہی قاتل قرار دے دیا تھا اور مسلسل ایسی سرخیاں شائع کر رہے تھے کہ عدالت اس معاملے میں قطعی انصاف سے کام لے اور تالبوٹ کی دولت یا اثر و رسوخ سے متاثر ہو کر اسے آزاد نہ چھوڑ دے۔ ان حالات میں یہ عین ممکن تھا کہ جیوری کے معزز ارکان جن کا انتخاب پہلے ہی ہو چکا تھا۔ عام پبلک اور اخبارات کی رائے کے مطابق ہی اپنا فیصلہ دے دیں۔

لیکن تیسری جانب میں نے بھی اپنے طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ تالبوٹ کو اس مقدمے میں ہرگز ہرگز سزا نہیں ہونی چاہئے۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ برش سے رگڑ کر جوتوں کو چمکایا۔ اخبار کو واپس مالکہ مکان کے دروازے کے سامنے رکھا اور پیدل اپنے آفس روانہ ہو گیا جو وہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ پیدل چلنے میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک تو ذرا چہل قدمی ہو جاتی تھی۔ دوسرے بس کا کرایہ جو کہ تیس سینٹ ہے بچ جاتا تھا۔

اگر میری اب تک کی تحریر سے آپ نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ میں بہت کنجوس آدمی ہوں اور ایک ایک سینٹ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتا ہوں تو اس میں آپ کا اتنا قصور نہیں جتنا میرے حالات کا ہے ادھر کچھ مدت سے میرے مالی حالات کچھ یوں ہی سے چل رہے تھے۔ پھر یہ کہ دولت ہی وہ سب سے بڑی وجہ تھی جو میرے اور میرلین کے درمیان جدائی کا سبب بنی۔ میں ایک وکیل ہوں اور میری سالانہ آمدنی بارہ تیرہ ہزار ڈالر سے زیادہ نہیں ہے۔ جبکہ میرلین پندرہ ہزار ڈالر سالانہ خرچ کرنا بھی اپنی توہین خیال کرتی تھی۔ چنانچہ یہ ظاہر تھا کہ میں کبھی اتنا دولت مند نہیں بن سکتا جو اسے ہر اعتبار سے خوش رکھ سکے۔ اور یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ کسی عدالت سے میری معقول آمدنی کو اپنے اخراجات کے لئے ناکافی قرار دے کر طلاق حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مجھ پر میری سیکریٹری کے ساتھ ناجائز تعلقات کا الزام عائد کیا اور چونکہ اس میں حقیقت بھی تھی (یعنی تعلقات تو تھے مگر ناجائز نہ تھے) اس لئے وہ عدالت سے طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس طلاق کے نتیجے میں مجھے اپنا گھر اور اپنی کار دے دینا پڑا۔ میرے دونوں بچے بھی عدالت نے اس کی تحویل میں دینے کا حکم صادر کیا چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ اور چونکہ ان سب کی کفالت کی ذمے داری بدستور میرے سر پر تھی اس لئے مجھے اسے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ بھی دینا پڑا ہر چند کہ اس کا خیال پھر بھی یہ تھا کہ یہ آمدنی اسے سفید پوشی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے ناکافی ہے۔ پھر یہ سب پر سود رہے۔ مزید زیادتی میرے ساتھ یہ ہوئی کہ مجھے اس کے وکیل کے قانونی مصارف بھی برداشت کرنا پڑے۔

چنانچہ ان تمام مرحلوں سے گزر کر جو آمدنی میرے پاس

باقی بچتی تھی وہ ساڑھے چار سو ڈالر ماہانہ سے زیادہ نہیں تھی۔ انہی ساڑھے چار سو ڈالر میں سے مجھے اپنے دفتر کے اکاؤنٹ کلرک کو تنخواہ بھی دینا پڑتی تھی اور نورین یعنی اپنی سیکریٹری سے تعلقات برقرار رکھنے کے سلسلے میں بھی تھوڑا بہت خرچ کرنا پڑتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیوں دو تین دن کی باسی ڈبل روٹی کھاتا تھا اور کیوں اپنے گھر سے دفتر تک پیدل جانے پر مجبور تھا۔

بہرحال دفتر پہنچ کر میں نے تالبوٹ کے وکیل لوئیس برگر کو فون کیا۔

”ہیلو لوئیس۔ میں گارنٹ بول رہا ہوں۔“ میں نے رابطہ قائم ہونے پر کہا۔ ”مقدمے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”جیت یقیناً ہماری ہوگی۔“ لوئیس نے جواب دیا۔ ”سرکاری وکیل کے کیس میں کوئی جان ہی نہیں ہے۔“

مگر الفاظ جتنے حوصلہ افزا تھے اس کا لب و لہجہ اتنا پُرامید نہیں تھا۔

”کیا تم ایک اور گواہ کو حاصل کرنا پسند کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک گواہ۔ بھلا کون وکیل اس سے انکار کرسکتا ہے۔“ لوئیس نے کہا۔ ”مگر وہ گواہ کون ہے؟“

”میں خود۔“

لوئیس یہ سن کر کوشش کے باوجود اپنا جوش نہیں چھپا سکا۔

”کیا ہم آج دوپہر کا کھانا ساتھ نہیں کھا سکتے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

❁❁

لوئیس کا جسم کافی بھاری پڑ گیا تھا۔ اس نے دوپہر کے کھانے میں اپنے لئے صرف سلاد اور چائے پسند کی اور یہ جاننے کے جوش کے باعث کہ میری گواہی کی نوعیت کیا ہے، وہ بھی پوری طرح نہیں کھا سکا دوسری طرف میں نے ایک پُرتکلف لنچ کا آرڈر دیا اور ایک پلیٹ بھی خالی نہیں چھوڑی۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ ویٹر بل لئے ہماری میز کی طرف بڑھ رہا ہے تو لوئیس سے مخاطب ہوا۔

”معاف کرنا دوست۔“ میں نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے دفتر کو ایک ضروری فون کرنا ہے۔ فون کرکے بس ابھی ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔“

میں اٹھ کر ریسٹورنٹ میں لگے ہوئے فون بوتھ میں داخل ہوا۔ ہک سے ریسیور اٹھایا لیکن نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے انگلی سے دبائے رکھا۔ پھر ریسیور میں جو جی میں آیا کہتا چلا گیا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد جب میں اپنی ضروری فون کال کرکے واپس آیا تو لوئیس کھانے کا بل ادا کرچکا تھا۔

❁❁

سرکاری وکیل نے اپنا کیس پیش کرتے ہوئے کسی ذہانت و دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ حد یہ کہ وہ جین کے سابقہ شوہر کو یہ ثابت کرنے کے لئے پکڑ لایا کہ جین اپنے مزاج کے اعتبار سے کس طرح مردوں کو غصہ دلانے کے فن میں ماہر تھی۔

لوئیس نے سب سے پہلے خود تالبوٹ کو گواہوں کے کٹہرے میں پہنچا دیا۔ تالبوٹ نے تسلیم کیا کہ ممکن ہے کہ اسی غصے کے عالم میں اس نے کبھی یا اکثر جین کو یہ دھمکی دیدی ہو کہ وہ اس کی گردن توڑ دیگا یا گلا گھونٹ دے گا۔ مگر یہ کہ غصے کے عالم میں منہ سے نکلے ہوئے ان الفاظ کا کبھی کوئی سنجیدہ مفہوم نہیں رہا۔ بلکہ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کلب میں ان کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا۔ اور یہ کہ اگر رات جھگڑے کے موقعے پر اس نے جین کو ایسی ہی کوئی دھمکی دیدی ہو تو اس سے بھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ سچ مچ اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جمعے کی رات کو وہ اپنے گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ اور ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ فلم دیکھتے ہی دیکھتے وہ کرسی پر سو گیا اور اب اسے کچھ یاد نہیں کہ اس فلم کا نام کیا تھا یا وہ کس بارے میں تھی۔

سرکاری وکیل اپنی حماقت سے پورے پچاس منٹ تک اس سے جرح کے سوالات کرتا رہا لیکن وہ نہ تو تالبوٹ کے پُرسکون رویے کو ختم کرسکا اور نہ اس کی زبان سے کوئی ایسی بات اگلوا سکا جو اس کے بیان کی تردید میں ہوتی۔

لیکن اس کے باوجود اس وقت تک جہاں تک میرے اندازے کا تعلق تھا۔ جیوری کے ارکان تالبوٹ کو بدستور مجرم خیال کر رہے تھے لیکن پھر تالبوٹ کے بعد لوئیس نے اپنے دوسرے گواہ کو پیش کیا۔ یعنی مجھے۔ میرا بیان بہت سادہ اور صاف تھا۔ میں نے بتایا کہ تالبوٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ کیا میں اس کی فرم کے انکم ٹیکس کے معاملات کی دیکھ بھال کرسکتا ہوں۔ میری واقفیت تالبوٹ سے یوں ہوئی تھی کہ چند ماہ پہلے میری بیوی نے اس کا مجھ سے تعارف کرایا تھا اور تالبوٹ نے یہ سن کر کہ میں انکم ٹیکس کے مقدمات لیتا ہوں مجھ سے کہا تھا کہ میں کبھی بھی کسی بھی وقت اس سے اس معاملے میں گفتگو کرنے کے لئے اس کے گھر آ جاؤں کیونکہ وہ انکم ٹیکس کے کاغذات وغیرہ اپنے گھر پر ہی رکھتا ہے۔ جمعہ کی رات کو میں تالبوٹ کے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا مجھے اچانک اس کی بات یاد آ گئی اور پھر اگرچہ اس وقت کافی رات ہوچکی تھی لیکن میں یہ خیال کرکے کہ میں پہلے ہی بہت تاخیر کرچکا ہوں، اسی وقت اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے ایک بالکنی نما کمرے کی کھڑکی سے اسے ایک آرام کرسی پر سوتے ہوئے دیکھا جب کہ اس کے سامنے رکھا ہوا ٹی وی آن تھا۔ اسے سوتے دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کردیا اور اسے جگانے کی زحمت دیئے بغیر واپس لوٹ لیا۔ اور ہاں اس وقت رات کے ٹھیک گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔

سرکاری وکیل نے اپنی جرح شروع کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ میں اب تک انتظار کیوں کرتا رہا۔ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔ سرکاری وکیل کو یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میرے جواب نے اس کے کیس کا اور کباڑا کر دیا۔ میں نے بتایا کہ میرے نزدیک تالبوٹ کی بے گناہی اس قدر واضح تھی کہ مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اسے میری گواہی کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ سرکاری وکیل نے شور و غوغا کر میرے جواب کو عدالت کے ریکارڈ سے حذف کرا دیا۔ لیکن میرا جواب جیوری پر جو اثر ڈالنا تھا ڈال چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ یوں تو سرکاری وکیل بہت لائق و فائق تھا مگر صرف اسی صورت میں جب اس نے اپنے کیس کی اچھی طرح تیاری کرلی ہوتی۔ اور جب کبھی ایسا نہیں ہوتا تو وہ بلاوجہ اشتعال میں آکر خود اپنا کیس خراب کرلیا کرتا تھا۔ چونکہ میں نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے اہم ترین سوالات کیا ہوسکتے ہیں اس لئے میں جوابات کی پوری تیاری کے ساتھ کمرۂ عدالت میں داخل ہوا تھا۔ وہ یہ ثابت نہیں کرسکتا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حقیقت نہیں ہے کیونکہ اس رات میں بھی اکیلا ہی تھا اور کوئی شخص میرے بیان کی تردید نہیں کرسکتا تھا۔

مقدمے کی کارروائی ختم ہوئی تو جیوری کے معزز ارکان اپنے فیصلے کے بارے میں باہم مشورہ کرنے اور کسی ایک فیصلے پر پہنچنے کے لئے اٹھ گئے مگر انہیں متفق ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ صرف نصف گھنٹے میں باہر آگئے اور ان کے فورمین نے جج صاحب کو بتایا کہ یہ جیوری ملزم اسٹانورڈ تالبوٹ کو اس الزام سے بری الذمہ اور بے گناہ خیال کرتی ہے جو اس پر عاید کیا گیا ہے۔

❁❁

تالبوٹ نے مسرت سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنے وکیل لوئیس سے ہاتھ ملایا۔ مجھ سے مصافحہ کیا۔ میرے شانے پر شاباشی کے انداز میں تھپکی دی۔

”اگر میں کبھی بھی تمہارے کام آسکوں تو مجھے ازحد خوشی ہوگی۔“ اس نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

اور پھر اس سے پہلے کہ میں اسے یہ بتا سکوں کہ اگر وہ اپنے انکم ٹیکس کا کام میرے سپرد کرتے تو یہ اس کی ممنونیت کا بہترین مظاہرہ ہوگا۔ وہ مبارکباد دینے والے افراد کے ہجوم کو چیرتا اور دھکیلتے ہوئے

جدید شاعری کی ایک مثال

در کے درخت پر تو
او رہی ہے یا کر بکری
آنکھیں تو ہیں ”غزال“
یہ بھی ممکن ہے اک حسینہ
بیٹھی ہو منتظر کسی کی۔

مرسلہ: رضا زبیری، کراچی

ہاتھوں کو نظرانداز کرتا ہوا ایک جانب چل دیا اور میں نے دل میں سوچا کہ خیر کوئی بات نہیں۔ اب نہ سہی، پھر کبھی سہی۔ مجھے اس سے اپنی بات کہنے کا موقع ضرور ملے گا۔

وہ لوگوں کے ہجوم میں آگے بڑھتا ہوا کمرۂ عدالت کے پچھلے حصے کی جانب جا رہا تھا جہاں میریلین اس کا انتظار کر رہی تھی، اور اس وقت اس کا چہرہ اتنا ہی بشاش اور اس کے ہونٹوں پر اتنی ہی دلکش مسکراہٹ تھی جسے میں نے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب وہ ایسی ہی کسی اور عدالت میں اپنا طلاق کا مقدمہ جیت کر اور مجھے عملاً کنگال بنا کر کمرۂ عدالت سے باہر جا رہی تھی۔

”خدا کرے تمہیں جلد ہی اپنا ہنی مون منانے کا موقع ملے۔“ میں نے خلوص دل سے اس کے اور تالبوٹ کے لئے دعا مانگی ”ہنی مون ہر اعتبار سے کامیاب رہے۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ میریلین کے ساتھ تالبوٹ کا رومان ایک ایسی چیز تھی جسے میں اس کے سزایاب ہونے کی صورت میں برباد کرنا گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے ابتدا میں آپکو بتایا اس معاملے سے مجھے ذاتی دلچسپی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً میں بیان کرچکا ہوں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر میریلین اور تالبوٹ کا رومان کامیاب رہتا ہے اور میریلین اس سے شادی کرلیتی ہے تو اس صورت میں اسے مجھ سے کسی قسم کی رقم وصول کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے میری آمدنی سے محروم ہوکر کوئی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ اس کے بدلے وہ اپنے لئے وہ سب کچھ حاصل کرلے گی جس کی اسے خواہش تھی لیکن میرے لئے اس سے بہت بڑا فرق واقع ہوجاتا تھا بلکہ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ میں اپنے بچے بھی اس سے واپس لے سکوں۔

میں نے کمرۂ عدالت سے رخصت ہونے سے پہلے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ اور میں نے ایک بار پھر ان کی جلد از جلد شادی کی دعا مانگی۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں میری اپنی مفلسی کا علاج ممکن تھا جس کے لئے میں نے رضاکارانہ طور پر گواہی دینے کی زحمت گوارہ کی تھی۔

٭٭٭

• ساجدہ معراج •

ایک ایسے شخص کی داستان جس سے عبت کی خاطر بن کی بڑی ناری

جرم و سزا کے موضوع پر ایک جذباتی اور ناثر انگیز کہانی!

سفید رنگ کی رولز رائس کار واشنگٹن کے جارجیا ایونیو سے دائیں طرف گھوم کر والٹر ریڈ آرمی میڈیکل سینٹر کے صدر دروازے میں داخل ہوگئی۔ گیٹ پر بنے ہوئے چھوٹے سے گارڈ ہاؤس پر پہرا دیتے ہوئے ایم پی سنتا سے آگے جانے کی اجازت دیدی۔ کار سنجیدہ روش پر چلتی ہوئی۔ کمانڈنگ جنرل کے مکان سے آگے بڑھی مین بلڈنگ کے سامنے لگے ہوئے فوارے کے گرد گھومتی ہوئی ریڈ کراس بلڈنگ کے سامنے جا کر رک گئی۔

کار کا شوفر جو کہ ایک چھریرے جسم، ناتواں کندھوں اور دبلے پتلے گلابی چہرے کا مالک تھا۔ کار کا انجن چلتے ہوئے چھوڑ کر نیچے اُترا۔ اس نے گہرے نیلی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سفید قمیض پر سیاہ رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ کار سے اُترتے ہوئے اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ چار بج کر اٹھائیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ مقررہ وقت سے دو منٹ پہلے آگیا تھا۔

چند مریض نیلے رنگ کے گاؤن پہنے ہوئے عمارت سے باہر نکلے۔ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جن کے چہرے بگڑ گئے تھے کسی کا بازو کٹا ہوا تھا اور کوئی اپنی ایک ٹانگ سے محروم بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا جا رہا تھا۔ پھر ایک آدمی جس نے پرائیویٹ یونیفارم پہنی ہوئی تھی باہر آیا اور ایک سگریٹ سلگانے کے لئے رک گیا۔ اگرچہ اس نے ہسپتال کا مریضوں کے لئے مخصوص نیلے رنگ کا گاؤن نہیں پہنا ہوا تھا لیکن اس سپاہی کو ایک مریض سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں زردی مائل ہو رہی تھیں جن میں کسی قسم کا کوئی تاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی بھی جذبے کے اظہار سے قاصر ہے۔ ویتنام کی جنگ میں بہت سے زخمی فوجیوں کی طرح اسے دیکھ کر بھی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنی کوئی نہ کوئی چیز گم کر بیٹھا ہے۔ مگر کیا چیز۔ یہ بظاہر نہیں معلوم ہوتا تھا

اس کے علاوہ ایک موٹا سا آدمی اور بھی تھا جس نے شہری لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ وہ پوسٹ تھیٹر کے سامنے کھڑا ہوا بورڈ پر لگے پلے کارڈ پڑھ رہا تھا۔ اور کچھ گھبراہٹ کے انداز میں کبھی کبھی ریڈ کراس بلڈنگ کے دروازے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ جیسے ہی اسے کار آتے دکھائی دی تھی وہ کچھ اور زیادہ چوکنا ہو گیا تھا پھر جب وہ سپاہی باہر آیا تو اس آدمی نے آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

اسی اثنا میں ایک نوجوان عورت جس نے ریڈ کراس کی وردی پہن رکھی تھی عمارت سے باہر نکلی۔ وہ کودتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگی اور اس کے سنہری بال شانوں پر اُچھلنے لگے۔ شوفر نے اسے آتے دیکھا ادب سے جھکا اور آگے بڑھ کر کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ نوجوان شوفر کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لمحہ ٹھہری۔ مسکراتے ہوئے اس سے کوئی بات کہی اور پھر کار میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور دروازہ بند کر کے گھوما تو سرد آنکھوں والے سپاہی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

اور اس کے بعد واقعات کی رفتار یکدم تیز ہوگئی۔ موٹا شہری جلدی سے دوسری جانب سے کار کی پچھلی سیٹ کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نوجوان عورت چونک کر اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر ڈرائیور اس طرف گھوما کہ دیکھے کیا ہو رہا ہے کہ پھر جیسے بجلی کوندی۔ سپاہی نے ایک چھوٹے سے ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگاتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ گولی ڈرائیور کے بھیجے میں اُتر گئی ادھر وہ نیچے گرا ادھر سپاہی لپک کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار کو گھمایا اور تیزی سے صدر دروازے کی طرف چل دیا۔

فائر کی آواز سن کر ایک مریض جو کہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا عمارت کی طرف آ رہا تھا ایک دم سے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ اس وقت بھی بدستور رو رہا تھا جب فوجی پولیس کی امداد کے لئے ایف بی آئی کے ایجنٹ ہسپتال میں داخل ہوئے۔

❖❖❖

جب فون کی گھنٹی بجی تو ڈولٹن لینی اپنی بہت سی کمپنیوں میں سے ایک کی تفصیلی رپورٹ پڑھ رہا تھا جو کسی اہم تعمیراتی منصوبے کے بارے میں تھی۔ ٹیلیفون ۔ چاہے اس کے واشنگٹن آفس میں ہو یا یہاں میری لینڈ سٹیٹ آفس میں۔ ڈولٹن نے اپنی آسانی کیلئے لگوائے تھے تاکہ فون کرنے والوں کی پہچان کے لئے۔ چنانچہ اگر جواب دینے میں اس کی مصروفیت حارج ہوتی تھی تو وہ انہیں نظر انداز کر دیتا تھا۔ اور یہ انتظار کرتا کہ تین مرتبہ گھنٹی بجنے تک اس کی سیکرٹری فون اُٹھا لے۔ لیکن اس وقت جس فون کی گھنٹی بج رہی تھی وہ اس کا سبز رنگ کا فون تھا جبکہ کوئی اسسٹنٹ سیکرٹری کے کمرے میں نہیں تھا۔ یہ سبز فون اس کا سب سے زیادہ اہم اور پرائیویٹ فون تھا جس کا نمبر بہت ہی کم اور بہت ہی اہم افراد کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا اور صرف کسی بہت ہی ہنگامی ضرورت کے وقت استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ اس کی آواز سنتے ہی ڈولٹن نے رپورٹ ایک طرف رکھی اور ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو" اس نے کہا۔

جواب میں ایک بھدی اور بظاہر ایسی آواز جیسے کوئی لہجہ بدل کر بول رہا ہو اس کے کانوں سے ٹکرائی "مسٹر لینی" بولنے والے نے کہا "ہم نے تمہاری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ اگر تم اسے صحیح سلامت واپس لینا چاہتے ہو تو ابھی سے پانچ لاکھ ڈالر نقدی کی صورت جمع کرنا شروع کر دو۔ کوئی بھی نوٹ سو ڈالر سے زیادہ کا نہ ہو۔ اور سب نوٹ پرانے اور استعمال شدہ ہوں۔ تمہیں اس کام کے لئے ایک ہفتے کی مہلت حاصل ہے جس طرح تمہیں بتایا جائے اسی طرح کرنا۔ ورنہ تمہاری بیٹی کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس کے شوفر کا ہو چکا ہے۔"

اور اس کے بعد فون خاموش ہوگیا۔ اور زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ڈولٹن کو بات کرنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنے انٹرکام پر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔

"میری بیٹی سے کہو کہ میں اس سے اپنے آفس میں ملنا چاہتا ہوں" اس نے حکم دیا۔

اور اس کے چند منٹ بعد فلس لینی دروازہ کھولتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کا قد پانچ فٹ دو انچ تھا۔ خوبصورت تھی اور لمبے لمبے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"ڈیڈی" اس نے آتے ہی کہا "آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے فلیٹ میں ایک دوست کے اعزاز میں پارٹی دے رہی ہوں اور اس کے انتظامات میں مصروف ہوں۔ پھر آپ نے مجھے اس وقت اپنا کام چھوڑ کر یہاں آنے پر کیوں مجبور کیا۔؟"

"مجھے ابھی ابھی ایک شخص کی طرف سے فون ملا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے تمہیں اغوا کر لیا ہے" ڈولٹن نے جواب دیا۔

"اوہ" فلس نے جلدی سے کہا "میں نے اپنے شوفر سے کہا تھا کہ وہ والٹر ریڈ کے ہسپتال سے ٹھیک ساڑھے چار بجے میری ایک سہیلی روتھ لورڈ کو لے آئے۔ ان کے پاس ایک ہی کار ہے اور وہ اس کا شوہر لے گیا تھا۔ اور ڈیڈی روتھ دیکھنے میں مجھ سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔"

پال لارڈ۔ اغوا ہونے والی عورت کا شوہر یہ خبر پاتے ہی سیدھا ڈولٹن کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی اپنی کار ایک ایف بی آئی کے ایجنٹ کی کار کے پاس کھڑی کی اور تیزی کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ ایک اوسط درجے کے قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ سر کے بال چھوٹے رکھنے کی عادت اسے اپنی فوجی زندگی کے زمانے سے پڑ گئی تھی۔ اس وقت اس نے بھورے رنگ کی پتلون اور آدھی آستینوں کی قمیض پہن رکھی تھی اور یہ وہ لباس تھا جو وہ میری لینڈ یونیورسٹی کی کلاسوں میں

استعمال کرتا تھا۔

اسے پہلے سے اندیشہ تھا کہ فلس لینی اور اسکی بیوی روتھ کی دوستی اس کی بیوی کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ فلس لینی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے روتھ امیرانہ زندگی کے لوازمات دیکھے گی اور ان کی عادی ہوجائے گی لیکن جب وہ سامانِ عیش و عشرت اسے اپنی زندگی میں نظر نہیں آئے گا تو ان کے درمیان باہمی جھگڑوں کی بنیاد پڑ جائے گی۔ لیکن اپنے ان تمام خدشات کے باوجود اسے گمان تک نہیں تھا کہ ایک دن اس کی بیوی کو فلس لینی کے شبے میں اغوا کرلیا جائے گا۔ ان کی شادی کو ابھی بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا اور ان کی آمدنی اتنی محدود تھی کہ انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جب تک پال اپنی قانونی تعلیم مکمل کرکے وکالت نہیں کرنے لگتا اور ان کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا وہ بچوں کو پیدا ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔

جس وقت بٹلر اسے ڈولٹن لینی کے پرائیویٹ آفس کی طرف لیے جا رہا تھا تو پال کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی ایک سالہ شادی شدہ زندگی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کو غلطی سے اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سلسلے میں فلس لینی کے شوہر کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔ چنانچہ یہ امید کم ہی تھی کہ اگر اغوا کرنے والوں کا مطالبہ تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی وہ روتھ کو زندہ و سلامت واپس کردیں گے۔ جس وقت بٹلر نے ڈولٹن کے آفس کا دروازہ کھولا تو ڈولٹن کسی سے بات کر رہا تھا۔

"بیشک میں ان لوگوں کو ایک سینٹ بھی دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر ایک مرتبہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ میں اس طرح دباؤ میں آکر جنبی لوگوں کی چھکیوں سے مرعوب ہوکر رقم ادا کرسکتا ہوں تو پھر اس سلسلے کا کہیں خاتمہ نہیں ہوگا۔"

اسی وقت اس کی نظر پال پر پڑی اور اس نے پوچھا۔

"یہ کون ہے۔؟" ایف بی آئی کے ایجنٹوں نے جو کمرے میں موجود تھے پلٹ کر دیکھا۔ ان کے ساتھ ہی فلس نے بھی گھوم کر پال پر نگاہ ڈالی اور اسے پہچان کر تیزی سے آگے بڑھی۔

"اوہ پال مجھے اس واقعہ پر بے حد افسوس ہے۔" اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پال کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور اسے اپنے باپ کی میز کے پاس لے کر آئی۔

"ڈیڈی یہ پال لارڈ ہے، روتھ کا شوہر۔"

"وہ تو یہ اس کا شوہر ہے۔" ڈولٹن بولا۔ "مجھے اس حادثے پر افسوس ہے۔" پال نے اس کی بات کو نظر انداز کردیا۔

"تم ابھی زیرِ مطالعہ کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" وہ بولا۔ "وہ لوگ کتنی رقم مانگ رہے ہیں۔؟"

"پانچ لاکھ ڈالر، چھوٹے اور استعمال شدہ نوٹوں کی صورت میں۔" کمرے میں اس وقت ایف بی آئی کے چھ ایجنٹ موجود تھے۔

ان میں سے ایک نے پال کا بازو پکڑ کر اسے ڈولٹن کی میز سے دور کرنا چاہا۔

"مسٹر لارڈ میں تم سے کچھ پوچھنا......" پال اس کی طرف پلٹ پڑا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ میں کس طرح ان لوگوں کو اپنی بیوی کو قتل کرنے سے باز رکھ سکتا ہوں اور اسے صحیح سلامت واپس لا سکتا ہوں۔؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن......"

"تب پھر اپنے ہاتھ مجھ سے الگ رکھو اور اپنی زبان بند کرلو۔" پال نے کہا۔

ایجنٹ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈولٹن نے یہ منظر قدرے حیرت سے دیکھا۔

"اوکے۔" پال اس سے مخاطب ہوا۔ "وہ رقم کس طرح وصول کرنا چاہتے ہیں۔؟"

"یہ ابھی انھوں نے نہیں بتایا۔" ڈولٹن نے جواب دیا۔ "انھوں نے صرف اتنا کہا کہ انھیں پانچ لاکھ ڈالر درکار ہیں اور یہ کہ میں ایک ہفتے کے اندر اس رقم کا انتظام کرلوں۔"

"میری بیوی زیادہ مضبوط نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ بیمار ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ وہ دل کی مضبوط نہیں ہے۔ یہ تجربہ اس پر بری طرح اثر انداز ہوگا۔" اس نے رک کر تمام ایجنٹوں کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ کوئی ایسا کام کرو جو اسے اور زیادہ خطرے میں مبتلا کردے۔ اخبار والوں کو یہ بات مت بتانا کہ وہ لوگ غلط عورت کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ وہ مسٹر لینی کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہیں کرسکتے تو وہ دوبارہ فون کرنے کی زحمت نہیں کریں گے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر ڈولٹن کی طرف گھوما۔

"اگر وہ دوبارہ فون کریں تو ان سے کہنا کہ تم نے رقم فراہم کرلی ہے اور یہ کہ وہ اسے کس طرح وصول کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن میں رقم ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" ڈولٹن نے جواب دیا۔

پال نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی میز پر رکھ دیے اور اتنا جھکا کہ اس کا چہرہ ڈولٹن سے صرف چند انچ کے فاصلے پر رہ گیا۔

"مسٹر تم انھیں وہی بات بتاؤ گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ روتھ میری بیوی ہے۔ اس لیے یہ معاملہ اس طرح کیا جائے گا جس طرح میں چاہوں گا۔ اور تم لوگوں میں سے کوئی مجھے اس سے زیادہ غصہ دلانے کی کوشش نہ کرے جتنے غصے میں میں پہلے ہی ہوں۔"

ڈولٹن سے آج تک کسی نے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ اس نے پال کو کمرے سے جاتے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کا اپنا منہ حیرت سے

کھلا ہوا ہے۔ اس نے جلدی سے منہ بند کیا اور کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"افوہ۔" فلس نے عجیب لہجے میں کہا۔ "اس سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔"

"پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔" اس کے باپ نے کہا۔ "کس سے کس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے۔"

"ہسپتال میں بہت سے ایسے افراد ہیں جو ویتنام کی لڑائی میں اس کے ساتھ رہ چکے ہیں۔" فلس نے جواب دیا۔ "اور وہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔"

"ایک حد تک وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔" ڈولٹن نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "وہ عورت اس کی بیوی ہے۔ اس لیے فیصلے کا اختیار بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ہاتھ میں نہیں۔"

ایجنٹوں کا انچارج ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"ممکن ہے یہی بات ہو جناب۔ لیکن اس فون نمبر کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس پر اغوا کرنے والے نے آپ کو فون کیا تھا۔ کیا میرا یہ اندازہ درست ہے کہ وہ نمبر ڈائریکٹری میں درج نہیں ہے۔"

"میرے تمام فون نمبر ڈائریکٹری میں شائع نہیں کیے جاتے۔" ڈولٹن نے جواب دیا۔ "اور وہ نمبر تو ان سب سے زیادہ پرائیویٹ اور اہم ہے۔ ایک درجن سے بھی کم آدمی اس نمبر سے واقف ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی وہ نمبر اغوا کرنے والوں کو نہیں بتایا ہوگا۔"

"پھر بھی آپ مجھے ان لوگوں کے نام بتا دیں۔" انچارج نے کہا۔ "ہمیں ان سب کو چیک کرنا پڑے گا۔"

ڈولٹن نے کندھے اچکائے اور انچارج کو ان لوگوں کی فہرست دیدی جو وہ خاص نمبر جانتے تھے۔ اور ان میں سب سے پہلا نام ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کا تھا۔

بروس اور وکٹر دونوں کے نام کا آخری جز کولس ایک ہی تھا لیکن وہ حقیقی بھائی نہیں بلکہ رشتے کے بھائی تھے۔ البتہ وہ گزشتہ پانچ سال سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ پہلے وہ ایک ٹیلیفون کمپنی میں لائن مین تھے لیکن بعد میں کچھ غیر قانونی سرگرمیاں شروع کردیں اور ان کا آخری کارنامہ روتھ لارڈ کو اغوا کرنا تھا۔

جرائم سے ان کی وابستگی کی ابتدا ایک حادثے سے ہوئی تھی۔ بروس ایک کھمبے سے گرا اور سر کے بل زمین پر آرہا جس کے نتیجے میں اسے شدید دماغی ضربات آئیں۔ اس کی ذہانت تقریباً بالکل ہی ختم ہوکر رہ گئی۔ اور جب وہ صحت یاب ہوا تو ذہنی اعتبار سے اس میں اور ایک بچے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ چونکہ اسے شدید ذہنی چوٹیں آئی تھیں اس لیے ملنے والی انشورنس کی رقم بھی بہت بڑی تھی۔ جب سارے معاملات طے ہوگئے تو دونوں بھائیوں نے شہزادوں کی طرح رہنا شروع کردیا۔ وہ

زیادہ تر سیر و سیاحت میں رہتے تھے، بہترین ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے بہترین ریسٹورنٹوں میں کھانا کھاتے تھے، بہترین اور قیمتی لباس پہنتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے قیمتی کپڑے ڈرائی کلینرز کی دکان پر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہوجاتے تھے اور وہاں نئے سرے سے قیمتی ملبوسات خرید لیا کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے جوا بھی کھیلنا شروع کردیا اور بڑی بیدردی و بے رحمی کے ساتھ انشورنس سے ملنے والی رقم دونوں ہاتھوں سے خرچ کرنے لگے۔ وہ اس طرح بے فکری سے یہ شاہانہ زندگی گزار رہے تھے جیسے ان کی دولت کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ لیکن وہ چھ مہینے سے زیادہ ساتھ نہیں دے سکی۔ اس وقت تک اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ وکٹر دوبارہ لائن مین کی ملازمت اختیار کرنے پر آمادہ ہوجائے اور زندگی گزارنے کیلئے کھمبوں پر چڑھنا شروع کردے۔ اور بروس میں تو یہ صلاحیت بھی باقی نہیں تھی کہ وہ کسی بھی قسم کی کوئی ملازمت کرسکتا۔ چنانچہ ایسی صورت میں انھوں نے اپنی مشکلات کا حل جرائم پیشہ زندگی اختیار کرکے حاصل کیا۔ وہ دونوں مل کر مسلح ڈاکے ڈالتے تھے۔

یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اس سے بیک وقت بہت سی رقم ضرور حاصل ہوجاتی تھی۔ اور اس طرح وہ جس طرزِ زندگی کے عادی ہوچکے تھے وہ جاری رہ سکتی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو ڈاکے ڈالتے تھے۔ پہلے انھوں نے پٹرول پمپوں کو لوٹا، پھر سپر مارکیٹ پر ڈاکے ڈالنے لگے، پھر بعض بینکوں کی چھوٹی شاخوں تک ان کی دسترس ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی وکٹر کو احساس ہوگیا کہ ڈاکے بہت زیادہ محنت طلب بھی ہیں اور ان میں خطرہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

وکٹر کو یاد تھا کہ جب ڈولٹن کے عالیشان بنگلے میں ٹیلیفون لائن بچھانے کا کام ہو رہا تھا تو وہ بھی کام کرنے والوں میں شامل تھا اور اس نے ان تمام فون نمبروں کو نوٹ کرلیا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس نے ان نمبروں سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ اب تک اس سلسلے میں کچھ کیا تھا۔ ڈولٹن کا سبز رنگ کا فون بطور خاص بہت اہم معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کا تعلق براہ راست واشنگٹن ڈی سی کے ایک ٹیلیفون ایکسچینج سے تھا۔ اور بنگلے میں کسی جگہ اس کا کوئی ایکسٹینشن بھی نہیں تھا چنانچہ وکٹر نے اس نمبر کے گرد ایک سرخ دائرہ کھینچ رکھا تھا۔

پھر اسے ڈولٹن لینی کی سفید رولز رائس کار بھی یاد تھی اور اس نے ایک صبح یہ بھی دیکھا تھا کہ ڈولٹن کی بیٹی اس سفید کار میں لٹر لینڈ آرمی ہسپتال بھی گئی تھی۔ اس یادداشت کی بنیاد پر وکٹر نے کچھ مزید معلومات حاصل کیں اور فلس لینی کے اغوا کا پلان تیار کرلیا۔

اور اب چند ہفتوں کے بعد اس پلان پر عمل درآمد شروع

ہو چکا تھا۔ وہ اپنی کار میں ورجینیا کی ایک سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ بروس نے اپنی فوجی قمیض اور ہیٹ اُتار دیا تھا اور سی مشینی انداز میں کار چلا رہا تھا جس انداز میں وہ اپنے دوسرے تمام کام سرانجام دیتا تھا وکٹر پچھلی سیٹ کے درمیان اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں پیر کار کے فرش پر پڑی ہوئی بے حس و حرکت روتھ کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ جب وہ کریک پارک میں رولز رائس کار چھوڑ کر اپنی کار میں بیٹھ رہے تھے تو روتھ نے بھاگنے کی کوشش کی تھی جس کے جواب میں وکٹر نے اسے ایک ہی گھونسا مار کر بیہوش کر دیا تھا اور اس وقت سے روتھ اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے رُک کر ایک پبلک فون بوتھ سے ڈولٹن لینی کو فون بھی کر دیا تھا۔

بروس نے کار کی رفتار ہلکی کرتے ہوئے اسے داہنی جانب ایک کچی سڑک پر موڑ دیا جو سیدھی ایک فارم کو جاتی تھی۔ اس کے چند منٹ بعد وہ ایک شکستہ سے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ بروس نے کار روکی اور بیہوش روتھ کو اندر لے جانے میں وکٹر کی مدد کی۔ عمارت کے بڑے بیرونی کمرے میں آہنی سلاخوں کا ایک حوالات نما کٹہرہ سا بنا ہوا تھا جس میں صرف ایک بوسیدہ سا جوٹ کا گدا پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے روتھ کو اس گدے پر ڈال دیا۔ وکٹر نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کی قمیض کے گریبان کے چند بٹن کھولے اور ہاتھ اندر ڈال کر اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔

"یہ سانس بھی لے رہی ہے اور اس کا دل بھی ٹھیک دھڑک رہا ہے۔" وہ بولا۔

وہ دونوں کٹہرے سے باہر نکل آئے۔ وکٹر نے اس میں ایک بڑا سا تالا ڈال دیا۔

"کیا تمہیں اس کے مکا مارنا ضروری تھا؟" بروس نے پوچھا۔

"تم نے خود دیکھا کہ وہ بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔" وکٹر نے جواب دیا۔ "اگر میں اسے نہ مارتا تو ممکن تھا وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی۔"

"مگر تم نے وعدہ کیا تھا۔" بروس بولا۔ "تم نے کہا تھا کہ اگر اسے مارنا ہی پڑا تو یہ کام میں خود کروں گا۔"

تقریباً بیس منٹ کے بعد روتھ کو ہوش آیا اور وہ درد سے کراہتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے چہرے کا بایاں حصہ وکٹر کے گھونسے کی وجہ سے نہ صرف سیاہ پڑ گیا تھا بلکہ سوج بھی گیا تھا۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔

"یہ آنسو بہانا بند کرو۔" وکٹر نے تیزی سے کہا۔ اور روتھ یوں سہم گئی جیسے کسی نے اسے زور سے ٹھوکر ماری ہو۔

"اب اگر تم نے ذرا سی بھی آواز نکالی تو الیسی مرمت کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گی۔" وکٹر بولا۔

"تم — تم — مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" روتھ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"دولت کے علاوہ اور کیا چاہ سکتے ہیں۔" وکٹر نے جواب دیا۔ "تمہارا بوڑھا باپ اگر تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو اسے اپنی خطیر دولت کا ایک حصہ ہمیں دینا پڑے گا۔"

روتھ نے بتانا چاہا کہ وہ اسے غلط سمجھ رہے ہیں۔ وہ ڈولٹن لینی کی بیٹی نہیں ہے۔ مگر وکٹر اور بروس کچھ سننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ پھر بعد میں وکٹر نے بروس سے کہا کہ وہ اس عورت پر نگاہ رکھے کیونکہ وہ کچھ دیر سونے جا رہا ہے اور یہ کہ انھیں اس جگہ پورا ایک ہفتہ گزارنا ہے۔

***

جس وقت پال ملیسٹ پوٹومک پارک سے ایک کشتی چرا کر واشنگٹن چینل میں کشتی کھیتا ہوا روانہ ہوا تو رات کے پونے تین بجے تھے۔ اس نے ایک خاص جگہ پہنچ کر جہاں نہر کے کنارے ایک قدِ آدم چہار دیواری بنی ہوئی تھی کشتی کا لنگر پانی میں ڈال دیا اور خود دیوار پر چڑھ گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند بھی نکلا ہوا نہیں تھا۔ اس لئے ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے دیوار کی دوسری جانب دیکھنا چاہا مگر اس اندھیرے میں سے دیکھنے میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ اس وقت فورٹ میکنیر کی ایک بیرک کے عقبی حصے میں موجود تھا۔ تمام فوجی چوکیاں تقریباً ایک ہی انداز میں تعمیل جاتی تھیں اور فورٹ میکنیر کی فوجی چوکی نہر کے مشرقی کنارے پر واقع واحد چوکی تھی۔

پال نے سر سے پیر تک بالکل سیاہ کپڑے اور جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ آہستہ سے دیوار کے دوسری جانب کود گیا۔ بیرک کے سامنے والی ڈیوڑھی پر پہنچنے کے لئے اسے ان دو کمروں سے گزرنا تھا۔ جہاں بھاری قسم کا اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ مگر وہ وہاں نہیں رکا کیونکہ اسے مارٹر گن۔ بازوکا۔ یا اسی قسم کے بھاری اسلحہ کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈیوڑھی پر پہنچ کر وہ رُکا اور دونوں طرف دیکھا۔ وہ اس سنتری کو دیکھ رہا تھا جو وہاں پہرا دیتا تھا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گشت لگاتے ہوئے اپنے پہرے کے انتہائی آخری سرے پر گیا ہوا تھا۔ پال جلدی سے بھاگ کر بیرک کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کے بائیں جانب بیرک کے انچارج کا دفتر تھا۔ انچارج جھانک کر دیکھا۔ انچارج دفتر کے اندر ایک گدے پر سو رہا تھا۔ پال خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے کاؤنٹر کی ایک دراز کھول کر اس میں رکھے ہوئے اعشاریہ ۴۵ بور کے دو کولٹ ریوالور نکالے اور دونوں کو اپنی پتلون کی ایک ایک جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ خاموشی سے بڑے والے کمرے میں رینگ گیا۔ یہاں فوجی انداز کے بستروں کی کئی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور تقریباً ہر بستر پر کوئی نہ کوئی سو رہا تھا۔ روشنی یا تو اس کے پیچھے واقع دفتر کے روشن بلب سے آ رہی تھی یا پھر اس بلب سے جو کمرے کے آخری کنارے اس زینے پر لگا ہوا تھا جو لیٹرین کی طرف جاتی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک رائفل ریک رکھا ہوا تھا جس میں ایم ایم کی خودکار رائفلیں لگی ہوئی تھیں۔ ان رائفلوں کے ٹریگر کے حلقے سے ایک آہنی چین گزار کر سب کو ایک ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ پال نے اپنی پیٹی میں اُڑسا ہوا سوراخ دار کاٹنے والا کٹر نکالا۔ اور وہ آہنی زنجیر بڑی آسانی سے کاٹ دی۔ پھر ایک خودکار رائفل نکال کر وہ انچارج کے دفتر میں واپس آ گیا۔ انچارج ابھی تک اسی طرح سو رہا تھا۔ اب پال کے پاس تین اسلحہ تھے۔ دو ریوالور اور ایک رائفل۔ لیکن ابھی تک اس کے پاس ان میں سے کسی کے لئے بھی گولیاں موجود نہیں تھیں۔ اور اس کا اگلا اقدام یہ گولیاں حاصل کرنے کے لئے ہی تھا۔

اس نے اس چوکی کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے اعتبار سے گولہ بارود کا ذخیرہ ایک زمین دوز الماری میں موجود تھا جو بیرک اور بھاری اسلحہ کے کمروں کے درمیان واقع تھی۔ پال اسی طرح دبے پاؤں چلتے ہوئے اس الماری کے پاس آیا۔ اس کا دروازہ گول دائرے کی صورت میں بنا ہوا تھا جس کا قطر تقریباً تین فٹ تھا۔ اس دروازے میں پیتل کا ایک بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ یہاں بھی اس نے اپنے کٹر سے کام لیا اور تالے کے موٹے حلقے کو کاٹتے ہوئے اسے زیادہ طاقت بھی صرف نہیں کرنا پڑی۔ اس کا کٹر اس قسم کے کاموں کے لئے بہترین تھا۔ قفل کاٹ کر اس نے دروازہ کھولا اور ایک پنسل ٹارچ کی مدد سے اندر جھانکا۔ اسے جس چیز کی ضرورت تھی وہ اس کی دسترس کے اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے خودکار رائفل کی گولیوں کا ایک بڑا بکس اور ریوالور کی گولیوں کا ایک چھوٹا ڈبہ اُٹھا لیا۔ اسی کے ساتھ اسے کئی دستی بم بھی رکھے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے کچھ بم بھی نکال لئے۔

اسی وقت اسے دور سے سنتری کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ وہ اپنے پہرے کا چکر لگاتے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ سنتری اتنے قریب آ گیا تھا کہ پال چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکائے سنتری کی طرف چلا۔ اس کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل نے سنتری کو حیرت زدہ اور ایک لمحے کے لئے غافل کر دیا۔ وہ حیرت سے پال کو دیکھتے ہوئے رُک گیا۔ پال نے قریب پہنچتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ جھپٹ کر اس کی رائفل چھینی اور اس سے پہلے کہ سنتری اپنی زبان سے کچھ کہہ سکے یا کسی کو پکار سکے اس نے نال کی طرف سے پکڑ کر وہی رائفل گھمائی اور اتنے زور سے سنتری کے سر پر ماری کہ وہ کوئی آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو کر زمین پر لڑھک گیا۔

پال نے جلدی سے اپنی چُرائی ہوئی رائفل اور گولیوں کے دونوں ڈبے اُٹھائے اور چہار دیواری کی دیوار کی طرف چل دیا۔ اس نے باری باری رائفل اور ڈبے دیوار کے دوسری طرف پھینک دیئے پھر خود بھی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ یہاں اس نے تمام چیزیں اپنی کشتی میں رکھیں اور لنگر اُٹھا کر اسی طرف روانہ ہو گیا جدھر سے آیا تھا۔

***

اگلی صبح ساڑھے سات بجے ایک ایف بی آئی ایجنٹ نے پال کے دروازے پر دستک دی۔ پال سلور اسپرنگ نامی ایک بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں قیام پذیر تھا۔ پال نے گھر واپس آتے ہی اپنی نوٹ کا مال گیرج میں چھپا دیا تھا۔ اور پھر گرم پانی سے غسل کر کے لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔ وہ اس وقت بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ مگر ہر طرح بیدار اور چوکنا تھا۔ اس نے بستر سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ مگر ایجنٹ کی اندر آمد کو روکنے کے خیال سے وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔۔؟" اس نے پوچھا۔

ایف بی آئی ایجنٹ نے ایک ہینڈ بیگ آگے بڑھایا۔ پال نے اسے پہچان لیا وہ روتھ کا تھا۔

"یہ بیگ کریک پارک میں اس جگہ ملا ہے جہاں اغوا کرنے والے کار چھوڑ گئے تھے۔" ایجنٹ نے بتایا۔

پال نے بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا مسکرایا اور بولا۔

"اچھا ہوا کہ بیگ مل گیا۔ میں اس کی طرف سے بڑا فکرمند تھا۔"

"کیا مطلب۔۔؟" ایجنٹ چونکا۔

"اس بیگ میں روتھ اپنے شناختی کاغذات اور لائسنس وغیرہ رکھتی ہے۔" پال نے بتایا۔ "اب سوائے اس صورت کے کہ کوئی خود اغوا کرنے والوں کو بتائے کہ انھوں نے غلط عورت کو پکڑ لیا ہے۔ وہ روتھ کی اصلیت سے واقف نہیں ہو سکتے۔"

ایجنٹ کچھ اور سوال بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر پال نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

***

ٹھیک ساڑھے دس بجے جیسے ہی صبح کا رش ختم ہوا۔ دوپہر کے وقت آنے والے لوگوں سے کافی پہلے ایک تنہا ڈاکو نے واشنگٹن میں رگس نیشنل بینک کی ایک برانچ کو لوٹ لیا۔ کوئی گولی نہیں چلائی گئی۔ لیکن بظاہر ڈاکو اس بات کیلئے بالکل آمادہ نظر آتا تھا کہ اگر اسے گولیوں سے اپنا راستہ بنانا پڑا تو وہ اس سے قطعی دریغ نہیں کرے گا اس کے ہاتھوں میں اعشاریہ ۴۵ بور کے دو ریوالور موجود تھے۔

پھر دو بجے سہ پہر تقریباً ایسے ہی کاروباری تعطل کے وقت میں اسی بینک کی ایک دوسری برانچ پر کامیاب ڈاکہ ڈالا گیا۔ دونوں برانچوں کو لوٹنے والا ایک ہی شخص تھا اور وہ دونوں مقامات سے اسی ہزار ڈالر سے زیادہ رقم لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈاکے کی فلم ٹی وی پر دکھائی گئی لیکن اس سے ڈاکو کی شناخت میں کوئی مدد نہیں مل سکی۔ ڈاکو نے سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اور اس کا چہرہ ایسی نقاب میں چھپا ہوا تھا جس میں صرف آنکھوں کے لئے دو سوراخ موجود تھے۔ تمام گواہ صرف ایک بات پر متفق تھے کہ ڈاکو نے کلائی میں شادی کا ایک کافی چوڑا دست بند پہن رکھا تھا۔ اور اس بات کی تصدیق ان فلموں سے بھی ہوتی تھی جو چھپے ہوئے کیمروں نے اتاری تھیں۔ اگرچہ

ڈاکو دستانے نہیں پہنتا تھا مگر اس نے انگلیوں کے کوئی نشانات نہیں چھوڑے، کیونکہ اس نے جس چیز کو بھی ہاتھ لگایا اسے اپنے ساتھ ہی لیتا گیا۔

اگلے دن دو اور بینکوں کو لوٹا گیا اور لوٹ کی کل رقم کی تعداد دو لاکھ ستر ہزار ڈالر تک پہنچ گئی لیکن ٹی وی کے تبصرہ نگار جس بات پر چیخ رہے تھے وہ یہ رقم نہیں تھی، بلکہ اس مرتبہ گولیاں بھی چلائی گئی تھیں جبکہ ڈاکو دوسرے بینک کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ ایک عورت سے ٹکرا گیا جو کہ اندر آرہی تھی بینک گارڈ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ریوالور کی طرف جست لگائی جسے ڈاکو نے اسے پھینکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جیسے ہی وہ ریوالور اٹھانے میں کامیاب ہوا، ڈاکو نے ایک فائر کیا اور گولی گارڈ کے کندھے میں اتر گئی۔

پال نے جو کہ اپنے ٹی وی سیٹ پر سہ پہر کی ڈکیتی کی فلم دیکھ رہا تھا اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ اس کے صوفے کے سامنے رکھی ہوئی کافی ٹیبل پر کرنسی نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے وہ تمام نوٹ ایک بڑے سے سوٹ کیس میں منتقل کر دیئے اور پھر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ ابھی اس کے سوٹ کیس کو پوری طرح بھرنے کے لئے مزید نوٹوں کی ضرورت تھی۔ اس نے اسے بند کیا اور صوفے کے پیچھے صوفے کی پشت اور دیوار کے درمیان چھپا دیا۔

اس کے بعد اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ جب سے اس کی بیوی غائب ہوئی تھی وہ یہ نمبر دن بھر میں کم سے کم بارہ تیرہ مرتبہ ڈائل کرتا تھا۔ جیسے ہی رابطہ قائم ہوا اس نے پوچھا۔

"کوئی خبر؟"

"نہیں۔" ڈولٹن لینی نے جواب دیا۔ "ان لوگوں نے ابھی تک فون نہیں کیا ہے۔"

پال نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اسے آئندہ کے بارے میں سوچنا تھا۔ کل سے کولمبیا ضلعے کے ہر بینک میں خفیہ پولیس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اسے اس بات کا یقین تھا۔ لیکن جو کام اس نے شروع کیا تھا، اپنے مقصد کی تکمیل سے پہلے اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اپنا طرزِ عمل بدلنا پڑے گا۔

اگلی صبح بینک کے ڈاکو نے کالج پارک کے ایک بینک پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن پولیس کی بروقت مداخلت نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ پولیس بھی اسے پکڑنے میں ناکام رہی اور وہ میری لینڈ یونیورسٹی کیمپس کے آس پاس کہیں غائب ہو گیا لیکن سہ پہر وہ کولمبیا ضلعے کو نظر انداز کرتے ہوئے ورجینیا کے قصبے آرلنگٹن میں نمودار ہوا۔ اور اس مرتبہ وہ کامیاب رہا۔ مہینے کی پندرہ تاریخ تھی اور بینک پنٹاگن کے شہری ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے والا تھا چنانچہ صرف اس ایک بینک سے اسے تین لاکھ ڈالر کی رقم حاصل ہو گئی۔ اور یوں اس کے جملہ ڈاکوں کی مجموعی رقم پانچ لاکھ چھپن ہزار ڈالر تک پہنچ گئی۔

❋❋❋

وکٹر اپنی کیبن کے سامنے فرش پر ٹہل رہا تھا۔ اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ڈولٹن کو رقم کی فراہمی کے لئے ایک ہفتے کی طویل مہلت کیوں دیدی۔ ڈولٹن جیسے امیر کبیر کو ایک ہفتے کی مہلت دینا قطعی غیر ضروری تھا اس کے لئے تو ایک دن ہی کافی تھا جبکہ اب ہفتے کا ہر دن ایک ہفتے کی طرح طویل معلوم ہو رہا تھا۔ اخبارات میں اس سلسلے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ لیکن اس سے وکٹر کو اطمینان ہونے کے بجائے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ پولیس ڈرائیور کے قتل کو خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود اگر اخبارات میں کوئی خبر نہیں آرہی تھی تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اگر اس موقعے پر اس کے پاس کوئی ریڈیو یا ٹی وی وغیرہ ہوتا تو وہ تازہ ترین حالات سے زیادہ باخبر رہ سکتا تھا۔

❋❋❋

جس وقت پال ڈولٹن کے شاندار بنگلے پر پہنچا تو وہاں اتنی سرگرمی نظر نہیں آرہی تھی جس کا تجربہ اسے اس روز ہوا تھا جب روتھ اغوا کی گئی تھی۔ ایف بی آئی کی صرف ایک کار بنگلے کے سامنے کھڑی تھی۔ اسکی دستک کے جواب میں بٹلر بھی کچھ دیر ہی میں نمودار ہوا۔ وہ اسے ڈولٹن کے دفتر میں لے گیا جہاں ڈولٹن اور ایف بی آئی کے دو ایسے ایجنٹ جن سے پال پہلے کبھی نہیں ملا تھا موجود تھے۔ میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر بھی رکھا ہوا تھا۔

"کیا تم کال سننا چاہتے ہو؟" ایک ایجنٹ نے پال سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں اسی لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہوں۔" پال نے جواب دیا۔

ایجنٹ نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ سب سے پہلے ابھرنے والی آواز ڈولٹن کی تھی۔

"ہیلو۔"

"کیا تم نے رقم فراہم کرلی؟" کسی نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔"

"پوری رقم اور سب استعمال شدہ نوٹوں میں؟"

"ہاں۔"

"او کے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ رقم لے کر میرے پاس آؤ۔"

"نہیں میں نہیں آسکتا۔"

"چالاک بننے کی کوشش مت کرو مسٹر۔ ورنہ تم اپنی بیٹی کو دوبارہ نہیں دیکھ سکو گے۔"

"میں رقم دینے کے لئے تیار ہوں لیکن کیا ضروری ہے کہ رقم لے کر بھی میں ہی آؤں؟"

"ہاں میں چاہتا ہوں کہ رقم تم ہی لاؤ۔"

"اس سوال پر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی میری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو بھی تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ میں جہاں تم کہو ایک آدمی کو رقم دیکر بھیجنے کیلئے تیار ہوں۔"

"ڈرتے ہو۔ اچھی بات ہے یونہی سہی۔ تمہیں اپنی کار واپس مل گئی یا نہیں؟"

"رولز رائس کار کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ وہی شاندار سفید کار۔"

"وہ مجھے مل گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ غور سے سنو۔ آج آدھی رات کو۔ اس کار میں اپنے آدمی کو رقم دے کر روانہ کر دو۔ وہ چین برج کراس کر کے ورجینیا میں داخل ہو اور گلیبی روڈ پر آجائے۔ کولمبیا پائک پر دائیں ہاتھ کی جانب گھوم کر بیلی کے چوراہے تک پہنچے۔ پھر وہاں سے بائیں جانب مڑ کر الیگزینڈریا تک آئے۔ یہاں پہنچ کر اسے اس راستہ پر اس وقت تک کبھی آگے اور کبھی پیچھے چلتے رہنا ہے جب تک اسے ایک سبز روشنی نظر آئے۔ جب یہ سبز روشنی اسے دکھائی دے تو وہ کار روک لے اور جو کوئی شخص اس کے پاس آئے اسے رقم حوالے کر دے۔ تم اچھی طرح سمجھ گئے؟"

"ہاں میں سمجھ گیا۔"

اس کے بعد ٹیپ ریکارڈر سے فون کا ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ ایجنٹ نے ریکارڈر بند کر دیا۔

"کال دوسرے فون ایکسچینج سے آئی ہے۔" اس نے بتایا "اور چونکہ ڈائریکٹ لائن پر تھی اسلئے اس کا پتہ چلانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"پھر آج کی رات تمہاری وہ سفید کار میرے استعمال میں رہے گی۔" پال نے ڈولٹن سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈولٹن نے تائید میں سر ہلایا۔

❋❋❋

فارم ہاؤس کے کیبن میں ایک شکستہ میز پر بیٹھے ہوئے وکٹر نے اپنی ٹارچ پر ایک سبز رنگ کا باریک کاغذ منڈھ لیا اور اسے ایک ربر کے چھلے سے باندھ دیا۔ پھر اس نے ٹارچ کو جلا بجھا کر دیکھا پھر مطمئن ہو کر وہ اٹھا اور ٹارچ کو اپنی پتلون کی ہپ پاکٹ میں رکھ لیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے زمین کھودنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وکٹر نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بروس قمیض اتارے کدال اور بیلچے کی مدد سے زمین کھودنے اور اس کی مٹی اوپر پھینکنے میں مصروف تھا۔ اب تک اس نے تقریباً چار فٹ گہرا مستطیل گڑھا کھود لیا تھا۔

"ایک دو فٹ گہرائی زیادہ کرلو اور اسے چوکور بنانے کی کوشش کرو۔" وکٹر نے کہا۔

"چوکور....؟" بروس نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔" وکٹر مسکرایا۔ "ہم یہ نہیں چاہتے کہ بعد میں کوئی یہاں آئے اور اسے دیکھ کر یہ سوچے کہ یہ کسی کی قبر بھی ہو سکتی ہے۔"

❋❋❋

پال نے برج ٹھیک آدھی رات کو پار کیا۔ وہ کافی کم رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا، تاکہ اسے آس پاس دیکھنے کا موقع ملتا رہے اور وہ سبز روشنی جس کا اغوا کرنے والے نے ذکر کیا تھا، اسے دکھائی دینے سے نہ رہ جائے۔

وکٹر نے ایک مناسب جگہ چھپے ہوئے سفید رولز رائس کار کو آتے دیکھا اور پھر اس کے تعاقب میں کسی دوسری کار کے آنے کی توقع میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا سڑک کو دیکھتا رہا مگر سفید کار کے علاوہ وہ سڑک پر کوئی اور کار نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے توقع بھی یہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ڈولٹن اپنی بیٹی کو کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہے گا۔ اور وہ بھی صرف پانچ لاکھ ڈالر کے لئے۔ یہ تو اس کے لئے بہت ہی حقیر سی رقم تھی۔ وکٹر اس وقت تک اپنی جگہ کھڑا رہا جب تک اس نے کار کو واپس آتے نہیں دیکھا۔ پھر وہ سڑک پر آگیا۔ اور ایک

ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ پکڑ کر ٹارچ کا رُخ کار کی طرف کرتے ہوئے بٹن دبا دیا۔ سفید رولز رائس کار اس کے قریب آ کر رُک گئی۔ پال سیاہ لباس پہنے ہوئے کار سے نیچے اُترا۔ پچھلی سیٹ سے اپنا سوٹ کیس اٹھایا۔ اور اسے لے کر وکٹر کی طرف بڑھا۔ جب فاصلہ تقریباً پندرہ فٹ رہ گیا تو وکٹر بولا۔

"بس زیادہ آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا "سوٹ کیس کو وہیں رکھ دو اور اس کا ڈھکنا اُٹھا کر دکھاؤ۔"

پال نے سوٹ کیس سڑک پر رکھ دیا اور اس کے کھٹکے دبا کر ڈھکنا کھول دیا۔ اس درمیان اس کی نظریں مستقل طور پر وکٹر کے ریوالور پر جمی ہوئی تھیں۔ وکٹر کے لئے سوٹ کیس میں ایک نظر ڈالنا ہی کافی تھا کرنسی نوٹوں کی کثیر تعداد دیکھ کر اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا اور گلا خشک محسوس ہونے لگا۔ وہ جلد سے جلد اس معاملے کو ختم کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔

"او کے۔" اس نے کہا "اب اسے بند کر دو اور جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم لڑکی کو چند گھنٹوں کے اندر رہا کر دیں گے۔"

اس نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک پال سوٹ کیس بند کر کے کار کی طرف واپس جانے لگا۔ پھر اس نے اپنا ریوالور اُٹھایا اور پال کے کندھوں کے درمیان کا نشانہ لیتے ہوئے اپنے انگوٹھے سے ریوالور کا گھوڑا دبا دیا۔ پال غالباً اسی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے خود کو سڑک پر گراتے ہوئے وکٹر کی طرف گھوما اور بجلی جیسی سرعت سے اس کے دونوں ریوالور اس کے ہاتھوں میں نمودار ہو گئے۔ وکٹر کو اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس کے ریوالور کی نال ابھی اوپر ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھی کہ اس نے اعشاریہ ۴۵ بور کے دو ریوالوروں کا رُخ اپنی جانب متوجہ پایا۔

"ریوالور پھینک دو۔" پال نے سخت لہجے میں کہا۔ وکٹر کو مجبوراً حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

"تم غلطی کر رہے ہو۔" وہ چلایا۔ "اس طرح تم ڈولٹن کی بیٹی کو واپس نہیں پاسکو گے۔"

"وہ ڈولٹن کی بیٹی نہیں میری بیوی ہے۔" پال نے جواب دیا۔ "اگر تم مجھے محض اس لئے قتل کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہو کہ میں بعد میں تمہیں شناخت نہ کرلوں۔ تب مجھے یقین ہے کہ تمہارا ارادہ اسے بھی زندہ چھوڑنے کا نہیں ہو سکتا خواہ تمہیں کتنی ہی رقم کیوں نہ ادا کردی جائے۔"

اس نے اپنا نشانہ کچھ نیچے کی جانب کیا اور دونوں ریوالوروں کے ٹرانگر دبا دیئے۔ وکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے گھٹنے کسی بم کے دھماکے میں اُڑ گئے ہوں۔ دوسرے لمحے وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔

"مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔" وہ چلایا۔ "میں مر رہا ہوں۔"

"تم بیشک مر رہے ہو۔" پال نے جواب دیا۔ "مگر مرنے سے پہلے تمہیں میرے چند سوالات کا جواب دینا ہے۔"

***

"ہم نے چھ کاریں اس راستے پر لگا رکھی ہیں۔ اور ایک ہیلی کاپٹر روشنیاں بجھائے اوپر پرواز کر رہا ہے۔" ایف بی آئی کے ایجنٹ نے ڈولٹن کو بتایا۔ "آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہم پال کو تنہا اغوا کرنے والوں کے پاس جانے دیں گے۔"

ڈولٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایسے حالات میں خود کو بے چین و مضطرب محسوس کرتا تھا۔ جہاں وہ یقین کے ساتھ یہ نہ بتا سکے کہ اس معاملے کا انجام کیا ہوگا۔؟

"ہمارا اصول ہے کہ ہم اس وقت تک مداخلت نہیں کرتے۔" ایجنٹ کہہ رہا تھا۔ "جب تک ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اغوا کئے جانے والے فرد کو کسی نقصان کے بغیر واپس کئے جانے کا امکان ہے۔ لیکن اس کیس میں یہ اصول عائد نہیں ہوتا۔ پال حقیقت پسندی سے کام نہیں لے رہا تھا جو کہ اس کے بجائے ہمیں حقیقت پسند ہونا پڑا۔ جیسے ہی اغوا کرنے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ پال اپنے ساتھ مطالبے کی رقم لے کر نہیں آیا ہے تو پھر اس کے بعد جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے۔ اور اس کے لئے ہمیں پہلے سے ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا لازمی تھا۔"

"مگر میرا تو خیال ہے کہ وہ مطالبے کی رقم ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔" ڈولٹن نے کہا۔

"لیکن پانچ لاکھ ڈالر کی رقم کم نہیں ہوتی۔" ایجنٹ نے کہا۔ "وہ اتنی رقم کہاں سے ــــ"

وہ ایک دم کہتے کہتے رُک گیا، اور چونکا ہوا نظر آنے لگا۔ جیسے اچانک اسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ڈولٹن کی میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور تیزی سے کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

***

روتھ کا چہرہ اور جسم گرد آلود ہو رہا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اسے نہانا تو کجا منہ دھونے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ اس کا بایاں شانہ ابھی تک تکلیف دے رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہاں کوئی زخم ضرور آیا ہے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے آپ کو جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کی تھی۔ کم سے کم بروس کو اس کی شکل ناپسندیدہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ جب بھی وکٹر کار لے کر کہیں جاتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت گیا ہوا تھا بروس کٹہرے کی آہنی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور اسے دیکھتا رہتا تھا۔

"تمہارا دوست کہاں گیا ہے۔؟" روتھ نے اس سے پوچھا۔

"مطالبے کی رقم لینے کیلئے۔" بروس نے کسی تاثر کے بغیر جواب دیا۔

روتھ کو اس گڑھے کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ جو بروس نے کھود کر تیار کیا تھا لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ ڈولٹن یعنی اسے آزاد

کرانے کے لئے پانچ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم گرہ سے خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اس کے چہرے پر خوف کا تاثر نمودار ہوا لیکن اس نے جلد ہی اسے چھپا لیا۔ اسے دوسرے آدمی کے آنے سے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ضروری تھی۔

"جب تمہارا دوست آجائے گا تو تم مجھے آزاد کردو گے۔؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بروس نے چند لمحوں تک کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر پھر بولا۔

"ہاں۔ ہم تمہیں جانے کی اجازت دیدیں گے۔"

"تم مجھے ابھی چلا جانے دو۔" روتھ نے کہا۔ "میں تمہارے دوست کو پسند نہیں کرتی۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ میں کسی کو اس جگہ کے یا تم لوگوں کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔ اور تم اپنے دوست سے کہہ سکتے ہو کہ میں تمہیں دھوکا دے کر بھاگ نکلی۔ اسے حقیقت کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

"اسے ضرور معلوم ہو جائے گا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔"

"نہیں اسے بالکل معلوم نہیں ہوگا۔ پلیز مجھے یہاں سے چلا جانے دو۔ میں ــ میں جانے سے پہلے تمہارے اس احسان کا بدلہ اُتارتی جاؤں گی ـــ جس طرح تم چاہو ـــ"

"سچ کہہ رہی ہو۔" بروس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ دلچسپی نمودار ہوئی۔ "ہاں بالکل سچ۔" روتھ نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔

بروس نے اپنی جیب سے چابی نکال کر کٹہرے کا قفل کھول دیا۔ اور اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھے پیار کرنے کی اجازت دو گی۔"

"ہاں۔" روتھ نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی، بروس کے قریب آئی۔ اور بروس کے ہاتھ اس کے گرد کس گئے۔

***

پال نے نیچے اُترتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ اوپر دیکھا، لیکن تاریکی کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہیں آسکا۔ اگرچہ وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا مگر اسے یقین تھا کہ ہیلی کاپٹر اسے ہی تلاش کر رہا ہے۔ اسے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ایف بی آئی والے اسے اس معاملے سے اپنے طور پر نمٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر اغوا کرنے والوں نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب نہ کیا ہوتا جسے اوپر سے نہیں دیکھا جاسکتا تو اب تک یہ مقام ایجنٹوں سے بھر گیا ہوتا۔

اس نے زخمی وکٹر کو سفید کار کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ اور رولز رائس کار سے ۱۶ ایم کی رائفل اور زائد میگزین نکال کر وکٹر کی کار میں رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ سوٹ کیس کو وہیں چھوڑتے ہوئے ایک جانب روانہ ہو گیا۔ وکٹر نے اسے فارم ہاؤس کے بارے میں سب کچھ بتلا دیا تھا۔ فارم ہاؤس اس جگہ سے دس میل سے بھی کم فاصلے پر واقع تھا۔ اور پال وہاں چند منٹ کے اندر پہنچ سکتا تھا۔ راستے میں اسے دو کاریں نظر آئیں جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ ایف بی آئی کے ایجنٹوں کی

تھیں۔ لیکن جب تک وہ رولز رائس کار نہیں پالیتے اس وقت تک ان کا کسی دوسری کار پر شبہ کرنا مشکل تھا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ وہ فارم ہاؤس کے قریب آپہنچا ہے تو اس نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے ڈاک کے بکسوں کو دیکھا۔ ایک سڑک پر اسے ڈاک بکس پر وکٹر کا نام لکھا ہوا نظر آگیا اور اس نے کار کو اس سڑک پر موڑ لیا۔ ابھی وہ فارم ہاؤس سے نصف فاصلے پر تھا کہ اس نے بروس کو سڑک کے بیچ میں کھڑا زور زور سے ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ پال نے کار روک لی اور اُتر کر بروس کے پاس پہنچا۔ کار کی ہیڈ لائٹس نے بروس کی آنکھیں چوندھیا دی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی طرف آنے والا آدمی وکٹر نہیں ہے تو اس نے الجھے ہوئے انداز میں ادھر اُدھر دیکھا۔

"وہ کہاں ہے۔؟" پال نے پوچھا۔ بروس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یا تم نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہے۔؟"

بروس احمقانہ انداز میں مسکرایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

پال نے اپنی رائفل سیدھی کی اور اس وقت تک فائر کرتا چلا گیا جب تک رائفل کا میگزین خالی نہیں ہو گیا۔ اس کا غصہ اس پر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ رائفل میں دوسرا میگزین ڈال کر مزید فائرنگ کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایف بی آئی کے ایجنٹ پہنچ گئے اور انھوں نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔

اس مقام سے دو میل کے فاصلے پر روتھ لڑکھڑاتی ہوئی اس حالت میں کہ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے جسم پر نوچنے کھسوٹنے کے واضح نشانات اور زخم تھے جن سے خون بہہ رہا تھا ایک کھیت کو طے کر کے سڑک پر آئی۔ ایک گزرتے ہوئے ٹرک ڈرائیور نے اسے فوری طور پر آرلنگٹن کے پولیس سٹیشن پہنچایا۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ جس وقت وکٹر رقم لینے گیا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھی بروس کے ہاتھوں سے بمشکل بچ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

***

پال پر کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ اسے اس بات کی اجازت دیدی گئی کہ وہ صرف ایک بینک ڈکیتی کا اعتراف کرے جس میں اس نے بینک کے ایک گارڈ کو زخمی کر دیا تھا۔ جج نے تمام حالات و واقعات پر غور کرنے کے بعد اسے صرف پانچ سال قید کی سزا کا حکم سنایا۔

اور اس وقت جبکہ پال کو اپنی سزا کاٹتے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ روتھ کی ملاقات ایک اور آدمی سے ہو گئی، اور اس نے پال سے طلاق حاصل کر کے اس دوسرے آدمی سے شادی کر لی۔

اِس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ لاکھوں ڈالر اپنے بریف کیس میں رکھے کار میں بیٹھ رہا تھا
کار میں بیٹھتے ہی جو واقعہ ہوا اِس نے اِس کہانی میں چار چاند لگا دیے ہیں

ساڑھے گیارہ بجے مسٹر جے ٹی ہیلورٹن پینڈر بنک لمیٹڈ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ درمیانے قد کا ایک باوقار آدمی تھا۔ اس کی بھنویں سیاہ اور گھنی تھیں۔ سر کے بال کنپٹیوں سے سفید ہوگئے تھے۔ وہ ہلکے رنگ کے نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ سر پر چھوٹے چھجے والا فیلٹ ہیٹ تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا قیمتی بریف کیس تھا۔

دروازے پر موجود چوکیدار کی طرف دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ چوکیدار نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جس طرح وہ بنک میں داخل ہونے والے ہر اجنبی کی طرف دیکھتا تھا۔

ہیلورٹن باوقار انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پہلے کاؤنٹر کے قریب جاکر رک گیا۔ بریف کیس ایک طرف رکھ دیا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر کیشئر کے سامنے کر دیا۔

کیشئر دُبلے جسم اور لمبے قد کا آدمی تھا۔ سامنے رکھے ہوئے کاغذات سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے "جی فرمایئے" کہتے ہوئے سرسری نظر دائیں رکھے ہوئے کارڈ کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کی تمام خود اعتمادی اور بے نیازی غائب ہوگئی۔ اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"مِ مِ ... جی! میں ابھی آپ کو مسٹر برٹن کے پاس لئے چلتا ہوں۔ وہ ... وہ یہاں کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ آپ اس طرف سے اندر تشریف لے آئیں۔" پھر اس نے جلدی سے کھڑکی کے سامنے "بنک بند ہے" کی تختی لگا دی اور نہایت بدحواسی کے ساتھ چلتا ہوا اپنے کیبن سے باہر نکل آیا۔

"مِ مِ ... جناب عالی میرے ساتھ تشریف لے آئیں ... جی ہاں ... جی ہاں ... آجایئے۔"

مسٹر ہیلورٹن نے اپنا بریف کیس اٹھالیا اور نہایت تمکنت کے ساتھ کیشئر کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کیشئر کے چہرے پر زبردست بوکھلاہٹ طاری تھی۔ اور اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُسے تختۂ دار کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ بنک کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے زینے کو طے کرکے وہ بائیں طرف مڑ گیا۔ اور چند قدم کے فاصلے پر شیشے کے بنے ہوئے ایک خوبصورت دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پہلے اُس نے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ لیکن جواب کا انتظار کئے بغیر ہی دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ مسٹر ہیلورٹن نے سر کو تھوڑا سا خم کیا اور رچے تلے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

"مسٹر برٹن!" کیشئر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "یہ جناب ... مسٹر ... ا ... ر ... آپ بنک ایگزامینر ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

مسٹر برٹن ادھیڑ عمر کا فربہ اندام شخص تھا۔ بنک ایگزامینر کا نام سنتے ہی اُس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا اور جلدی سے کھڑے ہو کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"تشریف رکھیں جناب۔"

ہیلورٹن نے ہاتھ ملانے کے بعد بریف کیس میز پر رکھ دیا۔ اور کوٹ کی اندرونی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر برٹن کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ کو پرنسپل آفس کی جانب سے میرے بارے میں اطلاع مل چکی ہوگی۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تاہم اگر آپ پسند کریں تو فون کرکے میرے بارے میں اطمینان کر سکتے ہیں۔ فون نمبر کارڈ پر موجود ہے۔"

"اوہ، نہیں نہیں۔" برٹن نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کا انتظار ہی ... میرا مطلب ہے کہ سال کے اس حصے میں عموماً چیکنگ وغیرہ ..." برٹن نے اپنی بدحواسی چھپانے کے لئے دانت نکال دیئے اور کہا "آپ کیا پینا پسند کریں گے مسٹر ہیلورٹن؟ ویسے ہمارے حسابات کی جانچ ہوئے کافی عرصہ ہوچکا ہے۔"

ہیلورٹن نے اپنا شناختی کارڈ نفاست کے ساتھ بند کرکے جیب میں رکھ لیا اور برٹن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ برٹن نے گفتگو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آج موسم بہت اچھا ہے۔"

"ہاں اچھا ہے۔" ہیلورٹن نے کہا۔ انداز سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے

موسم کی رنگینیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ برٹن نے پیپر ویٹ گھماتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ حسابات کی جانچ کیش بک وغیرہ سے شروع کریں گے؟"

ہیلورٹن نے سر کو ہولے سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "اکاؤنٹس کی تمام کتابیں جانچ مکمل ہونے تک میرے قبضے میں رہیں گی لیکن اس سے قبل میں آج کی کلوزنگ چیک کرنا چاہتا ہوں کیش ان ہینڈ اور دیگر اخراجات وغیرہ حسب قاعدہ ہفتے کے روز آپ کیش وغیرہ ضرور ٹیلی کرتے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج سہ پہر کو دو تین گھنٹے لگا کر پہلے کیش چیک کرلیا جائے۔ آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی لیکن امید ہے کہ آپ بھی موجود رہیں گے۔"

"بالکل نہیں جناب۔" برٹن نے جواب دیا۔ "یہ تو میرا فرض ہے۔ ویسے ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اکاؤنٹنٹ کو بھی روک لیا جائے۔"

"بالکل بالکل۔" ہیلورٹن نے کہا۔ "اکاؤنٹنٹ اور ہیڈ کیشئر کو تو بہرحال رکنا ہی پڑے گا۔ اب آپ اپنے تمام عملے کو ہدایت کردیں کہ آج چھٹی سے قبل تمام اندراجات اپ ٹو ڈیٹ کردیں تاکہ جانچ شروع کرنے کے لئے مجھے باقاعدہ ایک بنیاد مل جائے۔"

"جی ہاں ... جی ہاں۔" برٹن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہفتے کے روز ہم تمام اندراجات مکمل کرنے کے بعد ہی چھٹی کرتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اب تک تمام اندراجات مکمل ہوچکے ہوں گے۔ تاہم میں اسٹاف کو مزید ہدایت کردیتا ہوں کہ آج وہ زیادہ احتیاط کے ساتھ کلوزنگ کریں تاکہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے اور ... اور میں یہ بھی ہدایت کرتا ہوں کہ تمام لیجر فوراً آپ کو لاکر دے دیئے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہیلورٹن نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے چھت کو گھورنے لگا۔ اس نے سوچا محض ایک بنک ایگزامینر کی موجودگی سے یہ لوگ کس قدر بوکھلا گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خامی ضرور موجود ہے۔ اس نے دستی گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔

دس منٹ بعد برٹن دوبارہ آفس میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے کیشئر لیجر اٹھائے چلا آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر بدستور بدحواسی نظر آرہی تھی۔ جب اس نے ہیلورٹن کے سامنے میز پر لیجر رکھے تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ برٹن نے کیشئر کو مخاطب کرکے کہا۔

"مسٹر ہینڈرسن سے کہو کہ فائنل اکاؤنٹ مکمل کرنے کے بعد فوراً میرے دفتر میں آکر رپورٹ کرے۔"

"جی بہت بہتر۔" کیشئر نے سعادت مندی سے جواب دیا اور رخصت ہوگیا۔

ہیلورٹن نے ایک لیجر اٹھایا اور اس کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے لیجر کو لاپروائی کے ساتھ واپس میز پر ڈال دیا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ کو تمام اندراجات اپ ٹو ڈیٹ ملیں گے۔"

"امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔" ہیلورٹن نے سنجیدگی سے کہا۔

چند لمحوں کے تکلیف دہ وقفے کے بعد برٹن نے اپنی خصوصی معلومات کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر عملے کی لاپروائی اور نااہلی کا رونا رو دیا۔ پھر اس شاندار ڈنر پارٹی کے بارے میں بتانا شروع کردیا۔ جو اس نے اپنی بیوی کی پچھلی سالگرہ پر دی تھی۔ ابھی وہ اس بات کا ذکر کر ہی رہا تھا کہ ایک دبلا پتلا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ برٹن نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ مسٹر ہینڈرسن ہے۔ ہیڈ کیشئر۔ یہ آپ کو کیش وغیرہ کی جانچ پڑتال کروا دے گا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو اس دوران میں میں چند ایک خطوط دیکھ لوں۔ اس کے علاوہ کچھ اور چھوٹے موٹے کام ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بینک میں کام بہت زیادہ...."

"کوئی بات نہیں۔" ہیلورٹن نے کہا۔ "آپ اطمینان سے کام ختم کریں۔ جب تک میں کیش چیک کرتا ہوں۔ چلیے مسٹر ہینڈرسن..."

اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور ہینڈرسن کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بینک کے بیرونی دروازے بند کردیئے گئے تھے۔ اور عملے کے زیادہ تر آدمی جا چکے تھے۔ جب وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے اپنی کیپ کا کنارہ چھو کر اسے سلام کیا۔ عملے کا ہر فرد اس کی حیثیت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ ہینڈرسن اسے لیے ہوئے ایک آہنی دروازے کے سامنے رک گیا۔ پھر اس نے مختلف چابیاں لگانے کے بعد دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہوگئے۔ کمرے کے اندر چاروں طرف چھوٹے چھوٹے آہنی شیلف بنے ہوئے تھے۔ جن کے اندر نوٹوں کی گڈیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔

"جناب آج تک کا تمام کیش یہاں لاکر رکھ دیا گیا ہے۔" ہینڈرسن نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرف... یعنی بائیں طرف تمام بڑے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہر شیلف کے اوپر...."

ابھی وہ یہ بات کر ہی رہا تھا کہ ہیلورٹن کا بھاری بریف کیس پورے زور کے ساتھ اس کے سر پر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے رنگ ناچ گئے منہ سے ہلکی سی آواز برآمد ہوئی اور وہ آرام سے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

ہیلورٹن نے بریف کیس میں سے ٹیپ اور نائلون کی ڈوری نکال کر ہینڈرسن کے ہاتھ باندھ دیئے اور منہ پر ٹیپ لگا دی۔ اس کام میں مشکل دو منٹ صرف ہوئے۔ اگلے دو منٹوں میں اس نے بریف کیس میں رکھے ہوئے سیسے کے ٹھوس ٹکڑے خیر سگالی کے طور پر شیلف میں رکھ دیئے۔

جب وہ بریف کیس اٹھائے ہوئے برٹن کے دفتر میں داخل ہوا تو آخرالذکر حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا۔

"اتنی جلدی کام ختم کرلیا مسٹر ہیلورٹن؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی کچھ کام باقی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بریف کیس گھما کر برٹن کے سر پر دے مارا۔ برٹن کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ ہیلورٹن نے جیب سے نائلون کی ڈوری اور ٹیپ نکالی اور چند منٹوں کے اندر اس کی بھی مشکیں کس دیں۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور دروازے کے درمیان توقف کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب مسٹر برٹن۔ میں لنچ کے فوراً بعد آپ سے ملوں گا۔" یہ بات اس نے خاص اونچی آواز میں کہی تھی تاکہ دروازے پر کھڑا ہوا چوکیدار بھی سن لے "اس وقت تک آپ باقی اندراجات بھی مکمل کرلیں۔"

پھر وہ پُروقار انداز میں چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر پہلے والی خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ چوکیدار باادب کھڑا ہوگیا۔ اور دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "گڈ آفٹرنون مسٹر ہیلورٹن۔"

ہیلورٹن ہولے سے سر کو جنبش دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

❊❊

وہ گزشتہ دو سال سے اس منصوبے کی تیاری کررہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک بینک ایگزامینر کو تلاش کیا اور کسی طرح سے اس کے شناختی کاغذات حاصل کیے۔ پھر اس نے ایک ایکسپرٹ دوست کی مدد سے ان کاغذات کی نقلیں تیار کرائیں اور ان پر جے ٹی ہیلورٹن کا نام لکھوایا۔ آخر میں اس نے اکاؤنٹس اور بینکنگ کی تربیت حاصل کرلی۔ وہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس پر زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ عمل درآمد کیا جاسکتا تھا اور یوں بھی ڈالروں سے بھرا ہوا بیگ زندگی بھر کے لیے کافی تھا۔

اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ سارا کام اس کی توقعات سے بڑھ کر آسان ثابت ہوا تھا۔ اس کی موجودگی سے بینک کے سارے عملے کے درمیان خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم از کم نصف گھنٹے تک چوکیدار کو کوئی شک نہیں ہوگا۔ اس وقت تک لیفٹی ٹیرنس عرف جے۔ ٹی ہیلورٹن جائے واردات سے بہت دور پہنچ چکا ہوگا۔ اس کا لباس، نقلی بال، نقلی ناک، نقلی بھنویں اور دیگر سامان تلف ہوچکا ہوگا۔ زندگی میں صرف ایک جرم کرنے والا کبھی نہیں پکڑا جاسکتا۔ بشرطیکہ وہ ذہین ہو۔

اس کے چہرے اور چال ڈھال کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بینک لوٹ کر جارہا ہے۔ وہ نہایت تمکنت سے چلتا ہوا اپنی کار کے پاس پہنچ گیا جو ایک بلاک پرے ایک سنسان گلی کے اندر کھڑی تھی۔ اس نے اطمینان

کے ساتھ کار کا دروازہ کھولا۔ بریف کیس پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ اور اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھ کر کار اسٹارٹ کردی۔

دفعتاً ایک سخت چیز اسے اپنی گردن کی پشت پر چبھتی محسوس ہوئی۔

"پیچھے نہیں مڑنا۔" ایک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "سیدھے بیٹھے رہو۔ اگر تم نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو شوٹ کردوں گا۔"

لیفٹی نے فوراً یہ آواز شناخت کرلی۔ یہ اس بینک کیشئر کی تھی جسے اس نے سب سے پہلے اپنا کارڈ دکھایا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس شخص نے کس طرح اتنی جلدی تمام حالات پر آگاہی حاصل کرلی۔ شاید اسے ابتدا ہی سے شک ہوگیا تھا۔ اور وہ باہر آکر اس کی گاڑی میں چھپ گیا تھا لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس نے ہیڈ کیشئر اور وائس پریذیڈنٹ کی مشکیں کس دی ہیں اور ایک خطیر رقم کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کررہا ہے۔

لیفٹی نے بے اختیار مڑ کر پیچھے دیکھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر فوراً ہی اپنے ارادے پر قابو پالیا۔ اس نے سوچا کہ گولی اس کا بھیجا اڑا دے گی اور اخبار والے اس بزدل بینک کلرک کو ہیرو بنا دیں گے۔ اس کے تخیل میں اخبار کی سرخی بھی گھوم گئی۔

"بینک کے نوجوان اور دلیر کیشئر نے جان پر کھیل کر ڈکیتی کی کوشش ناکام بنادی۔ ڈاکو گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔"

پس اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کا ارادہ ترک کردیا اور سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، میری بات سنو...."

"شٹ اپ۔" کیشئر نے اس کی گردن میں پستول کی نالی چبھوتے ہوئے کہا۔ "جہاں میں کہتا ہوں وہیں گاڑی لے چلو۔ میں اس جگہ پر تمہیں شوٹ کرنا پسند نہیں کروں گا۔ لیکن اگر...."

"مجھے بھی یہاں مرنا پسند نہیں۔" لیفٹی نے کہا۔ "بولو کہاں چلوں؟"

❊❊

ان کی کار شہر سے پانچ میل دور نکل آئی۔ دریا کا پل پار کرنے کے بعد کیشئر کی ہدایت پر لیفٹی نے گاڑی کو ایک کچے راستے پر ڈال دیا۔ اور بالآخر... درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے روک دیا۔

"کار سے باہر نکل آؤ۔" کیشئر نے حکم دیا۔ "اور اس طرف کھڑے ہوجاؤ۔"

لیفٹی کار سے باہر نکل آیا اور کیشئر کی ہدایت کے مطابق کھڑا ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا معلوم نہیں یہ شخص کیا چاہتا ہے۔ تمام دولت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے یا نصف کا حصے دار؟

"سنو برخوردار۔" لیفٹی نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم یہ پستول جیب میں رکھ لو۔ تاکہ ہم کاروبار کی بات کرسکیں۔ مجھے قتل کرکے تم بچ نہیں سکو گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ...."

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نوجوان کیشئر کے چہرے پر ابھی تک سابقہ بدحواسی اور بوکھلاہٹ نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا ہورہا تھا اور پستول والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"تم... میں تمہیں قتل کرسکتا ہوں۔" اس نے جوش کے ساتھ کہا۔ "تمہیں قتل کرکے تمہاری لاش یہیں کہیں گڑھے میں دفن کردوں گا۔ اور سوموار کی صبح پستول صاف کرکے واپس بینک کے سیف میں رکھ دوں گا۔ کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔"

"سنو، دوست ایسی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں۔" لیفٹی نے کہا۔ "ہم آپس میں کوئی سمجھوتا کرسکتے ہیں۔ میں 'جیو اور جینے دو' پر یقین رکھتا ہوں۔"

"لیکن جب تم ان کتابوں کی چیکنگ کروگے جو تمہارے بریف کیس میں بند ہیں تو یقیناً تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کیش میں سے ابھی خاصی رقم نکال چکا ہوں۔ تقریباً آٹھ ہزار ڈالر۔ پھر مجھے قید کی سزا ہوجائے گی اور بدنامی الگ ہوگی۔ میرا سارا مستقبل برباد ہوجائے گا۔"

یہ سن کر لیفٹی کو پتہ چلا کہ اصل بات کچھ اور ہی ہے۔ پس اس نے نوجوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میاں تم بھی پورے احمق ہو۔ میرے پاس نہ تو کوئی کتابیں ہیں اور نہ ہی میں اکاؤنٹس چیک کروں گا۔ سچی بات پوچھو تو میں بینک ایگزامینر ہی نہیں...."

"مجھے فریب دینے کی کوشش نہیں کرو مسٹر ہیلورٹن۔" کیشئر نے کہا۔ اس کا پستول والا ہاتھ زور زور سے کانپنے لگا۔ "اکاؤنٹس کی تمام کتابیں تمہارے بریف کیس کے اندر موجود ہیں۔ جب تم بینک میں داخل ہوئے تھے تو تمہارا بریف کیس خالی اور ہلکا تھا۔ پھر جب تم باہر نکل کر کار کی طرف آرہے تھے تو جس انداز سے تم نے بریف کیس اٹھایا ہوا تھا اس کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھرا ہوا تھا۔"

لیفٹی نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "تم میرے وہم و گمان سے بھی بڑھ کر احمق ہو۔ ٹھہرو میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ بریف کیس میں کیا چیز ہے۔"

"آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرو مسٹر ہیلورٹن۔" کیشئر نے چیخ کر کہا۔ "اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔"

لیفٹی نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بات تو سنو۔ جب تم دیکھو گے کہ بریف کیس کے اندر کیا چیز ہے تو تم خود ہی ساری بات...."

پھر ایک زوردار دھماکا ہوا اور لیفٹی خاک میں لوٹنے لگا۔

❊❊

واپسی میں کار چلاتے ہوئے نوجوان کیشئر بدستور کانپ رہا تھا۔ دریا کے قریب جاکر اس نے کار روک دی۔ اور بریف کیس کو دریا کی لہروں کے سپرد کرنے سے پہلے کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے بریف کیس کو دریا کے اندر پھینک دیا اور پُرسکون نظروں سے اسے لہروں کے اندر غائب ہوتا دیکھتا رہا۔

❊●❊

سوالیہ زمانہ اسمگلر صفدر علی کی سنسنی خیز سرگزشت

۱۲

اقلیم علیم

سابقہ قسطوں کے خلاصے کے ساتھ

میں ایک تجارت پیشہ گھرانے کا فرد اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ بے جا لاڈ پیار نے میری عادتوں پر خاصا گہرا اثر ڈالا تھا۔ پیسے کے معاملے میں والدین بڑے فراخ دل تھے اور اسی لئے فلم بینی، سگریٹ نوشی، جوا اور آوارہ گردی میری فطرت کے لازمی جز و بن گئے تھے۔ ایک دن کالج کے ایک دوست اکبر کی ترغیب پر میں نے شراب پی اور میرے بہکے ہوئے قدم بالاخانے کی سیڑھیوں پر جا پہنچے۔ پھر ایک مشہور ہوٹل میں ایک کھیل کے ذریعے میری ملاقات گلنار سے ہوئی۔ میں اس کا فرد احسینہ پر مرمٹا۔ میں اس کی سالگرہ پر ایک یادگار تحفہ دینا چاہتا تھا لیکن میرے پاس پیسے نہ تھے، والدین میری عادتوں سے تنگ آچکے تھے۔ آخر شام کے وقت میں کچھ سوچ کر دکان پر پہنچا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی سے تین ہزار روپے طلب کیے، مگر ان کے انکار پر زبردستی تجوری سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال لی۔ اتنے میں اباجی آگئے۔ میری اس حرکت پر وہ بہت سیخ پا ہوئے۔ میں انھیں میز پر دھکیل کر رقم لئے باہر نکل آیا۔ پھر جب رات کے دو بجے میں گھر پہنچا تو ملازم نے مجھے داخل نہیں ہونے دیا۔ میں نے غصے میں آکر گاڑی کا ہارن مسلسل بجایا، پھر گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی تو ماں غصے میں بھری ہوئی باہر آئیں اور تھپڑ مار کر بولیں "چلا جا یہاں سے اب اس گھر میں تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں۔" وہ پوری رات میں نے لارنس گارڈن میں گزاری۔ صبح کے اخبار میں والد صاحب کی طرف سے عاق نامہ شائع ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر گھر فون کیا، معلوم ہوا کہ بلڈ پریشر کی وجہ سے اباجی کی دماغی شریان پھٹ گئی اور وہ انتقال کر گئے۔ اب میں خود کو اباجی کا قاتل محسوس کرنے لگا تھا۔ گلنار نے بھی بے رخی اختیار کی اور میں نے دل برداشتہ ہو کر لاہور چھوڑ دیا اور کراچی آکر ایک نئی زندگی کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں نے کالے دھندے سے اتنا کمایا کہ دولت میری غلام بن گئی۔ کچھ دنوں سے میرا ستارہ گردش میں تھا، کسٹم والوں کے تین کامیاب چھاپوں نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک روز میرے گھر جوئے کی محفل جمی تھی اور میں بازی پر بازی ہار رہا تھا آخر میں نے بچا کچا مکان بھی داؤ پر لگایا اور یہ بازی بھی ہار گیا۔ میں نے سوٹ کیس میں تجوری سے سمیٹ کر ساری رقم بھری اور باہر آگیا۔ پھر میں نے کلفٹن برج کے ایک اندھیرے چوراہے پر کار روکی اور اپنی سیکریٹری سوزی کے ہاتھ میں کچھ رقم تھما کر اس سے رخصت چاہی اب میں ایک مفرور اسمگلر تھا اور گرفتاری کے خوف سے ادھر ادھر دھکے کھا رہا تھا۔ آخر میں نے بی مارکیٹ کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پناہ لی۔ میں گیارہ دن تک اسی غلیظ ہوٹل میں رہا۔ میرے چہرے پر داڑھی اُگ آئی تھی جس کی وجہ سے میری پہچان آسان نہ تھی۔ میں نے ستار سیٹھ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس ظالم نے میری اس عادت سے کہ میں تاش کی گڈی میں حکم کی بیگم سب سے اوپر رکھنے کا عادی ہوں مجھے پہچان لیا اور میری توہین کرنی چاہی۔ میں غصے میں کھولتا ہوا اس کی دکان سے نکل آیا اور سیدھا میٹیو روڈ والے ہوٹل پہنچا۔ ایک خوبصورت لڑکی ہوٹل والے سے مارفیا لگوانے آئی اور جب وہ باہر نکلی تو میں نے اس کا تعاقب کر کے اس کے ساتھ شب بسری کی پیشکش کر دی۔ لڑکی نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ جمع ہو گئی اور دو پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا اور تھانے لے گئے۔ لیکن وہاں اے ایس آئی کا رویہ دیکھ کر لڑکی نے میرا بازو پکڑا اور یہ کہہ کر اٹھ گئی کہ یہ شخص بے قصور ہے۔ لڑکی کی حالت اچانک غیر ہو گئی تھی اس کا چہرہ زرد تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی میں نے بمشکل اسے اس کے ہوٹل پہنچایا اور مارفیا کا انجکشن لگانے سے پہلے اس کے جسم سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کیس کے بعد میں نے اپنا ہوٹل چھوڑ دیا اور مسز جمیل کے ہیلی ہاؤس میں اٹھ آیا۔ یہاں کئی لوگوں سے دوستی ہو گئی۔ ایک دن فاروقی کے کہنے پر میں کلب چلا گیا۔ وہاں حکم کی بیگم نے اپنا کام دکھایا بعد ایک بڑے اسمگلر نے مجھے پہچان کر تاش نہ کھیلنے کا مشورہ دیا۔ میں سے مطمئن کر کے جب ہیلی ہاؤس کے گیٹ پر پہنچا تو پولیس محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ میں وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔ میری جیب خالی ہو چکی تھی۔ پھر میری ملاقات جمال نامی سنیاسی سے ہو گئی۔ وہ کیمیاگر تھا ہم دونوں نے مل کر بیس سیر سونا بنایا۔ یہ سونا اصل کے مطابق تھا پر اصلی نہ تھا۔ میں نے یہ سونا اپنے ایک پرانے اسمگلر کے ہاتھ فروخت کر کے دو لاکھ روپے حاصل کر لیے اور جمال کو لے کر مری آگیا جہاں اسے کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دے کر لاہور چلا آیا تاکہ اپنے گھر والوں سے مل سکوں۔ لاہور کے بازارِ حسن میں میری ملاقات اچانک اکبر سے ہوئی اور اس کے ساتھ میں گلنار کے پاس آیا۔ اپنی محبوبہ کو بیسوا کے روپ میں دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے ہوشیاری سے اکبر اور گلنار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے قتل کے بعد میں ایک جوئے خانے میں پہنچا جہاں میرا رقم سے بھرا بریف کیس غائب ہو گیا۔ سخت مایوسی کے عالم میں مری پہنچا اور اسے لے کر ڈھاکہ روانہ ہو گیا۔ وہاں جمال مجھے طیب مدراسی کے پاس لے گیا جو نہایت خبطی اور خود غرض کیمیاگر تھا جب اسے پتہ چلا کہ ہم جادو کی تلاش میں آئے ہیں تو اس نے مشتعل ہو کر جمال کو قتل کر دیا اور خود دہشت سے چل بسا۔ اپنی جان بچانے کے لئے مجھے چندر سین نامی ایک ہندو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اس کا منظم گروہ مشرقی صوبے میں مقامیوں اور غیر مقامیوں میں نفرت کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ اس گروہ کی جانب سے مجھے پہلا کام یہ ملا کہ اناج سے لدا ایک ٹرک سرحد پار لیجاؤں۔ راستے میں تعاقب کیا گیا اور میں نے تعاقب کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کی جیپ میں سرحد کی طرف روانہ ہو گیا لیکن سرحدی محافظ کو مجھ پر شک ہو گیا اور میں جیپ سے اترنے کی بجائے بانس کی رکاوٹیں توڑتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھ پر فائر کھول دیئے گئے جس سے جیپ بیکار ہو کر الٹ گئی۔ میں جان بچانے کی خاطر جنگل میں چھپ گیا۔ جنگل میں ہی ایک لڑکی رکھی سے میری دوستی ہو گئی اس نے میرے لئے کھانے اور ایک جھونپڑی کا بندوبست کر دیا لیکن میں پکڑا گیا۔ فوج کے کیپٹن بھاٹیہ کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر میں نے اسے اپنی مجرمانہ زندگی اور کیمیاگری کی کہانی اسے سنا دی۔ وہ خود بھی کیمیاگری کے جنون میں مبتلا تھا، اس نے مجھ سے عہد لیا کہ رہائی کے بعد وہ بھاٹیہ اس کی تلاش میں اس کا شریک سفر رہے گا۔ ایک دن ہیڈ کوارٹر سے میرے لئے احکامات آگئے، مجھے پٹنہ جیل میں دو سال گزارنا تھے جیل میں چند ایسے قیدی جو طویل سزا سے اکتا کر فرار ہونے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے میرے دوست بن گئے۔ آخر کار جیل کی سالانہ دعوت کے موقع پر گندے پانی کے نالے کے ذریعے ہم جیل سے باہر آگئے۔ یہ شہر میرے لئے اجنبی تھا میں نے ایک بھکاری کے کپڑے چرا کر قیدیوں کا لباس تبدیل کیا اور قریبی اسٹیشن سے چلتی ہوئی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ یہاں میری ملاقات شیکھر سے ہوئی اور ہم دونوں نے نیپال بھاگ جانے کا پروگرام بنایا۔ موتی ہاری جاتے ہوئے شیکھر ایک ہیتی لڑکی پر مر مٹا اور اسے بھگا کر لے گیا اب اس لڑکی کے ساتھی جوزف کو میں اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔ ایک شخص نے ہمیں اس شرط پر کہ اس کی اسٹیشن ویگن سرحد پار اس کے آدمی کو پہنچا دیں سرحد پار کرانے کا وعدہ کیا۔ لیکن سرحدی چوکی پر ہم پکڑے گئے۔ تمام ٹائر پھاڑ دیتے گئے تو اس میں سے تھیلے برآمد ہوئے۔ ہمیں

ہتھکڑیاں لگا کر ایک لاری میں سوار کرا یا گیا اور ایک بستی میں لیجایا گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ کسی شخص نے ہماری ضمانت دی ہے لیکن رہا کرنے سے پہلے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ وہاں ہم ایک سرائے میں آئے اور سرائے والے نے ایک جراح کو لا کر میری مرہم پٹی کرائی۔ رات کو میرے بستر میں ایک ہپی لڑکی مجھ سے آ چمٹی صبح میں نے اسے دس روپے دے کر رخصت کیا لیکن اس کے ساتھی مرد نے آکر دو روپے اور اینٹھ لیے۔ جوزف نے رات کو جوئے میں جیتی ہوئی رقم میں سے نصف کا مطالبہ کیا۔ بحث و تکرار کے بعد آخر بچاس روپے پر بات ٹل گئی اور جوزف نے اپنی راہ لی۔ چوتھے روز مجھے ایک قوی ہیکل آدمی ملا اور بتایا کہ وہ سفید ہاتھی کی کھال والے کا آدمی ہے اور اسی گروہ نے میری ضمانت کرائی تھی کیونکہ وگن سے برگ مرچنٹ والا مال ان لوگوں کا تھا۔ اس شخص سے چھٹکارہ پا کر میں کھٹمنڈو جانے والی ایک لاری میں سوار ہو گیا لیکن املیکھ گنج پر لاری رات بھر کیلئے رک گئی۔ وہ رات ایک بار میں ہپیوں کے ساتھ گزاری جو صبح میری ساری رقم لیکر چلتے بنے میں نے اپنا حلیہ بھکاریوں جیسا بنایا اور آوارہ گردوں کی طرح کھٹمنڈو پہنچا۔ یہاں ایک میلے میں میری نظر اندرام پر پڑی وہ ایک یوگی کے روپ میں تھا اس کے جسم پر آہنی زنجیروں کی زرہ تھی۔ اس کے گرد ہپیوں کا ہجوم تھا اور وہ اسے اپنا پوپ اور بہار شی کہتے تھے۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے پیچھے اس کی خانقاہ میں آگیا لیکن وہاں میرا ٹکراؤ بھابھہ سے ہو گیا۔ وہ رات میں نے وہیں گزاری صبح میں نے اندرام کا تعاقب کیا مگر وہ بستی میں جا کر کہیں روپوش ہو گیا۔ میں اسی طرح گھوم رہا تھا کہ دو قوی ہیکل آدمیوں نے ریوالور دکھا کر مجھے گھیر لیا وہ مجھے ایک سانحہ زدہ عمارت میں لے گئے جہاں مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں امیر خاں کی حراست میں ہوں جس نے مجھے سرائی کوتوالی سے ضمانت پر رہائی دلائی تھی۔ اس نے ڈرا دھمکا کر مجھے اپنے ساتھ کام کرنے پر راضی کر لیا۔ اور میرے کام سے متاثر ہو کر زیرو پوائنٹ کا انچارج بنا دیا۔ ایک دن باس نے آکر بتایا کہ امیر خان کے بعد تم میرے معتمد ہو اس نے ایک پولیس افسر اور اس کی بیوی کو اغوا کرکے لیلاوتی کی برہنہ تصاویر اتاریں اور بعد میں پرشوتم اور لیلا کو ان کی دیہی رہائش گاہ پر پہنچانے کا حکم دیا۔ لیکن دوسرے دن اخبارات میں پولیس افسر پرشوتم اور لیلاوتی کی خودکشی کی خبر تھی۔ امیر خان نے بتایا کہ ان دونوں کو ہلاک کرنے والا وہ خود ہے اور یہ سب کچھ باس کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ مجھے برونز آرٹ فیکٹری میں مخبری کا تقرر نامہ ملا نیا کام میرے لیے غیر متوقع تھا۔ میں نے فیکٹری کا معائنہ کیا۔ فیکٹری سیٹھ اور کالیتی کے جھوٹے ایکسپورٹ کرتی تھی دوپہر کو فیکٹری سے ملحق اپنی رہائش گاہ پر آیا تو جگدیو سے پتہ چلا کہ مجسموں کے ذریعے کوکین پوری دنیا کو سپلائی کی جاتی ہے۔ تنظیم کو ختم کرنے کے لیے میں نے جو اسکیم سوچی اس کے پیش نظر میں نے نرائن داس کو فون کیا اور دوبارہ فون کرنے پر شبہ ہوا کہ جواب دینے والا ڈی ون ہے میں نے اسے راز افشا کرنے کی دھمکی دے کر پچاس ہزار کا مطالبہ کیا اس نے ادائیگی کا وعدہ کر لیا لیکن سوٹ کیس میں رقم کے بجائے بم رکھ دیا۔ اس واقعے کے بعد میں نے جگدیو کو ٹھکانے لگا دیا۔ دو دن بعد فرار ہو کر کھٹمنڈو کے شمال میں ایک گاؤں میں روپوش ہو گیا۔ لیکن ڈی ون نے ٹیکسی ڈرائیور کے ذریعے جس نے مجھے گاؤں پہنچایا تھا میرا پتہ معلوم کر کے مجھے پکڑنے کے لئے امیر خان کی سرکردگی میں گروہ کے آدمیوں کو گاؤں بھیج کر مجھے پکڑ لیا اور مجھ سے فرار کی وجہ پوچھی تو میں نے فرضی کہانی سنا دی کہ جگدیو کو ہلاک کرنے والے نے مجھ سے فیکٹری کے راز مانگے تھے۔ انکار کی صورت میں مجھے جان کا خطرہ تھا اس لئے میں بھاگ نکلا۔ باس نے مجھے دوبارہ فیکٹری میں متعین کر دیا۔ جہاں لونا سے میں نے شادی کا وعدہ کر لیا۔ اسی دن میں نے باس کو فرضی دشمن کے فون کے بارے میں بتایا۔ پھر میں نے گریسی کے شراب خانے سے آنند بھون فون کیا اور اسی بھرائی ہوئی آواز نے مجھ سے مصالحت کی کوشش کی اور میں دوسرے دن آنند بھون پہنچ گیا۔ لیکن وہاں کچھ اور ہی ڈرامہ کھیلا گیا اور جے کمار کو مار دیا گیا۔ وجے کی موت کے بعد معاملات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ نرائن داس کا کردار پہلے ہی مشکوک تھا اب مزید تصدیق ہو گئی کہ تنظیم کی پشت پر اسی کا ہاتھ ہے۔ ایک رات میں چھپ کر نرائن داس کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔ جہاں بمبار کے کمرے سے گیتا اور نرائن کی گفتگو سنی اور میں سناٹے میں آگیا۔ پھر کچھ دیر بعد نرائن داس کمرے میں آیا اور اس نے کرخت آواز میں کہا "مسہری کے نیچے کون ہے؟" میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

آواز نرائن داس کی تھی۔ میں بے چون و چرا مسہری کے نیچے سے نکل آیا۔ اس نے پستول کی زد پر لئے ہوئے مجھ سے اپنے کمرے میں آنے اور تنظیم سے بغاوت کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک کاغذ پر جو بڑی نے لکھا تھا مجھے آپ کی خوابگاہ کی تلاشی لینے کا حکم ملا تھا۔ اسے بھی میری بات کا یقین آگیا لیکن وہ میری طرف سے نہ جانے کیوں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ پھر وہ مجھے لے کر ایک سرنگ میں داخل ہوا جس کا اختتام گٹر لائن میں ہوتا تھا۔ وہیں میری ملاقات نرائن داس کے گونگے اور وحشی ملازم سے ہوئی تھوڑی دیر اس گٹر لائن میں چلنے کے بعد ایک جگہ گونگے ملازم نے گٹر کا ڈھکن اوپر اٹھایا تو میں اور نرائن داس باہر نکل گئے اور ملازم وہیں رہ گیا۔ رات کی تاریکی میں ایک جگہ مجھے موقع مل گیا اور میں نے نرائن داس کو ٹھکانے لگا دیا۔ آوازیں سن کر اسی وقت آنند بھون کے بہت سے محافظ دریافت حال کے لئے میری طرف دوڑ پڑے۔ ایک قریبی درخت پر چڑھ کر میں نے ان سے اپنی جان بچائی۔ محافظوں کے چلے جانے کے بعد میں درخت سے اترا اور مین ہول کے ذریعے گٹر لائن میں اتر کر نرائن داس کے ملازم کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اسے ٹھکانے لگا کر میں کھٹمنڈو واپس آیا۔ برونز آرٹ فیکٹری پہنچ کر لونا کو لیا اور مقامی اسلامک مشن پہنچ کر اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ پھر اسے رائل ہوٹل میں چھوڑ کر امیر خان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ گریسی کے شراب خانے میں مجھے امیر خان مل گیا جیپ میں سفر کرتے ہوئے میری کسی بات پر امیر خان زور سے ہذیانی انداز میں ہنس پڑا اور میرا ہاتھ اسٹیرنگ پر بہک گیا اگر وہ سڑک پیلڈ نہ ہوتی تو یقیناً کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا۔۔۔ میں نے پوری طاقت سے بریک لگا کر جیپ سڑک کے کنارے روک دی اور اسی وقت کسی ریوالور کی سرد سی نال میری گردن سے آلگی۔۔۔

اب آپ آگے کے واقعات پڑھیے

"**خبردار** صفدر علی... اگر تو نے اس وقت ذرا بھی حرکت کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا" امیر خان میری گردن پر ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے غرایا۔

"تنظیم سے غداری کا الزام لگا کر تم نے میری ان تمام قربانیوں کی توہین کی ہے جو میں اب تک دیتا آیا ہوں، میں اسی وقت اس الزام کا پس منظر جاننا چاہتا ہوں" میرا لہجہ بے حد تلخ اور جارحانہ تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ امیر خاں اتنی آسانی سے مجھ پر فائر نہ کر سکے گا۔

"ہوش میں رہ کر جیپ اسٹارٹ کرو۔ زیرو پوائنٹ پر میں کچھ دو ٹوک باتیں کرنی چاہتا ہوں" امیر خان کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"اس بے ہودہ کھلونے کو دور رکھو!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "میں اسی صورت میں توجہ سے جیپ ڈرائیو کر سکتا ہوں"

ریوالور کی بے رحم نال میری گردن سے ہٹ گئی اور میں نے جیپ گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔

رات کے سناٹے میں جیپ کے انجن کا تیز شور آسیبی غراہٹوں کی طرح گونج رہا تھا۔ امیر خان میرے پہلو میں خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اب میں اس سے ہونے والی گفتگو کے متوقع پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ مجھ سے کس موضوع پر بات کرنی چاہتا تھا؟

ویران پہاڑوں کی آغوش میں زیرو پوائنٹ کی عمارت اندھیرے میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ عمارت کے اندر کہیں بھی روشنی کی رمق نہیں تھی اور قرب و جوار میں سناٹے کا راج تھا۔ جیپ کا انجن بند ہونے پر وہاں عجیب ہولناک سا سناٹا چھا گیا۔ اس سے قبل کہ میں انجن بند کر کے پہلو بدلتا، امیر خان اچھل کر جیپ سے نیچے اتر چکا تھا اور ریوالور ایک مرتبہ پھر اس کے داہنے ہاتھ میں آچکا تھا گو اس کی نال جھکی ہوئی تھی لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ پلک جھپکنے سے بھی کم عرصے میں اسے مجھ پر آزما سکتا ہے۔

اسے دیکھ کر میں تلخ انداز میں ہنس دیا "نہ جانے تمہارے دل میں میری طرف سے کیا کدورت سما گئی ہے یار؟"

"باتوں میں الجھانے کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں" وہ غرایا "جب تک میں تجھ سے کھل کر بات نہ کروں میرا اعتماد بحال ہونا مشکل ہے"

"خوب!" میں جیپ سے اترتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا "تو گویا تم مجھے اپنا قیدی بنا کر یہاں لائے ہو؟"

اس نے میرے طنز پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ اس نے چابی میری طرف اچھالی اور خود میرے پیچھے چلنے لگا۔ میں نے قفل کھولا اور تاریک راہداری میں داخل ہو گیا۔ میں کئی قدم بڑھ گیا مگر اس کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دی۔

"کہاں رک گئے؟" میں پلٹ کر تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ دل میں ہلکا سا خوف ہونے کے باوجود میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں اس سے قطعی خائف نہیں ہوں اسی وقت اچانک تیز کھٹکا ہوا۔ میں تیر کی طرح واپس لوٹا مگر مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ امیر خان نے عمارت کا دروازہ بند کر کے باہر سے بولٹ کر دیا تھا۔

"امیر خان۔ یہ کیا مذاق ہے؟" میں غصہ اور جھلاہٹ کے ساتھ اونچی آواز میں بولا۔

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے" باہر سے امیر خان کی سرد آواز ابھری "اس دروازے کے سوا تم کسی راستے سے نہیں نکل سکو گے لہذا بہتر یہی ہے کہ سکون کے ساتھ اندر موجود رہو!"

میں نے پوری قوت سے دروازہ پیٹا لیکن جواب نہ آیا پھر سناٹے میں جیپ کے انجن کا شور ابھرا۔ میں کنجی اگنیشن ہی میں چھوڑ آیا تھا اور امیر خان اب اس غفلت کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ جیپ کے انجن کا شور آہستہ آہستہ دور ہوتا سنائی دے رہا تھا!

مجھ پر جھلاہٹ کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ کافی دیر تک میرا ذہن کام ہی نہ کر سکا۔ پھر آہستہ آہستہ میرے ذہن سے غصے کی دھند چھٹی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں چند متوقع خطرات سے دوچار ہوں۔ امیر خان نے راستے میں پہلے مجھے تنظیم کے سربراہ سے غداری کی ترغیب دی اور جب میرے محتاط بلکہ فیصلہ کن جواب سے اسے مایوسی ہوئی تو اس نے کھلے الفاظ میں مجھ پر تنظیم سے غداری کے رجحانات کا الزام عائد کر دیا۔ اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ میری تمام تر احتیاط کے باوجود امیر خان میری جانب سے مشکوک ہو چکا تھا ورنہ وہ یوں دو بدو مجھ سے ٹکرانے کی ہمت نہ کرتا۔ عام حالات میں اس کیلئے سربراہ کی ہدایات کے بغیر آزادانہ طور پر اتنا بڑا قدم اٹھانا ناممکن تھا۔

امیر خان کی دانست میں تنظیم ابھی تک موجود تھی۔ سربراہ بدلا ضرور تھا مگر موجود تھا۔ یہ راز صرف میں ہی جانتا تھا کہ تنظیم اپنے تمام تر وسائل کے باوجود سربراہ کے بغیر منتشر جرائم پیشہ افراد کے غیر مؤثر گروہ میں بدل چکی ہے۔ نرائن داس کی موت کے بعد اب اس فتنہ کے سر ابھارنے کا کوئی امکان نہ تھا جو معاشرتی خرابیوں سے قطع نظر میری آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

میں نے عمارت کے ایک اندرونی کمرے میں روشنی کی اور حسب توقع مجھے وہاں شراب کی چند بوتلیں نظر آگئیں۔ میں کرسی پر دراز ہو کر شراب سے شغل کرنے لگا۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ امیر خان کی واپسی کا انتظار کروں۔

میں یہ جانتا تھا کہ زیرو پوائنٹ سے کسی بیرونی مدد کے بغیر میرا نکلنا محال ہے۔ میں وہاں گلا پھاڑ پھاڑ کر مر جاتا مگر اس ویرانے میں میری آواز سننے والا کوئی بھی ذی روح موجود نہ ہوتا۔ دوسری طرف امیر خان شاید میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح تنظیم کے سربراہ سے ہدایات لینے گیا تھا اپنے طور پر اس نے مجھے قیدی تو بنا لیا تھا لیکن اس سے آگے کوئی قدم اٹھانے کی اس میں جرأت نہیں تھی میرے قیاس کے مطابق سربراہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد امیر خان کو میری ہی طرف واپس آنا تھا اور اس کی آمد پر مجھے نجات کی کوئی راہ نکالنی تھی۔

پھر میں نے اضطراری طور پر گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے میں یک بیک مضطرب ہو گیا۔ لونا کی یاد میرے دل میں جاگ اٹھی۔ میری وہ نوبیاہتا بیوی شب عروسی کے انتظار میں ہوٹل کے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ میں اس سے ساڑھے دس بجے تک واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ نہ جانے اس تاخیر پر وہ کیا سوچ رہی ہوگی؟ میں اسے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں مختصر طور پر کافی باتیں بتا چکا تھا وہ جانتی تھی کہ میں کچھ مقامی جرائم پیشہ لوگوں سے نبرد آزما ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر معمولی تاخیر سے گھبرا کر وہ میری تلاش میں ہوٹل سے نکل پڑے اور نئی مشکلات میں گھر جائے۔

طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بارہ بجے کے قریب باہر سے کسی جیپ کا شور سنائی دیا اور میں روشنی گل کر کے تیزی کے ساتھ نکاسی والے دروازے پر جا پہنچا جسے امیر خان باہر سے بند کر کے گیا تھا۔

جیپ کا انجن بند ہونے کے بعد قدموں کی چاپ ابھری پھر کسی نے باہر سے دروازہ کھول دیا ساتھ ہی کسی طاقتور ٹارچ کی روشنی کھلے ہوئے دروازے میں سے میرے چہرے پر پڑی۔

چند ثانیوں تک میں اس چکا چوند کے باعث کچھ نہ دیکھ سکا پھر امیر خان کی سپاٹ آواز ابھری "زیادہ ہوشیاری کی ضرورت نہیں، میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور بھی موجود ہے!"

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" میں جھلا کر چیخا "میرے چہرے سے یہ روشنی ہٹاؤ میں تمہیں پھاڑ نہیں کھاؤں گا"

"اندر چلو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری کام ہے۔" اس نے روشنی فرش پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس وقت بہت ضروری کام ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بات تم بعد میں کر لو" میں نے اپنی کھوپڑی پر قابو پاتے ہوئے مصالحانہ لہجے میں کہا۔

"تنظیم کے معاملات ہر حال میں افضل ہیں۔ اندر چلو!"

ناچار مجھے عمارت میں واپس جانا پڑا۔ روشنی کرنے کے بعد ہم دونوں

لیک کر میں جا رکے۔ امیر خان نے ٹارچ بجھا لی تھی مگر ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

"تنظیم کا نیا سربراہ سخت گیر اور بے رحم فرد معلوم ہوتا ہے لیکن میں پوری طرح اس کا وفادار ہوں!"

"یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اور تم نے مجھے یہاں کس لئے قید کیا تھا؟"

"نئے سربراہ سے تمہاری آخری بار کب بات ہوئی تھی؟" اس نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کل۔۔۔ انند بھون میں ہی مجھے اس کا فون ملا تھا اور میں نے وہ عمارت فوری طور پر چھوڑ دی تھی۔"

"اس کے بعد آج اس نے مجھے انند بھون چھوڑنے کا حکم دیا۔ تو وہاں پیش آنے والے تمام حالات سے باخبر معلوم ہوتا تھا۔"

"اگر وہ اتنا باخبر ہے تو اس کے لئے ہم پر برتری قائم رکھنا دشوار ہو جائے۔" میں نے زہر دلا ہوا لہجہ میں کہا۔ "آخر تم ان باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہو؟"

"اس آخری گفتگو کے بعد حالات کا رخ بہت تیزی سے تبدیل ہوا ہے مگر میں اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

"اور شاید اس وقت بھی مجھے یہاں بند کر کے تم میرے بارے میں اس سے ہدایات لینے گئے تھے!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سامنے کی بات ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "مگر اس بار بھی مجھے ناکامی ہوئی۔۔۔ اب مجھے پورا اختیار ہے کہ میں اپنے طور پر تم سے بازپرس کر سکوں!"

"کیسی بازپرس؟" میں نے برہمی کا اظہار کیا۔

"سکون سے برخوردار۔ سکون سے بات کرو۔" وہ ریوالور فضا میں لہرا کر بولا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نرائن داس کی موت کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"اس نے خودکشی کر لی ہے۔ فیکٹری میں مجھے یہی اطلاع ملی تھی!"

"اور اگر میں کہوں کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"آخر اس کی بیوی کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے خود گیتا رانی سے فون پر اس امر کی تصدیق کی تھی اور اس نے بتایا کہ نرائن داس نے خودکشی کی ہے۔"

"یہی بات اہم ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تم انند بھون سے کس وقت روانہ ہوئے؟"

"تم سے الگ ہونے کے تقریباً نصف گھنٹے بعد ہی مجھے فون موصول ہوا تھا۔"

"بکواس!" وہ غضب ناک لہجے میں غرایا۔ "میں پوری طرح تصدیق کر چکا ہوں کہ اس رات انند بھون میں تمہارا کوئی فون نہیں آیا تھا۔"

"اس کی تصدیق تم کو نئے سربراہ سے کرنی چاہئے۔ تمہارے ناقابل اعتبار ذرائع معلومات کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔" میں نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

"خیر۔ میں اس سے تصدیق ضرور کر دوں گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "مگر تو کان کھول کر سن لے کہ تصدیق ہونے تک تو اس عمارت سے نہ جا سکے گا۔"

"کیوں؟"

"میں اصولاً تیری کسی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں مگر اتنا ضرور بتلا دوں کہ نرائن داس نے خودکشی نہیں کی اسے قتل کیا گیا ہے۔" وہ اس انکشاف پر میرا اثر لینا چاہ رہا تھا۔

"قتل۔" میں حیرت سے تقریباً اچھل پڑا اور بے اعتباری سے ہنستے ہوئے بولا۔ "اس عمارت میں مسلح محافظوں کی فوج کی فوج ہوتے ہوئے بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ حقیقت ہے۔" امیر خان بولا۔ "قاتل نے اس کے دہانے میں ریوالور کی نال ٹھونس کر فائر کیا تھا اور بھیجہ اڑ جانے کے باعث نرائن داس نے وہیں دم توڑ دیا۔ قاتل زمین دوز برساتی نالے کے ذریعے انند بھون سے فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ محافظوں نے بعد میں اطراف کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن قاتل کا کہیں سراغ نہ مل سکا پھر گیتا رانی کی ہدایت پر سب لوگ قاتل کو بھول گئے۔ اب انند بھون کا ہر مکین خودکشی کی کہانی سنا رہا ہے!"

"تمہیں یہ راز کیسے معلوم ہوا؟"

"وجے کی ہلاکت کے بعد تو میرے ساتھ واپس لوٹنے کے بجائے وہیں رک گیا تھا جب رات گئے تک تیری واپسی نہ ہوئی تو میں تیری تلاش میں نکلا۔ اس وقت ہر طرف بڑے زور و شور سے نامعلوم قاتل کی تلاش جاری تھی پھر اچانک گیتا رانی کا حکم آیا کہ قاتل کی تلاش احمقانہ ہے۔ سیٹھ نرائن داس نے دیوانگی کے زیر اثر خودکشی کی ہے اور ساری تلاش موقوف ہو گئی۔"

"اس چکر میں میرا نام کہاں آتا ہے جو تم میری جانب سے مشکوک ہو گئے ہو؟"

"میرے ساتھ واپسی کے بجائے تیرا وہاں رکنا، نرائن داس کا قتل، قاتل کا فرار پھر اسی وقت تیرا وہاں سے غائب ہو جانا۔ یہ واقعات ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں!"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں سپنا سے فرسٹ ایڈ کا سامان لینے کے لئے وہاں رکا تھا۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہی۔"

"سپنا نے مجھے بتایا کہ وہ سامان تو نے اسی وقت اسے واپس بھجوا دیا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں محسوس کرتا ہوں کہ تو نے سربراہ کی ہدایت سے تجاوز کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا اب تو اسی عمارت میں مقید رہے گا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز بکثرت موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ کل تک میں سربراہ سے تیرے بارے میں ہدایات لے کر تجھے آخری فیصلہ سنا سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں تلخ لہجے میں بولا۔ "تمہاری ہٹ دھرمی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں!"

امیر خان ریوالور کی نال سے اپنی پنڈلی کھجاتے ہوئے بولا۔ "اگر سربراہ کا فیصلہ تمہارے حق میں ہوا تو میں تم سے معافی مانگنے میں بالکل نہ جھجکوں گا۔"

سربراہ تو میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا لہٰذا امیر خان کبھی بھی اس سے میرے بارے میں ہدایات حاصل نہ کر سکتا تھا جب کہ میرے لئے اس قید میں چند گھنٹے گزارنا بھی محال تھا۔ پونا میری منتظر تھی اور اب میں جلد از جلد اسے ساتھ لے کر اس پونا کی زنجیروں کی طرف نکلنے کا عزم رکھتا تھا۔

ریوالور کی نال سے پنڈلی سہلاتے ہوئے امیر خان ایک لمحے کے لئے میری طرف سے غافل ہوا اور میں فوراً ہی فیصلہ کر کے اس پر ٹوٹ پڑا۔

میرا یہ حملہ امیر خان کے لئے غیر متوقع تھا جو گھبراہٹ میں اس کے ریوالور سے گولی چل گئی اور وہ حلق سے بے معنی آوازیں نکالتا ہوا بے ساختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کی پنڈلی میں سوراخ کرتی آرپار ہو گئی تھی۔

اس نے دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال میری پسلیوں کی طرف گھمانی چاہی مگر میں نے اپنے بائیں گھٹنے سے اس کے بازو پر اتنی شدید ضرب لگائی کہ وہ تکلیف سے تڑپ اٹھا مگر ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔

اس نے مجھے اپنے سینے سے اچھال پھینکنے کی جان توڑ کوشش کی مگر میں جونک کی طرح اس سے لپٹا رہا پھر میں نے پوری قوت سے اس کی کہنی پکڑی اور سینے سے اتر کر اس کی داہنی کلائی دونوں ہاتھوں سے مروڑنے لگا تاکہ کسی طرح ریوالور اس کی گرفت سے نکل سکے!

امیر خان نے چیختے اور کراہتے ہوئے اچانک میرے سینے پر لات ماری اور میں بری طرح کرسی سے الجھ کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ امیر خان لنگڑاتا ہوا فرش سے اٹھا اور میں نے دہشت کے عالم میں لیٹے ہی لیٹے ایک کرسی ٹانگوں سے اس پر اچھال دی۔ امیر خان بے تحاشا گالیاں بکتا ہوا دوبارہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس بار مجھے اپنی جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کا وہ بے آواز ریوالور نکالنے کی مہلت مل گئی جو میں نے انند بھون میں نرائن داس سے چھینا تھا۔ اس کے چیمبر میں ابھی تک دو کارآمد گولیاں موجود تھیں جو امیر خان کو راہ سے ہٹانے کے لئے بہت کافی تھیں۔

"ریوالور پھینک دو امیر خان!" میں نے کو بھیل تحکمانہ آواز میں کہا۔ "میرے ہاتھ میں بھی آٹھ کا ریوالور موجود ہے!"

امیر خان مغلظات بکتا میری طرف گھوما اور ریوالور کے جیب والے پر نظر پڑتے ہی میرے حکم کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔

"تمہاری یہاں آمد کی اطلاع کس کس کو ہے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کک۔۔۔ بہت سے لوگوں کو!" وہ اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر بولا۔

اس کی چالاکی پر میں زہریلے انداز میں ہنس دیا۔ وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ کر دانستہ جھوٹ بول رہا تھا تاکہ مجھے کسی انتہائی اقدام سے روک سکے!

"یہ تنظیم کی بدنصیبی تھی امیر خان کہ تجھ جیسا اس میں شامل کیا گیا!" میں ریوالور کی نال اٹھاتے ہوئے بولا۔ "پہلے وجے تمہارا سربراہ تھا اور وہ اپنے آقا نرائن داس کے ہاتھوں مارا گیا اور نرائن داس میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ تمہارا خیال درست تھا دوست کہ نرائن داس کا قتل اور میری روپوشی محض اتفاقات نہیں تھے۔۔۔ اور آج تم کو انند بھون سے واپسی کا حکم دینے والا بھی میں خود تھا کیونکہ تنظیم یتیم ہو چکی ہے۔ اب کوئی کسی کو ہدایات نہ دے گا۔"

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔ تت۔۔۔ تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟" امیر خان کی آنکھوں کی پتلیاں دہشت کے باعث پھیل چکی تھیں اور وہ زمین پر پڑا میرے ریوالور کو گھورے جا رہا تھا۔

"اس لئے کہ تمہاری روح سکون کے ساتھ پرواز کر سکے میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد تمہاری روح بھی خلش کا شکار رہے۔ شاید تم زندہ رہتے مگر مجھ سے ٹکرا کر تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے اور میں یہ دعوت قبول کرتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ صفدر! میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم مجھے اپنا غلام پاؤ گے۔ خدا کے لئے یہ ریوالور جیب میں رکھ لو۔"

"زخم خوردہ دشمن سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہوتا دوست۔" میں نے ریوالور کی نال کو جنبش دی۔ "مجھے بس ایک بات کا افسوس رہے گا، تمہاری بے گور و کفن لاش اسی عمارت میں سڑ جائے گی اور کسی کو علم نہ ہو سکے گا کہ تم کہاں گئے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر ریوالور سے نکلنے والے شعلے نے اسے مہلت نہ دی۔ گولی اس کی پسلیاں توڑ کر دل میں پیوست ہو گئی اور وہ آخری ہچکی لے کر ساکت ہو گیا۔ اس کے زخموں سے بہنے والا خون فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

میں بہت تیزی کے ساتھ زیرو پوائنٹ سے باہر آیا۔ دروازہ بند کر کے باہر سے مقفل کیا اور پھر امیر خان کی جیپ میں واپس روانہ ہو گیا۔

اس جیپ میں شہر جانا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ کوئی شناسا مجھے اس میں دیکھ لیتا تو امیر خان کی گمشدگی کے سلسلے میں سب سے زیادہ شبہات میری ذات پر ہی آتے لہٰذا شہری حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے

جیپ ایک ایسی جگہ چھوڑ دی جہاں اس کی موجودگی ہفتوں تک کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کراتی۔ زیرو پوائنٹ کی داہنی جانب میں نے پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے ایک گہری کھائی میں پھینک دی تھی۔

جیپ چھوڑنے کے بعد میں پیدل ہی رائل ہوٹل کی طرف ہولیا۔

رائل ہوٹل کے باہر ایک پولیس کار موجود پاکر میرا دل تیزی سے دھڑکا مگر میں نے خود کو دلاسا دیا کہ میری کسی بھی مجرمانہ کارگزاری کی بھنک ابھی تک پولیس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی لہٰذا یہ چھاپہ کسی اور سلسلے میں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے بہتر سمجھا کہ اندر جانے سے پیشتر اپنی جیب کو اُن دو اس سے چھینے ہوئے بے آواز ریوالور کے بوجھ سے آزاد کر دوں کیونکہ ایسی چیزیں قانون کے محافظوں کی نظروں سے ذرا مشکل ہی سے بچتی ہیں۔ اگر کسی کو مجھ پر شبہ ہو جاتا تو جامہ تلاشی کے بعد میں بھانڈا پھوٹ جاتا کیونکہ میرے پاس آتشیں اسلحے کی موجودگی کا کوئی معقول جواز نہ ہوتا۔

میں نے ہوٹل سے ذرا دور وہ دونوں ریوالور ایک گٹر میں پھینک دیا اور خود ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر ریپن ہال کے سب سے بڑے کاؤنٹر کے گرد بیٹھے ہوئے باوردی پولیس افسران پر پڑی۔ ہوٹل کا عمر رسیدہ منیجر بھی ان کے ساتھ موجود تھا اور وہ سب کسی مشروب سے شغل کر رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی منیجر نے آہستہ سے پولیس افسران سے کچھ کہا اور وہ چونک کر اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ ان کی چھبتی ہوئی نگاہیں واضح طور پر مجھ پر مرکوز تھیں۔ انسپکٹر کے عہدے کا ایک افسر اپنی پیٹی سے ریوالور بھی نکال چکا تھا۔ اس کے تیوروں سے صاف ظاہر تھا کہ میرے کسی ناپسندیدہ ردِعمل کی صورت میں وہ بلا سوچے سمجھے اسے استعمال کر گزرے گا۔

ان غیر متوقع حالات میں مجھ پر پریشانی کا طاری ہونا قطعی فطری امر تھا کیونکہ یہ میرے لئے نہ جانے مانوس نہ پہلے رفتن و اس معاملے میں بچنا تھا۔ واپس مڑتا تو غیر ضروری دھاچوکڑی ہوتی اور بالآخر وہ مجھے زیر کر لیتے۔ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے چہرہ پر بحالی کے آثار قائم رکھنے کی کوشش کی اور کاؤنٹر کی طرف بڑھتا رہا۔ ساتھ ہی مجھے لونا کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ اگر پولیس میری تلاش میں تھی تو اس نے یقینی طور پر لونا کو بھی پریشان کیا ہوگا۔

"صفدر علی؟" میرے قریب پہنچ کر انسپکٹر نے تائید طلب لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

میں نے حیرت کے ساتھ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"تم اس وقت حراست میں ہو!" اس نے یک لخت اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا اور دو سپاہی پھرتی کے ساتھ میرے عقب میں پہنچ گئے۔

"اگر مجھے واسطے کی نوعیت کا ذرا بھی علم ہوتا جناب تو میں کبھی ان لوگوں کو ہوٹل میں نہ گھسنے دیتا" بوڑھا منیجر روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اب اخبار اس قصے کی سرخیاں لگائیں گے میرے ہوٹل کا نام اچھالا جائے گا اور شرفا ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیں گے!"

انسپکٹر نے پلٹ کر اسے گھورا اور وہ بوکھلا کر خاموش ہو گیا۔

"مجھے کس جرم میں حراست میں لیا جا رہا ہے انسپکٹر؟" میں نے سنبھل کر سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بھی مجھ ہی کو بتانا پڑے گا؟" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "تو سنو کر تمہیں ایک عیسائی لڑکی لونا مارٹن کو اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"لونا مارٹن!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "وہ میری قانونی بیوی ہے انسپکٹر۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ اب لونا صفدر بن چکی ہے؟"

"تمہارے کہنے سے حقائق نہیں بدل سکتے مسٹر صفدر!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اگر ہم بروقت کارروائی کر کے لڑکی کو برآمد نہ کرتے تو شہر میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس علاقے کی مسلمان اور عیسائی آبادی میں پہلے ہی سخت کشیدگی پھیلی ہوئی ہے!"

"لونا کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں انسپکٹر!"

"وہ اپنے باپ کے حوالے کی جا چکی ہے۔ آج رات تو بچا۔ تم نے اسے عیسائی نوجوانوں کے ساتھ کوتوالی کا گھیراؤ کر لیا تھا اسے کسی طرح اطلاع مل گئی تھی لڑکی اس ہوٹل میں مقیم ہے لہٰذا ہم نے اس کی رپورٹ پر فوری کارروائی کی اور لونا کو یہاں سے برآمد کر لیا۔ اور اب تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں ہوٹل کے منیجر اور چند ملازمین کی موجودگی میں تمہارا ابتدائی بیان قلمبند کروں گا۔"

یہ سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ لونا مارٹن یوں مجھ سے چھین لی جائے گی۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ شہر کی فضا کو تکدر سے بچانے کے لئے پولیس نے اسے زبردستی مارٹن کے حوالے کیا ہوگا لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ ہماری اس رازدارانہ شادی کی خبر اس بوڑھے کو کیسے ملی جو مدتوں سے بستر پر معذور پڑا تھا!

جو کچھ بھی تھا غنیمت یہی تھا کہ ابھی تک پولیس والوں کا رویہ میرے ساتھ بہت معقول تھا اور میں ان سے غیر ضروری طور پر الجھ کر اپنے لئے دشواریاں پیدا کرنی نہیں چاہتا تھا لہٰذا بغیر چون و چرا کئے وہیں ایک کرسی پر گر گیا۔

پولیس کی اس جماعت میں ہندوستانی نقشوں کی روایتی وضع قطع والا ایک نیپالی محرر بھی شامل تھا وہ انسپکٹر کی زبان سے بیان کا لفظ سنتے ہی تک پر عینک اور داہنی ران پر فائل جما کر ہمہ تن گوش بن چکا تھا۔

"تمہارا پورا نام اور مستقل پتہ؟" انسپکٹر نے استفسار کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"صفدر علی۔ منیجر برونز آرٹ فیکٹری!"

برونز آرٹ فیکٹری کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑا۔ "تت... تو وہاں منیجر ہو؟"

اس کی بوکھلاہٹ میرے لئے قدرے امید افزا نظر آئی۔ شاید فیکٹری کے بارسوخ مالکان ہی کی وجہ سے میرے ساتھ کچھ رعایت کی جاتی۔ میں نے لہجے میں بحالی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اور میری مستقل رہائش فیکٹری سے ملحق بنگلے میں ہے!"

"لونا کا باپ شاید اس بات سے واقف تھا کہ اس کی سوتیلی لڑکی اپنے باس پر فریفتہ ہے!" وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا پھر بلند آواز میں سوال کیا۔ "تم کتنے عرصے سے وہاں ملازم ہو؟"

"کئی ماہ سے!" میں نے سرسری جواب دیتے ہوئے جلدی سے بات آگے بڑھا دی۔ "لونا آج صبح تک اس فیکٹری میں میری سکریٹری تھی۔ وہ بہت ہی سادہ دل اور مظلوم لڑکی ہے! اس نے بہت جلد میرے دل میں اپنا مقام پیدا کر لیا پھر آج صبح اس نے میرے ایما پر فیکٹری سے استعفیٰ دے دیا۔ آج شام ہم دونوں نے اسلامک مشن میں شادی کی۔ اس سے قبل وہ برضا و رغبت مسلمان ہوئی۔ ہم شب عروسی منانے کے لئے پارک ہوٹل میں ٹھہرے تھے!"

"تمہارے پاس اس شادی کا کیا ثبوت ہے؟"

"نکاح نامہ اور دوسری دستاویزات اوپر میرے کمرے میں موجود ہیں!" میں نے پُرسکون لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

"فی الحال تمہارا کمرہ سیل کیا جا چکا ہے تاکہ ضروری شہادتیں محفوظ رہ سکیں۔ اب تم عدالت میں جانے سے قبل ذمہ دار افسران کی موجودگی میں ایک بار یہاں آ سکو گے!"

"جناب!" اچانک بوڑھا منیجر تھکی ہوئی آواز میں کراہا۔ "اگر میرا ہوٹل اس شرمناک واقعے کے ذیلی اثرات سے محفوظ رہ سکے تو یہ میری ذات پر بڑا کرم ہوگا۔ میں اسی وقت کمرے سے ان صاحب کا سامان نکلوا کر اپنی گاڑی میں کوتوالی پہنچائے دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ سورج کی روشنی میں چند باوردی سرکاری اہلکار میرے ہوٹل کے ایک کمرے کی نگرانی پر مامور رہیں۔ اس طرح دوسرے مکینوں میں غیر ضروری ہراس پیدا ہوگا اور....!"

"اور وہ تمہارا قیام خانہ چھوڑ جائیں گے!" انسپکٹر نے بے رحمانہ نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"جی!.... جی.... بالکل یہی بات ہے جناب!" بوڑھے نے اس کی تلخی کا اثر لئے بغیر خوشامدانہ انداز میں دانت نکال دیئے۔

اسی وقت انسپکٹر کے کسی ماتحت نے پشت سے منیجر کا بازو تھاما اور نرمی کے ساتھ اسے ہوٹل کے ایک دور افتادہ حصے میں لے گیا جہاں سے ان کی آوازیں ہم تک نہیں آ رہی تھیں۔

میرے بیان کی تکمیل کے دوران ہی وہ دونوں واپس آ گئے اور جب میں محرر کے لکھے ہوئے بیان کی نقول پر دستخط کر رہا تھا تو انسپکٹر اپنے آدمیوں کو ہوٹل کے کمرے سے میرا سارا سامان کوتوالی لے جانے کی ہدایات دے رہا تھا۔

دنیا کے ہر خطے کی طرح وہاں کی پولیس میں بھی راشی عناصر کی موجودگی بدلے ہوئے حالات سے عیاں تھی مگر مجھے امید نہ تھی کہ انسپکٹر میری کسی پیشکش کو قبول کرے گا کیونکہ یہ سارا معاملہ مجھے اس کی بساط سے اونچا نظر آ رہا تھا۔ میرے تمام تر احتجاج کے باوجود انسپکٹر مجھے حراست میں کوتوالی لے جانے پر مصر رہا۔ اب اس بات سے کوئی بحث نہ تھی کہ اس کے اس اقدام سے میری نام نہاد معزز حیثیت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ جب میں نے تنگ آ کر اسے ہتک وغیرہ کے الفاظ کا مطلب سمجھانا چاہا تو وہ ایک بیک چھت اڑا گیا۔ عزت دار لوگوں کے بارے میں چند گستاخانہ بکواس الفاظ ادا کئے اور میری پسلیوں میں ریوالور کے دستے سے ٹھوکر مار کر تیزی کے ساتھ کلاسی کے راستے کی جانب دھکیلتے ہوئے...

آدھی رات گئے شہر خوابناک سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوتوالی کی قدیم وضع کی عمارت کے باہر برقان زدہ روشنیاں لڑکھڑا رہی تھیں۔ کوتوالی کے قرب و جوار میں شام کے ہنگامے کے کچھ آثار اب بھی موجود تھے۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے جو شاید لونا کی بازیابی کا مطالبہ کرنے والوں نے کوتوالی پر برسائے تھے۔ ساتھ ہی خچروں پر سوار بندوق بردار مسلح سپاہی نپی تلی سست رفتار سے علاقے میں گشت کر رہے تھے!

عمارت میں جلد ہی میرا سامنا کوتوالی انچارج سے ہو گیا۔ میں نے اسے اور اس نے مجھے دیکھا اور نظروں کی سرد جنگ چھڑ گئی۔ اس کی نگاہوں میں تلخی اور نفرت کی آگ سلگ اٹھی تھی اور میرا دل بے اختیار.... ڈوبنے لگا کیونکہ وہ میرے لئے اجنبی تھا نہ میں اس کے لئے نیا تھا۔ حالات قدرے مختلف تھے۔ گو وہ اس بار بھی حاکم تھا اور میں اس بار بھی مجرم!

وہ نیپالی پولیس فورس کا افسر کرن سنگھ تھا جو نیپالی سرحدی چوکی پر اپنی اسٹیشن ویگن کے ذریعے چرس کی اسمگلنگ کے الزام میں میری اور سنجیدہ ٹام جوزف کی گرفتاری کے بعد ہمیں لے کر سمرا کی آبادی میں پہنچا تھا وہاں ہماری لاعلمی میں زیر زمین تنظیم کے کسی رکن نے ہماری ضمانت کا بندوبست کر لیا تھا اس خبر سے کرن سنگھ کو اس قدر مایوسی ہوئی کہ ذرا سی بات پر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا اور مار مار کر میرا چہرہ لہولہان کر دیا تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ اس وقت بھی میں بغیر داڑھی کے گرفتار ہوا تھا اور اب بھی اسی حلیہ میں تھا جس صورت میں بالآخر دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی کیسے رہ سکتے تھے!

کرن سنگھ کی وردی پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ وردی سمیت بستر پر پہلو بدلتا رہا ہو۔ اور اس کے چہرے پر بھی تقریباً اسی قدر شکنیں موجود تھیں وہ ررتوں نگ تھے پچکوں کی بلیٹ میں ڈالے ہونٹ بھینچے مجھے گھورتا رہا۔

"کیا آپ مجھ کو پہچانتے ہیں کرن سنگھ جی!" مجھے لانے والے انسپکٹر نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد حیرت سے پوچھا۔

"اں.... یہ نب ہمکا استوانا آیا ہے!" وہ اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے ہنکارا۔ "کئی مہینے پہلے میں سرحدی چوکی پر اپنے دستے کے ساتھ کسٹم والوں

کی مدد کے لیے تعینات تھا تو یہ سالا ایک چوہے بیتوں والا شیشن ویگن میں جعلی کاغذات پر بیرگنج سے رکسول ہوتا ہوا نیپال میں گھسا تھا گر سالے کی چالبازی دھری کی دھری رہ گئی۔ گاڑی کے ساتھ سے ٹائروں میں چرس کے تھیلے چھپے ہوئے تھے اور یہ کسی موہن لال کے پرانے پاسپورٹ پر اپنی تصویر لگا کر آیا تھا۔ میں نے اسے اور اس کے گورے ساتھی کو لیکر سرائے کے تھانے میں پہنچا تو وہاں ان دونوں کی پہلے ہی ضمانت ہو چکی تھی۔ کئی روز بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس مقدمے میں یہ اب بھی مطلوب ہو گا۔"

"مگر یہ تو کہتا ہے کہ برونز ہٹ فیکٹری کا منیجر ہوں!" وہ وحشت نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے سنز ہریلے لہجے میں بولا۔

کرن سنگھ نے اپنی روایتی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند ناقابلِ عمل گرہی گالیاں بلند آواز میں تصنیف کیں اور لاپروایانہ شان سے بولا۔ "اب دیکھتا ہوں اسے میرے چنگل سے کون مائی کا لال نکالتا ہے۔ لڑکی اپنے ورثا کرو واپس چلی گئی ہے۔ اسے حوالات میں ڈال دو۔ صبح دیکھیں گے کہ یہ کہاں کا منیجر ہے!" یہ کہہ کر وہ پرشور آواز میں ہنس پڑا۔ وہاں موجود انسپکٹر اور سپاہیوں نے بھی خوشامدانہ انداز میں بھونڈے مضحکہ خیز قہقہے کا ساتھ دیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مقدر کے بے رحم ہاتھوں نے میرے گرد عذاب کا جال بُن دیا ہے۔ میں ایک چکر سے نکلنے نہ پاتا تھا کہ کوئی دوسری دشواری سامنے آجاتی۔ میں نے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور گٹر میں پھینک کر لاشعوری طور پر خود کو ایک بڑے خطرے سے بچایا تھا لیکن اس موڑ پر کرن سنگھ سامنے آگیا اور میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس بار جیل کی مشقت آمیز زندگی ایک بار پھر میرا مقدر بنتی نظر آرہی تھی۔ پُٹنہ جیل کی یادیں ابھی تازہ ہی تھیں کہ یہ نئی صورتِ حال سامنے آگئی۔

"چل بے... سنا نہیں تو نے!" ایک سپاہی نے میری کمر پر ڈنڈا مار کر تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

میں پھر کرسی کی طرف پلٹا اور تھیم میں شانہ پر انسپکٹر کا گھونسہ پڑا۔

"چوری اور سینہ زوری کرتا ہے۔ اگر اب کسی پر غرایا تو زخرا پھاڑ ڈالوں گا۔"

میں دل ہی دل میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

کوتوالی کی تیرہ و تاریک حوالات اور وہاں گزری ہوئی وہ رات میں زندگی بھر کبھی نہ بھول سکوں گا۔ وہ گھوڑوں کے اصطبل کی طرح نیچی چھت والا ایک کافی لمبا مستطیل ہال تھا جس میں چھ چھ فٹ کے فاصلے پر فرش سے چوبی چھت تک مضبوط آہنی سلاخیں اس طرح کھڑی کی گئی تھیں کہ وہ ہال آٹھ حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ صرف دونوں سروں پر واقع کوٹھڑیوں میں دو جانب پختہ دیواریں تھیں ورنہ تمام درمیانی حصوں میں صرف عقب میں دیوار تھی باقی ہر طرف آہنی جنگلے لگے ہوئے تھے۔ داخلے کے لیے بھی سلاخ دار دروازہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

ان تمام ہی کوٹھڑیوں میں اس وقت گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ فضا میں ناقابلِ برداشت بدبو بسی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں پہنچانے والے سپاہیوں کے قدموں کی چاپ پر کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی پھر چند ثانیوں کے لیے جلنے والی ٹارچ کی روشنی میں، میں نے کہیں کہیں انسانی جسم گٹھڑیوں کی صورت میں فرش پر پڑے ہوئے دیکھے جب وہ سنتری دروازہ مقفل کر کے لوٹ گئے تو میں نے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر اس کال کوٹھری کا جائزہ لیا۔ اس کا فرش نہ صرف کچا بلکہ نمناک بھی تھا۔ ایک طرف بچھے ہوئے تعفن زدہ کمبل کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جو سردی کا احساس مٹانے کے لیے قطعاً ناکافی تھے۔ فضا میں بے شمار مچھروں کا گرنجیلا آہنگ بھی تسلسل کے ساتھ گونج رہا تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ مقدر کی ستم ظریفیوں پر بے اختیار میرا دل بھر آیا تھا۔

گلنار — جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا۔ وہ حالات کے تیز و تند دھارے کے سامنے اپنا وہ بہروپ قائم نہ رکھ سکی جس پر میں فریفتہ تھا۔ میں نے اسے معصوم دوشیزہ سمجھ کر چاہا مگر آخر کار وہ مجھے بالاخانے کی جنس نظر آئی اور لاہور کے بازارِ حسن میں میرے ہاتھ اس کے لہو سے آلودہ ہو گئے۔

اور اب — میں نے لزا کو چاہا۔ دل کے بجائے میں نے عقل سے فیصلہ کیا کہ وہ میری زندگی کے خزاں آلود گوشوں کو گل رنگ بنائے گی۔ اور جب میں اپنی راہ کا آخری پتھر ہٹا کر زیر دلپوائنٹ سے اپنی شبِ عروسی اور رائل ہوٹل کی رومان پرور خواب گاہ کا تصور ذہن میں سجائے واپس لوٹا تو تقدیر میرے منصوبوں پر خندہ زن تھی۔ میں وہ دلت سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ لزا کی آغوش اور سپھولوں کی سیج میں گزارنے کے بجائے اس متعفن کوٹھری میں بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ انسان حالات کے سامنے کس قدر بے بس ہو جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے خوب ہو رہا تھا۔

میں نہ جانے کتنی دیر انہی خیالات میں کھویا رہا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر فرش سے اٹھ گیا۔

اسی وقت برابر والی کوٹھری سے کسی کی نرم اور دھیمی آواز ابھری۔ "کیا اِدھر کوئی ہے؟" زبان انگریزی اور لہجہ مایوسانہ تھا۔

"ہاں — ایک بدنصیب تمہاری رات کا ہمنشین ہے!" میں افسردہ لہجے میں یہ کہہ کر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آواز والی سمت میں بڑھا۔

"تمہارے پاس سگریٹ ہے؟"

اس آواز نے میری رہنمائی کی اور میں اس کے قریب جا پہنچا ہمارے درمیان آہنی سلاخیں حائل تھیں جن کے درمیان سے ہاتھ بآسانی دوسری طرف گزر سکتا تھا۔

"سگریٹ ضرور ہے مگر ماچس چھین لی گئی ہے کہ کہیں میں بزدلی

کے عالم میں یہاں آگ نہ لگا دوں!" میں نے سلاخوں کے اس پار اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

آواز کے لوچ نے مجھے جو تاثر دیا وہ درست ہی نکلا۔ اس کا بدن سبک مگر گداز تھا۔ کھلے ہوئے لمبے بال شانوں سے نیچے تک لہرا رہے تھے۔

اس نے اپنے شانوں پر میرا ہاتھ محسوس کر کے کوئی تعرض نہ کیا تو میں نے آہستگی سے اس کا بازو دبایا اور تقریباً سرگوشیانہ آواز میں کہا۔ "تم یہاں کس جرم کی پاداش میں موجود ہو؟"

"جنس!" آواز نرم اور شرم سے عاری تھی۔ "مشرق میں سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ یہ لوگ جنس کو شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ مجھے پولیس نے ایک مصنوعی گاہک کے ذریعے پھانسا ہے!"

"اوہ!" اس کے نادر خیالات امید افزا تھے۔ میرا دایاں ہاتھ اس کے نرم نرم رخسار پر رینگ گیا۔ "جو خود جنس کی لذتوں سے ترسا ہوا ہو وہ ان آزادیوں کا مفہوم کیا سمجھ سکتا!"

"کیا تم بھی غیر ملکی ہی ہو؟"

"نہیں میں مقامی ہوں۔"

"دوسری طرف بھی مقامی مجرم ہیں مگر وہ تو انگریزی سے نابلد ہیں۔"

"کم نصیب ہیں وہ۔" میں نے آواز دھیمی ہی رکھی مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں دوسرے حوالاتی بیدار ہو کر ہماری تنہائی میں مخل نہ ہوں۔ "اگر وہ انگریزی سے آشنا ہوتے تو شاید تمہاری دلچسپی میری طرف مبذول نہ ہوتی۔"

حوالات کی بوجھل فضا میں مچھروں کی بھنبھناہٹ پر حاوی ہلکی سی نقرئی ہنسی گونجی اور میں نے اس کا چہرہ دونوں ہتھیلیوں میں لے کر سلاخوں کے قریب کیا۔ اور میرے پُرجوش بوسے کی حرارت فضا میں مہکار بن کر پھیل گئی۔

"اپنا بستر ادھر ہی لے آؤ۔ میری نیند پوری ہو چکی ہے۔ باتیں کر کے ہم باقی ماندہ رات آرام سے بسر کر سکیں گے!" اس نے تجویز پیش کی۔

"بستر!" میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "وہ غلیظ چیتھڑوں کا ایک انبار ہے۔ شاید تمہارے حسن سے مرعوب ہو کر انہوں نے تمہیں بہتر بستر دے دیا ہو!"

"جس جرم کی محض نیت کرنے پر مجھے گرفتار کیا گیا ہے وہی جرم کرنے پر مجھے دو بار مجبور کیا جا چکا ہے مگر یہاں کا انچارج بہت ہی خود غرض شخص ہے جو مجھے ذرا بھی رعایت دینے کو تیار نہیں ہے!"

میں وہیں سلاخوں سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی اپنا ہلکا بستر اسی طرف سرکا لیا۔ ان مایوس کن حالات میں اسے قریب پا کر یک بیک میرا دورانِ خون تیز ہو گیا تھا۔ کنپٹیوں میں ہتھوڑے سے چلنے لگے تھے۔ اور درمیانی سلاخیں اب مجھے ناقابلِ برداشت نظر آ رہی تھیں۔

"تم کس ملک سے تعلق رکھتی ہو؟" میں نے بھاری اور محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میں سوئیڈن سے آیا ہوں!" جواب ملا۔

"آیا ہوں!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "یعنی یعنی ......!"

"ہاں ہاں — میں لڑکا ہی ہوں۔ ایلین یک مارشل کہتے ہیں مجھے!" وہ قدرے ناگواری کے ساتھ بولا۔

میرا دورانِ خون یک بیک سست ہو گیا۔ ذہن اور کنپٹیوں پر برف جمنے لگی اور منہ کا ذائقہ اچانک ہی تلخ ہو گیا اور میں غصے سے تقریباً ہکلاتے ہوئے غرایا۔ "تم۔ تم — سن آف اے بچ، مجھ سے عشق لڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"کیا تم کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو؟" اس نے طنزیہ آواز میں پوچھا میرے منہ سے اردو اور انگریزی کی ملی جلی گالیوں کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ غصے کے باعث مجھ پر واقعی دیوانگی طاری ہو گئی اور میں پوری قوت سے چیخنے لگا۔

اسی وقت باہر سے سنتریوں کی گھبرائی ہوئی خوابناک آوازیں اور بھاری جوتوں کی تیز دھمک سنائی دی اور دو مسلح سپاہی ٹارچیں چمکاتے ادھر آپہنچے۔

ان کی تیز ٹارچوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ میرا پڑوسی چودہ پندرہ برس کا منحنی سا پستہ قامت سفید فام لڑکا ہی ہے ابھی اس کی مسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں مگر سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوتے تھے وہ نفرت بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

ایلین یک مارشل کو تاریکی کے باعث میں لڑکی سمجھ بیٹھا تو اس میں فی الحقیقت اس بے چارے کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ اپنے ملک کے بگڑے ہوئے معاشرے کا شکار ہو کر سلسلۂ جنسی اقدار سے منحرف ہو گیا تھا اور اس کے نزدیک کسی آبرو باختہ لڑکی کی طرح اسے بھی مناسب معاوضہ دے کر جنسی تلذذ کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا اور وہ میری گرمجوشی سے یہی سمجھا ہو گا کہ کوتوالی کے منچلے کرن سنگھ کی طرح میں بھی اس پر ڈورے ڈال رہا ہوں۔ اتفاق یہ تھی کہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی اور اس بے ہودہ زبان میں متکلم اور مخاطب کے سارے صیغے ایسے ہیں جن سے جنس کا سراغ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے اور میں گھپ تاریکی کے باعث ان انگریزی صیغوں کا شکار ہو کر اسے لڑکی سمجھ بیٹھا اور جوں ہی اسے میری غلط فہمی کا علم ہوا اس نے بات صاف کر دی۔ مگر اس وقت تو غصے اور جھلاہٹ کے باعث میری عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ میں پوری قوت سے چیخ چیخ کر اسے بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ میری چیخ پکار پر حوالات میں سوئے ہوئے سب قیدی بیدار ہو گئے تھے۔ اور ایک دوسرے سے صورتِ حال دریافت کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ سنتریوں کی آمد اور ڈانٹ بھی مجھ پر بے اثر رہی بلکہ میں آہنی

سلاخوں سے ہاتھ نکال کر ایلین بک ہارٹ پر جھپٹا تو اس کی ساڑی بری طرح تار تار ہو گئی۔ اور وہ خوف زدہ انداز میں محفوظ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ جسمانی تشدد سے محفوظ رہ سکے۔

"یہ سالا انگریزی میں کیا بکواس کر رہا ہے؟" ایک سنتری نے بے زاری کے عالم میں اپنے نیم خواندہ ساتھی سے پوچھا۔ لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ ان دونوں نے بیک وقت مجھ پر سنگینیں تان لیں۔ اگر جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو ان میں سے ایک نے دروازے کی سلاخوں میں سے رائفل کا کندہ میری پنڈلی پر مارا۔ میں نے اشتعال کے عالم میں تڑپ کر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔

بندوق ہاتھ سے نکلتے ہی وہ دونوں حواس باختہ ہو گئے۔ اور ایلین بک ہارٹ بھی گھگھیاتی آواز میں ڈرکے مارے چیختا ہوا ایک کونے میں جا گھسا۔ میں نے بندوق کی نالی اٹھا کر سنتریوں کو للکارا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ جان سے مار دوں گا۔ میں تم سب سے نشانہ خوب جانتا ہوں۔"

وہ دونوں تو وہاں سے سرپٹ ہو لیے اور میں نے بندوق ایلین کی طرف سیدھی کر لی مگر ایلین کہاں۔ سنتریوں کے جاتے ہی وہاں اندھیرا چھا گیا تھا اور وہ نہ جانے کس گوشے میں جا دبکا تھا۔

اسی وقت اندھیرے میں ایلین کے گھگھیا کر رونے کی آواز آئی وہ بین کرنے ہوئے مجھ سے جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔

ان بدلودار کوٹھڑیوں میں اس کے رونے سے صورت حال کچھ ایسی گھمبیر ہو گئی تھی کہ میرا غصہ سرد پڑنے لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب بندوق چھینے پر مجھے کرن سنگھ کی کڑی سزاؤں کا نشانہ بننا پڑے گا لہٰذا میں نے اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے کے لیے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بندوق دروازے کی سلاخوں میں سے راہداری میں ڈال دی۔

ایلین ابھی تک مسلسل روئے جا رہا تھا میں نے اسے ڈانٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ میں بندوق باہر ڈال چکا ہوں۔ لہٰذا میری پھٹکار سنتے ہی وہ یکلخت خاموش ہو گیا اور وہاں اندھیرے میں ایک بار پھر صرف جھینگروں کا شور باقی رہ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں راہداری میں روشنی آتی نظر آئی ساتھ ہی بہت سے بھاری قدموں کی دھمک بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور کرن سنگھ اونچی آواز میں حوالاتیوں کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالتا سنائی دے رہا تھا۔

پھر شاید آنے والوں کو راہداری میں پڑی بندوق بھی نظر آ گئی اور کرن سنگھ کی غصیلی آواز گونجی۔ "یہ کیوں بے ماں کے خصم۔ تیری بندوق تو وہ پڑی ہے کیا نیند میں حوالاتی کا شور سن کر ڈر گیا تھا جو بندوق یہاں چھوڑ بھاگا اور کوتوالی میں آ کر دھم مچا دیا کہ ایک حوالاتی نے تیری بندوق چھین لی ہے۔ اٹھا سالے جا کر وہ بندوق!"

وہ بری طرح بھاگتا ہوا آیا جیسے اسے شبہ ہو کہ ذرا بھی تاخیر ہوئی تو کرکی اور بندوں نے جانے کے بعد... ادھر بہ اختیار کرن سنگھ سلیپنگ سوٹ پہنے دس بارہ مسلح سپاہیوں کے ساتھ آ پہنچا اس کا ریوالور ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ شاید بوکھلاہٹ میں وہ گشت کرنے والوں کو بھی ساتھ ہی لیتا آیا تھا کیونکہ غیر معمولی سنتریوں کی وردیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ "کیوں بے۔ کیوں اودھم مچا رہا تھا؟" کرن سنگھ میری کوٹھڑی کے سامنے رک کر سرد اور غصیلی آواز میں بولا۔

"یہ بار بار مجھے چرس کے لیے تنگ کر رہا تھا میرے لیے پینے کا مشکل ہو گیا تھا۔" میں نے ایلین بک ہارٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خوب!" کرن سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے ایلین کو گھورا اور طنزیہ لہجے میں اپنے ماتحتوں سے بولا۔ "نکالو اس مردود کو باہر، میں ابھی کرتا ہوں اس کی چرس کا بندوبست!"

کرن سنگھ کی آنکھوں میں یکبارگی پیدا ہونے والی چمک سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرا اودھم بھول چکا ہے اس کی تمام تر توجہ اب ایلین پر مرکوز تھی۔

وہ ساری بھیڑ ایلین سمیت وہاں سے رخصت ہو گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اگلی صبح خلاف توقع مجھ سے سرسری باز پرس کی گئی۔ میں نے کرن سنگھ کو بتایا کہ سمرا میں پولیس سے ضمانت پر نجات دلانے والے لوگ میرے لیے اجنبی تھے رہائی کے بعد ان میں سے ایک نے مجھے اطمینان دلایا کہ میرا مقدمہ ختم کر دیا جائے گا اور میں جلد از جلد کسی طرف نکل جاؤں۔ اپنے ضامن کے اس دعوے اور مشورے پر شبہ کرنے کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی وہ لوگ بارسوخ اور معتبر تھے جبکہ میں بے سہارا اور اجنبی تھا لہٰذا میں پہلی فرصت میں وہاں سے نکل بھاگا۔ پھر کھٹمنڈو میں قسمت نے میری یاوری کی اور محض تعلیم کی بنا پر مجھے برونز آرٹ فیکٹری میں منیجری کی جگہ مل گئی۔

"فیکٹری کے مالکان سے تمہارے کیسے مراسم ہیں؟" کرن نے اس مقام پر سوال کیا اور اسی نکتے سے میرے لیے پیچیدگیوں کی ابتدا ہو گئی۔

"انتہائی واجبی!" میں نے محتاط جواب دیا۔ "مجھے ملازم رکھنے والا شخص وجے کمار تھا مگر تقرر نامے پر سیٹھ نرائن داس کے دستخط تھے۔" یہ جھوٹ میں نے اس لیے بولا کہ وجے اب پولیس کے سامنے میری کسی بات کی تردید کرنے کے لیے زندہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک مجھے سیٹھ صاحب کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ ان کا ذہنی توازن خراب ہے اور ان کی جانب سے وجے کمار ہی تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے!"

"فیکٹری کے معاملات میں تمہیں ہدایات کہاں سے ملتی ہیں؟"

"دوسرے تمام امور میں مجھے مکمل اختیارات حاصل تھے صرف مالی مسائل پر مجھے وجے سے ہدایات لینی پڑتی تھیں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ کل رات وجے ایک حادثے میں مر گیا اور نرائن داس نے خودکشی کر لی۔"

...صبح میرے نام سے یہ اطلاعات ملی تھیں!"

اسی روز گیارہ بجے کے قریب مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا لونا بھی عدالت میں موجود تھی۔ احاطے میں اس کا باپ بہت سے مقامی عیسائیوں سمیت موجود تھا۔

لونا کی آنکھیں سرخ اور ورم آلود تھیں جیسے وہ ساری رات روتی رہی ہو۔ وہ کمرۂ عدالت میں سب سے اگلی قطار میں موجود تھی۔

میرے خلاف عائد کی جانے والی فرد جرم میں چار الزام تھے اول نیپال کی سرحد میں غیر قانونی طور پر منشیات کی اسمگلنگ، دوئم جعلی کاغذات پر سرحد عبور کرنے کی کوشش۔ سوئم ضمانت کے بعد پولیس سے روپوشی اختیار کرنا۔ اور ایک مقامی عیسائی دوشیزہ کا اغوا۔

ابتدائی تین الزامات ٹھوس تھے اور میں ان کے بارے میں بس یہی کچھ کہہ سکا جو کرن سنگھ کو بتا چکا تھا۔ البتہ لونا کے معاملے میں اپنی بے گناہی پر میں نے چند الفاظ بیان صرف کر دیے۔ کٹہرے میں بیان دیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ابتدائی تین الزامات کے بارے میں میرا تقریباً اقبالی بیان سن کر لونا افسوس کے بجائے کچھ حیرت سی ہوئی شاید اسے توقع رہی ہو کہ میں استغاثہ کی مزاحمت کروں گا۔

عدالت میں لونا کا بیان سنسنی خیز ثابت ہوا۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اپنے معذور سوتیلے باپ کے گھناؤنے کردار سے پردہ اٹھایا تو وہ وہاں رکنے کی ہمت نہ کر سکا۔ لونا رائل ہوٹل سے پولیس کے دباؤ کے تحت روانہ ہوتے ہوئے نکاح کے کاغذات بھی ساتھ ہی لے گئی تھی۔ وہ کاغذات اس نے عدالت کے سامنے پیش کر دیے اور بتایا کہ اس کو کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ اس کا بدکردار باپ جھوٹ اور فریب کے سہارے اسے اپنے چنگل میں دبائے رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی مدد سے اپنی مالی ضروریات پوری کرتا رہے!

کافی سوچ بچار کے بعد قانونی نکتہ یہ اٹھا کہ ابتدائی تین الزامات کا تعلق ایک ایسے جرم سے ہے جو اس عدالت کے دائرۂ کار سے باہر واقع ہوا لہٰذا یہ مقدمہ سمرا کی عدالت میں منتقل کر دیا گیا اس مقدمے کی ابتدائی سماعت تک کے لیے مجھے پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اغوا کے مقدمے کا فیصلہ فی الفور صادر کر دیا گیا۔ مجھے باعزت بری کر دیا گیا اور لونا کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت دے دی گئی تھی عدالت برخواست ہونے پر کرن سنگھ نے مجھے لونا سے ملنے کی اجازت دے دی۔ میرے سامنے آتے ہی وہ بیچاری بلک کر رو پڑی۔ میں نے اسے کافی تسلی دی تو وہ اعتدال پر آئی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے ایک محلے دار نے اسے اور مجھے اسلامک مشن میں جاتے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ سمجھ گیا کہ لونا ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ جب شادی کی رسوم کے بعد ہم دونوں رائل ہوٹل گئے تو اس نے ہمارا تعاقب کیا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ محلے میں جا کر اس نے لونا کے باپ مارٹن کو سارا قصہ سنا دیا۔ اس پر وہاں بہت سوچ بچار ہوا، جوشیلے عیسائی نوجوانوں نے لونا کے اس اقدام کو شدید بے عزتی سمجھا اور وہ مارٹن کو لے کر کوتوالی جا پہنچے۔ انھوں نے وہاں لونا کی بازیابی کے مطالبے کے ساتھ ہی اشتعال انگیز نعرے بازی بھی کی اور لونا کو ساتھ لیے بغیر وہاں سے نہ ہٹے۔

اب لونا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ پناہ کا تھا۔ اس کے ہم مذہب تو اس کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ وہ شہر میں کہیں بھی تنہا رہنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اول تو اسے اپنی آبرو کی حفاظت کرنا محال ہوتا دوئم مارٹن کے شر پسند شوریدہ گیر اس سے انتقام لینے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے میرے جیل میں ہوتے ہوئے وہ بھرے شہر میں تنہا اور بے سہارا رہ جاتی!

"تم شہر کے کسی گمنام ہوٹل میں چند دن گزار لو لونا۔ پھر میں تم سے آملوں گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔۔۔ عدالت میں میرے بیان کے بعد وہ ہر قیمت پر مجھے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے کھٹمنڈو کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ وہ بہت جلد مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

واقعی یہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا اور جب بات یہاں تک آ گئی تو اب مجھے بھی خطرہ مول لینا ہی تھا۔ پورے شہر میں صرف گریسی ہی ایسا آدمی تھا جس پر اپنی بیوی کے معاملے میں میں بھروسا کر سکتا تھا۔ میں نے اسے گریسی کے بار کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔ "تم اس کے پاس چلی جاؤ اور اسے ساری صورت حال سمجھا دو اور اسے میرا پیغام دینا کہ میری واپسی تک وہ میرے دو آدمیوں گپتا اور بالی کو تمہاری حفاظت پر مامور کر دے۔ وہ دونوں اکثر گریسی کے پاس آتے رہتے ہیں اور تمہیں بہ آسانی مل جائیں گے۔"

"آپ نہیں جانتے۔۔۔ کچھ نہیں جانتے!" وہ بے بسی کے ساتھ رو پڑی۔ "یہ صرف میں ہی جانتی ہوں کہ ایک تنہا اور بے سہارا لڑکی کبھی کسی مرد کے لیے باعث احترام نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگ آپ کے سامنے جو بھی ہوں مگر جب انھیں یہ معلوم ہو گا کہ آپ حوالات میں ہیں تو ان کا رویہ میرے ساتھ ہمدردانہ نہیں ہو گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ میں۔۔۔ اپنوں میں لوٹ جاؤں اور ان کے فیصلے کے سامنے سر جھکا کر محرومی کی موت کو گلے سے لگا لوں!"

اسی وقت کرن سنگھ اپنے دوستوں سے گفتگو کر کے پلٹ آیا اور کرخت آواز میں بولا۔ "چل بے! اب اپنی جورو کا پیچھا چھوڑ دے گا یا مقدر کو روئے جائے گا۔"

لونا نے اس سے کچھ دیر کی مہلت اور مانگی مگر وہ طیش میں آ گیا اور مجھے اسی مرحلے پر لونا کو روتا چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑ گیا۔

لونا نے عدالت میں میرے خلاف عائد کیے جانے والے بقیہ تین جرائم کے بارے میں نہ مجھے لعن طعن کی نہ ہی اس موضوع کو چھیڑا۔ یہ بات اس کے کردار کی عظمت کی عکاس تھی میں جہاں تک اس کے مزاج کو سمجھ سکا اس کی بنا پر میرا خیال تھا کہ وہ مر کر بھی اپنوں میں واپس نہ جائے گی۔

حوالات کی کوٹھڑی تب ایک بار پھر میرا مقدر بن گئی۔ اس سے پہلے کرن سنگھ نے انسپکٹر سے جو گفتگو کی اس کی بنا پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جلد ہی مجھے سمرا بھجوانے کا بندوبست کرے گا۔

دن کی روشنی حوالات میں دھندلائی ہوئی سی تھی۔ ایلین بک

ہارٹ نے تلخ نظروں سے میرا خیر مقدم کیا۔ اور جب سنتری مجھے بند کر کے چلے گئے تو وہ عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"رات تم کو کیا ہو گیا تھا۔؟"

"پہلے تو میرا جی نہ چاہا کہ اس قابلِ نفرت چھوکرے سے گفتگو کروں۔ مگر پھر ذہنی پریشانیوں سے چند ثانیوں کے فرار کی خاطر اس کی طرف متوجہ ہو گیا" ہم ابھی ترقی کی اس منزل پر نہیں پہنچے جہاں ہم جنس پرستی کی کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔!"

"بکواس۔!" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "جانتے ہو پچھلی رات کا باقی حصہ میں نے کرن سنگھ کی خواب گاہ میں ایک قالین پر سو کر گزارا ہے۔!"

"استثنیٰ ہر جگہ ہوتا ہے۔ تمہارے ملک میں بھی ایک آدھ فی صد لوگ جنسِ مخالف کی طرف میلان رکھتے ہوں گے۔؟" میں نے اس پر گہرا طنز کیا۔

"ہمارے یہاں آبادی میں اضافہ کی شرح خاصی بلند ہے۔" وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ "دراصل ہم لوگ لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ اپنے فطری رجحانات کو معاشرتی رسوم کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھاتے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔!"

"میری دانست میں تو تمہیں اپنے ملک کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں۔ تم جیسے آوارہ منش ہی تو سرحدوں سے ماورا یا آفاقی ذہن کا تصور رکھتے ہیں۔"

"کرن سنگھ بالکل الو کا چرخا ہے۔" اس نے بات کا رخ پھر موڑ دیا۔

"اخلاقی جرأت سے یکسر عاری! جانتے ہو رات اس نے کیا کیا۔؟"

"کیا اب بھی کچھ بتانے کی ضرورت رہ گئی ہے!" میرا لہجہ تلخ تھا۔

"میرا معاملہ بالکل سیدھا ہے میں اپنا اقبالی بیان دے چکا ہوں۔ مگر وہ حوالات میں میرے قیام کو طول دینے کی نیت سے مجھے عدالت میں پیش نہیں کر رہا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہاں سے مجھے فی الفور سزا نہ بھی ہوئی تو پولیس لاک اپ کے بجائے مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رک کر سنسا پھر بولا: "کل رات مجھے یہاں سے لے جانے کے بعد اس نے بے رحمی کے ساتھ میرے منہ پر کئی تھپڑ مارے، پھر ہانپتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو کچھ حکم دیا اور انہوں نے میرے ہاتھ پیر باندھ کر کرن سنگھ کی خواب گاہ سے ملحق باتھ روم میں ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیا اور جب وہاں کوئی نہ رہا تو کرن سنگھ نے خود مجھے اس عذاب سے نجات دلائی!"

شام تک میں اس سے بحث مباحثے میں الجھا رہا کہ چھ بجے کے قریب ایک سپاہی میری کوٹھری پر آیا: "تیری عورت ملنے آئی ہے! انچارج صاحب اسے یہیں لا رہے ہیں۔!"

اس خبر نے یک بیک مجھے مضطرب کر دیا۔ نہ جانے وہ کس مجبوری کے تحت وہاں آ پہنچی تھی۔ چند ثانیوں کے بعد کرن سنگھ کے بجائے ایک سپاہی لونا کو لئے اس عفونت زدہ منحوس قید خانہ کی طرف آیا۔

"آپ ایسی جگہ سرتاج۔؟" اس کی آواز فرطِ غم سے رندھ گئی۔

"یہ مقدرات ہیں لونا!" میں سوگوار سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ثروت و اختیار کے دن نہ رہے تو مصائب کی یہ گھڑیاں بھی ٹل ہی جائیں گی۔ تم بتاؤ کیسے آئی ہو اور کہاں ٹھہری ہو؟"

"میں گریسی کے پاس گئی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "وہ خبیث یہودی بہت مکار ہے۔ پہلے تو آپ کا نام سن کر احترام سے پیش آیا۔ اور جوں ہی میں نے اسے بتایا کہ آپ کن دشواریوں سے دوچار ہیں تو اس نے یک بیک آنکھیں پھیر لیں اور بولا کہ وہ ایسے لوگوں سے اپنے سارے تعلقات کے بارے میں بھول جانے کا عادی ہے جو قانون کی گرفت میں آ چکے ہوں۔!"

"اس نے کہا!" میں نے توہین کے شدید احساس کے ساتھ غصے میں کہا۔ "غصہ بے سود ہے سرتاج۔ یہ میں نے صرف اس لئے بتایا کہ آپ لوگوں کے بارے میں اپنی رائے مفروضوں پر قائم نہ کریں۔۔۔ عدالت سے واپسی کے بعد میں آپ کی رہائی کی تدابیر ہی سوچتی رہی ہوں، اور شاید مجھے کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے!"

"کیسی کامیابی۔۔۔ کیا کوئی ضمانت پر تیار ہو گیا ہے۔؟" میں نے بمشکل اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔" وہ فخر کے ساتھ بولی: "مگر سارا انحصار آپ کے فیصلے پر ہے۔" وہ سرگوشیانہ آواز میں بولی۔ تاکہ قریب ہی کھڑا ہوا سپاہی کچھ نہ سن سکے۔!

"اس وقت اپنی رہائی کے سوا مجھے کسی بات کی فکر نہیں ہے لونا۔ میں جلد از جلد آزاد فضاؤں میں سانس لینا چاہتا ہوں!"

"میں نے آنند بھون فون کیا تھا اور نرائن داس کی جواں سال بیوہ سے بات کی تھی۔" وہ دبے دبے پُرجوش لہجے میں بولی: "مجھے آپ اشاروں کنایوں میں یہ تو بتا چکے تھے کہ بروزنا آرٹ فیکٹری کی آڑ میں کچھ غیر قانونی کام ہوتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ گرفتار کئے جا چکے ہیں اور اگر کل سورج طلوع ہونے سے قبل رہائی نصیب نہ ہوئی تو فیکٹری اور اس کے مالکان کو بھی قانون کے سامنے جوابدہی پر مجبور کر دیں گے۔!"

"پھر۔۔۔ پھر وہ کیا بولی۔؟" میں نے جوشیلی آواز میں پوچھا۔

"پہلے تو وہ برہم ہوئی اور یہ جاننا چاہا کہ میں کون ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں محض پیغام رساں ہوں۔ صفدر علی کا پیغام دے رہی ہوں اپنا بُرا بھلا دیکھ کر فیصلہ وہ خود کر سکتی ہے۔ اس پر وہ نرم پڑ گئی۔ اور کہا کہ وہ اپنے کسی آدمی کو تو ابھی بھیجے گی۔ میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی تاکہ آپ کی لاعلمی کے باعث منصوبہ ناکام نہ ہو سکے۔ آنند بھون کے مکین اگر چاہیں تو لوگوں کو تختۂ دار سے بھی اُتروا سکتے ہیں۔ آپ کیلئے یہ میری پہلی اور آخری کوشش ہے!"

"خدا اس منصوبے کو کامیاب کرے لونا!" فرطِ ممنونیت سے میری آواز بھرا گئی۔ "تمہارے حوصلے نے تو مردوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم میری شریکِ حیات ہو!"

"میں جا رہی ہوں۔ یہ رات ہیپیوں کے کسی غول میں بسر کروں گی۔ میرے لبوں کے پیاسے سوچ بھی نہ سکیں گے کہ میں کسی فٹ پاتھ پر شب بسری کروں گی!"

"رہائی کے بعد میں تم کو کہاں تلاش کروں گا لونا؟"

"میرا کوئی ٹھکانا نہیں، ہاں اس شہر سے نہ جاؤں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے!" اس نے کہا اور تیزی کے ساتھ واپسی کیلئے مڑ گئی مگر میں اس کی آنکھوں کے گوشوں میں تیرتی نمی دیکھ چکا تھا۔

رات نو بجے کے قریب میری طلبی ہوئی۔ میں کرن سنگھ کے کمرے میں پہنچا تو وہاں آنند بھون کا منتظم سنہا موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا مگر میں نے چہرے پر کرختگی ہی طاری رکھی۔ وجے کی موت کے بعد اسی کی ذات ایسی تھی جس پر گیتا رانی کسی حد تک اعتماد کر سکتی تھی۔

"آپ حوالاتی سے بات کر لیں، میں جا رہا ہوں!" کرن سنگھ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مگر اس سے ذرا ہوشیار ہی رہیں۔ کل رات اس نے بڑا ہنگامہ کیا تھا۔ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو آواز دے لیجئے گا۔ میرے مسلح آدمی دروازے پر ہی موجود رہیں گے!"

کرن سنگھ کے چلے جانے پر ہم دونوں چند ثانیوں تک ہم مرتبہ حریفوں کی طرح ایک دوسرے کی نظروں میں دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہی سکوت توڑا۔ "کیا خبر لائے ہو سنہا؟"

"مالکن یہ جاننا چاہتی ہیں کہ تم نے بغاوت آمیز دھمکی کی جرأت کیوں کر کی؟"

"سوال معقول ہے!" میں نے اعتماد سے سر ہلا کر کہا: "مجھے ایک سگریٹ دو تو میں سکون سے بات جاری رکھ سکوں گا۔"

اس نے پیکٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ ہتھکڑیاں لگے ہونے کے سبب سنہا نے ہی میری سگریٹ جلائی اور میں اس کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا: "وجے اور نرائن داس کی موت تک تم آنند بھون کے ایک فادار ملازم تھے۔ کوئی بات کرنے سے قبل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم خود گیتا رانی کے کتنے معتمد ہو!"

"یہ کس طرح ممکن ہے۔؟" وہ مسکرایا۔ "گیتا رانی یہ سمجھتی ہے کہ میں عقل سے محروم ایک بے ضرر لاعلم شخص ہوں۔ مگر میں وہ سب جانتا ہوں جو وجے اور نرائن کی موت کا سبب بنا۔ فیکٹری کے کاروبار کی نوعیت تو بہر حال میرے لئے کوئی راز ہی نہیں ہے۔ اب تم کوئی ایسی بات بتاؤ جو مجھے مطمئن کر سکے کہ تم گیتا رانی کے رازداں ہو!"

"اس کی کیا ضرورت ہے!" وہ پُرسکون تھا۔

"سنو سنہا!" میں سگریٹ کے پے در پے کئی کش لے کر بولا: "میں بنیادی طور پر پیشہ ور مجرم نہیں ہوں۔ مگر اب میں ماضی کے کچھ واقعات کی بنا پر اس بُری طرح قانون کے شکنجے میں پھنسا ہوں کہ مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ ماضی کے ان واقعات میں آنند بھون کے مکین ہی پس پردہ کارفرما تھے۔۔۔!"

"تمہارا اشارہ چرس کی اسمگلنگ کے واقعہ کی طرف ہے؟" اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ہو سکتا ہے کرن سنگھ تمہیں وہ واقعہ بتا چکا ہو۔! تو میں کہہ رہا تھا کہ ان حالات میں میرے حلقۂ اثر میں صرف گیتا رانی ہی ایسی ہستی ہے جو مجھے ان دشواریوں سے بچا سکتی ہے۔ مگر وہ میرے معاملات میں کیوں دلچسپی لینے لگی جب کہ اس کی دانست میں میں فیکٹری کے غیر قانونی کاروبار کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اور ان دنوں تو وہ کاروبار بھی بند ہی ہے اور اس کا انکشاف کرنے کے بعد منیجر کے طور پر میں خود مزید پریشانی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ لہٰذا بہتر طریقہ وہی ہے جو میں نے اختیار کیا۔ اب اگر تم گیتا رانی کے معتمد نہیں ہو تو اس کے اہم ترین رازوں کا اظہار تمہارے سامنے نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ میری آڑ میں کسی اور کو بھی گیتا رانی کے خلاف بلیک میلنگ کا مواد مل جائے!"

"گڈ۔۔۔!" میری بات پوری ہونے پر سنہا تحسین آمیز لہجے میں بولا: "مگر تمہاری ہی دلیل کے مطابق مجھ پر بھی احتیاط لازم ہے۔ لہٰذا میں اس نکتے سے ابتدا کرتا ہوں جو فیکٹری منیجر ہونے کے باعث تم ضرور جانتے ہو گے۔!"

"ہاں یہ بہتر ہو گا۔!"

"فیکٹری سے دھات کے کھوکھلے مجسموں میں منشیات کی بھاری مقدار غیر ممالک کو برآمد کی جاتی رہی ہے اور یہ بات تمہارے علاوہ پیکنگ شاپ کے چھ افراد کو معلوم تھی جن میں سے ایک کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"میری ہدایات کا ذریعہ؟" میں نے سوال کیا۔

"ڈی ولن۔" وہ اب بہت زیادہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"تو تم یہاں تک جانتے ہو!" سنہا کے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس آزاد ہو گیا۔ پھر وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا: "وہ مر چکا ہے!"

"بیان درست کرو سنہا۔ وہ ایک مصنوعی حادثے کے ذریعے قتل کیا گیا تھا۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ اور اب یہ بتاؤ کہ تنظیم کا اصل سربراہ دیوانہ تھا یا صحیح الدماغ؟"

بوالہوس بوڑھوں کے لئے ایک سبق ○ سسپنس کہانی ○ صوفیہ نسیم

فرسٹ کلاس

کیبن کے خوبصورت اور پرسکون ماحول میں بھی اگر تنہائی ہو تو کوئی دلکشی نہیں رہ جاتی۔ بھلا اکیلے پینے میں بھی کوئی مزہ ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ایڈل ووک کی لڑکی ہیریسیا کو ہی مشرق کے سفر کی دعوت دے جاتی۔ حالانکہ اس نے کئی بار کہا کہ وہ مشرق دیکھنا چاہتی ہے اور ہیوی صنعت ایڈل ووک سے چونکہ سر وحید الدین نے ایک لمبا سودا کیا تھا اس لئے اگر وحید الدین اس سے ہیریسیا کے لئے اجازت طلب کرتے تو وہ کبھی انکار نہ کرتا۔ کیونکہ ابھی سر وحید الدین نے ادائیگی نہیں کی تھی۔ اور بڈو کے پاس سودے کو کینسل کرنے کے حقوق موجود تھے۔

یہ سودا ہی ہیریسیا کی وجہ سے ہوا تھا۔ نہ جانے چالاک نامہ نے سر وحید الدین کی فطرت کیسے بھانپ لی تھی۔ اس نے ابتدا ہی سے ہیریسیا کو ان کے پیچھے لگا دیا تھا اور خوبصورت چہرے اور متناسب اعضا والی لڑکی نے بہرحال سر وحید الدین کو اپنے باپ سے سودا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پورا ایک ماہ ساتھ گزرا تھا۔ گو اس ایک ماہ میں ہیریسیا نے صرف چند راتیں ہی سر وحید کو بخشی تھیں۔ لیکن بہرحال حلوہ کسی قسم کا ہو میٹھا ہوتا ہے۔ اور زبان اس کے مزے سے خوب آشنا ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے باوجود حلوہ کھانے کو دل چاہتا ہے۔

واپسی پر سر وحید الدین نے تفریحاً ہی سمندری جہاز کے سفر کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کے پاس ابھی کافی وقت تھا جس کام کے لئے وہ دہلی سے آئے تھے۔ وہ خلاف توقع جلد ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ واپسی کا سفر سمندری جہاز سے کیا جائے۔ آئرن اسکریپ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ کروڑوں ہی کھیلتے تھے بڑے بڑے سودے کرتے تھے۔ بڑے باپ کے بیٹے تھے اس لئے طبیعت بھی شاہانہ پائی تھی۔ شراب اور عورت کے رسیا تھے۔ کسی ایک عورت کو گلے باندھ کر الجھنوں میں پھنسنا پسند نہ کیا۔ لیکن عورت کے معاملے میں تھوڑے سے منفرد تھے۔

پیشہ ور اور بازاری عورتوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ شکار کر کے کھانے کے عادی تھے۔ گو ان کی دولت بہت سی نوجوان لڑکیوں کو ان کے قریب لائی تھی اور وہ ہمیشہ شکم سیر رہے تھے۔ لیکن بہرحال عمر کی ایسی منزل بھی آتی ہے جب صحیح انتخاب کے لئے صرف دولت سہارا نہیں بنتی۔ نوجوانی کی دوسری بات تھی لیکن اب جب کوئی نوجوان لڑکی ان سے لگاوٹ کرتی تو وہ مشکوک ہو جاتے۔ اور اس کی ذہنی کیفیت کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے۔ ان کی عمر اب اڑتالیس سال کے قریب تھی۔

وہ لڑکیاں انھیں پسند تھیں جو اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے والے اصول پر عمل کرتیں۔ یعنی وہ خالص بازاری نہ ہوتیں لیکن ان کی دلچسپی کا مفہوم واضح ہوتا۔ جیسے ہیریسیا۔!

وہ اپنے باپ کے لیے سودا منظور کرانا چاہتی تھی۔ اس لئے کبھی وحید الدین سے اظہارِ عشق نہیں کیا تھا۔ ہاں باقی معاملات میں وہ بالکل فری تھی اور وحید الدین صاحب کو اس کے حصول کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ بہرحال عمدہ وقت گزرا تھا۔ سودا ہو گیا تھا اور وحید الدین بھی خوش تھے۔ لیکن سمندری سفر کی پہلی ہی رات کو انھیں احساس ہوا تھا کہ اگر ہیریسیا کو دعوت دے ڈالتے تو بہتر تھا۔ کم از کم سفر عمدگی سے گزر سکتا تھا۔ بہرحال پہلی رات وہ بور نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ جہاز پر دوسرے مسافر بھی سفر کر رہے ہیں ان میں نوجوان عورتیں بھی ہیں اور خوبصورت لڑکیاں بھی۔ ممکن ہے ان کے مقصد کا کوئی نکل آئے۔

چنانچہ جہاز کے بار روم میں انھوں نے بڑی فراخدلی سے شراب لنڈھائی۔ بیروں کو بھاری بھاری ٹپ دے کر بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چند حضرات سے تعارف بھی ہوا۔ لیکن کام کی ایک بات بھی نہیں ہوئی۔ اب وہ بوڑھے جیکریں سے دوستی بڑھا کر کیا کرتے جس کے ساتھ دو نوجوان لڑکیاں ضرور تھیں لیکن عجیب بھونڈی شکل کی۔ اور کچھ بد دماغ سی۔ اگر وہ خوش اخلاق بھی ہوتیں تب بھی وحید الدین کے معیار کی نہ تھیں چنانچہ وہ مسٹر جیکریں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے اور خشک انداز میں پیش آئے جو پہلے وحید الدین کے ملک اور پھر جاپان جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہاں مسٹر فلاڈ کی لڑکی پیٹریشا کافی حسین تھی۔ لیکن اس بدبخت کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور اس.... کا شوہر اپنی کمپنی کے کسی کام سے وحید الدین صاحب کے ملک آیا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ارمان بھری جتنی دیر تک وحید الدین کے ساتھ رہی پال کے بارے میں گفتگو کرتی رہی اور بتاتی رہی کہ وہ کیسا محبت کرنے والا شوہر ہے۔ اور اسے کس قدر چاہتا ہے۔ وحید الدین صاحب کو خود ہی معذرت کر کے اس کے پاس سے اٹھنا پڑا تھا۔!

بہرحال چار روز گزر چکے تھے اور وہ ابھی تک کسی لڑکی کو دوست بنانے میں ناکام رہے تھے۔ انھیں اپنے بڑھاپے کا احساس ہو رہا تھا۔ نوجوانی میں انھیں اتنی دقتیں نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ بہرحال ان کے نقوش اور وجاہت کا سہارا بھی ہوتا تھا اور جب مقابل ان سے متاثر ہوتا اور ان کے بارے میں اُسے مکمل معلومات حاصل ہو جاتیں تب وہ اس کی نگاہوں میں بے حد حسین ہو جاتے تھے۔

اب بات دوسری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چار روز سے تنہا تھے۔ ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ گلے میں تختی تو نہیں لٹکا سکتے تھے کہ میں کون ہوں، میری معیت سے بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے!

سر وحید الدین نے شراب کا گلاس خالی کر کے برا سا منہ بنایا۔ انھیں اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے دماغ کیوں خراب ہو گیا تھا۔ مگر ہوائی جہاز سے سفر کرتے تو اب تک نہ جانے کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔ ڈریم لینڈ میں وہ آج بھی شہزادے کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ وہاں آنے والیاں چہروں پر مسکراہٹ چپکائے ہمیشہ ان کی پذیرائی کے لیے تیار رہتی تھیں۔ گو سر وحید انھیں زیادہ گھاس نہیں ڈالتے تھے لیکن جب کچھ نہ ہوتا۔ تو انھیں تر سانے۔ ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں بھی کافی سکون ملتا تھا۔ وقتی تفریح ہو جاتی تھی۔

لیکن جہاز کا یہ خوبصورت ماحول۔ یہ تنہائی کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ کوئی ذریعہ نہیں تھا یہ تنہائی دور کرنے کا۔ وہ بوتل کا کارک کھول کر گلاس میں شراب انڈیلنے لگے۔ اپنے کیبن کا دروازہ انھوں نے بند نہیں کیا تھا۔ یوں بھی ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی مگر جہاز پر خاموشی پھیل گئی تھی۔

دفعتاً کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دروازے کو دھکیلا ہو۔ اس سے قبل کہ سر وحید الدین اپنی جگہ سے اٹھتے۔ ایک دم دروازہ زور سے کھلا اور کوئی اندر گھس آیا۔ وحید الدین گھبرا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ آنے والے نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور پھر اس نے پھرتی سے کیبن کی روشنی گل کر دی۔! ممکن ہے سر وحید الدین خوفزدہ ہو جاتے لیکن داخل ہونے والے کی ایک جھلک تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی شب خوابی کے لباس میں ملبوس۔ بکھرے ہوئے کھلے بال۔ خوفزدہ چہرہ۔ چنانچہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی البتہ انھیں حیرت ضرور ہوئی تھی۔

"کون ہو تم۔ کیا بات ہے۔؟" سر وحید الدین دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ لیکن دوسرے لمحے ایک نرم و نازک بوجھ ان پر آ پڑا۔ اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ سر وحید الدین کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ نرم و ملائم ہاتھ۔ ہاتھ کو ان کے چہرے تک لانے کے لیے اسے اپنا جسم بھی قریب لانا پڑا تھا۔ سر وحید الدین کے چوڑے سینے پر رونگٹے کھڑے کر دینے والا وجود تھا۔ پھر ایک خوفزدہ آواز ابھری۔ "خاموش رہیے۔ خدا کے واسطے خاموش رہیے۔" بڑی حسین سرگوشی تھی۔ سر وحید الدین کیوں نہ خاموش رہتے۔ چنانچہ وہ خاموش کھڑے رہے۔ اگر اس طرح کھڑے کھڑے پوری رات بھی گزر جاتی تو شاید انھیں اعتراض نہیں تھا۔ خوفزدہ لڑکی بدستور ان کے ہونٹوں کو بند کیے ہوئے تھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ سر وحید الدین کو کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ پھر آہستہ سے لڑکی نے اپنا ہاتھ ان کے ہونٹوں سے ہٹا لیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ "اجازت ہو تو روشنی کر دوں۔" سر وحید نے کہا۔

"نائٹ بلب جلا دیں۔ براہ کرم تیز روشنی نہ کریں۔ ممکن ہے وہ زیادہ دور نہ ہو۔" لڑکی نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

"نائٹ بلب ہی۔" وحید الدین نے کہا اور رنگین بلب روشن کر دیا۔ دھیمی روشنی میں انھوں نے لڑکی کے سراپا کا جائزہ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔! لڑکی ان کی توقع سے زیادہ حسین تھی۔ انتہائی خوبصورت اور متناسب۔ ایک عجیب سی کشش تھی اس کے چہرے پر۔ سر وحید الدین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گناہ کرتے ہوئے ان کی دعا قبول ہو جائے گی۔ ایسی حسین لڑکی کا انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے جہاز کی تقریباً تمام خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ لیا تھا۔ نہ جانے یہاں کی نگاہوں سے کہاں چھپی رہ گئی تھی۔

لڑکی کا مکمل جائزہ لینے کے بعد وہ سنبھلے۔ انھیں احساس ہوا کہ شراب آن کے ذہن پر اثر انداز ہے۔ ورنہ وہ لڑکی کو گھورنے کے بجائے اس پر اپنے اخلاق کا رعب ڈالتے۔ چنانچہ وہ ایکدم سنبھل گئے۔ اپنی دانست میں بھرپور دلکش انداز میں مسکرائے اور پھر نرم آواز میں بولے۔ "آپ کھڑی کیوں ہیں خاتون۔ آئیے تشریف رکھیے۔" انھوں نے ماہرانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے اور آہستہ سے دبوچتے ہوئے لڑکی کو ایک خوبصورت کرسی پر لے آئے۔

لڑکی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ ہاں اس نے بیٹھنے کے بعد دو تین بار دروازے کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔!

"دروازہ خاصا مضبوط ہے اور آپ نے اسے اپنے ہاتھوں سے بند کیا ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ خوفزدہ ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کافی مضبوط آدمی ہوں اور آپ جیسی حسین لڑکی کے دشمن اگر ایک سے زیادہ بھی ہوں تو ان کی کمر یاں توڑنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر انھیں دیکھا۔ اور پھر ان کے تندرست جسم پر نگاہ ڈالی۔ اس کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی جیسے اس نے وحید الدین صاحب پر بھروسہ کر لیا ہو۔

"وہسکی پیش کروں آپ کو۔ بدقسمتی سے برانڈی نہیں ہے اور اس وقت کسی کو بلا کر کچھ طلب کرنا۔۔۔؟"

"نہیں شکریہ۔ میں برانڈی کی ضرورت نہیں محسوس کر رہی۔" لڑکی نے جلدی سے کہا۔

"وہسکی۔؟"

"شکریہ۔" لڑکی نے نیم رضامندی سے کہا اور سر وحید الدین نے جلدی سے دوسرا گلاس نکالا۔ اور پھر اس میں ناپ کر وہسکی انڈیلی اور پانی ملانے لگے۔ ان کے خیال میں لڑکیوں کو بغیر پانی ملائے پینا ہی نہیں چاہیے۔

لڑکی نے ایکبار پھر شکریہ ادا کر کے گلاس قبول کر لیا۔ اور پھر اس کے دو تین سپ لے کر ہونٹ خشک کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو پریشان کیا۔"

"مگر یہ جملے صرف گفتگو کے لیے ہیں، تو میں کچھ نہیں کہتا۔ لیکن دوسرے معنوں میں یہ میری دعا کی توہین ہے۔" سر وحید نے کہا۔

"جی۔ میں نہیں سمجھی۔؟"

"میں نے آپ کی دعا کی تھی۔"

"میری دعا۔؟"

"ہاں۔ بدقسمتی سے تنہا ہو گیا ہوں۔ اور اس کا عادی نہیں ہوں۔ شراب کے گھونٹ تنہائی کے بے جان ساتھی تھے۔ خواہش تھی کہ کوئی جاندار مقابل ہو۔ ابھی ہونٹوں سے دعا نکلی تھی کہ قبول ہو گئی۔ چنانچہ آپ یہ نہ کہیں کہ آپ نے مجھے پریشان کیا۔"

"اوہ۔" لڑکی کے ہونٹوں پر ایک شفقت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ "لیکن آپ کی دعا نے میری حالت بہت خراب کی ہے۔"

"اس بارے میں نہیں سمجھا۔" سر وحید الدین نے اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

"میرے ہر پریشانی اگر آپ کی دعا سے ٹوٹی ہیں تو آپ کی دعا میرے لیے سہت مہنگی رہی۔"

"بخدا۔ میرے ہونٹوں سے آج تک کسی حسین لڑکی کے لیے بددعا نہیں نکلی۔ نرم و نازک پھول تو آنکھوں کو شگفتگی بخشتے ہیں۔ ان کے نہ کھلنے کی دعا کون کافر کرے گا۔"

"آپ کی باتیں بہت دلکش ہیں۔ یقین کریں میری آدھی پریشانی دور ہو گئی۔"

"باقی آدھی پریشانی آپ مجھے مستعار دے دیں۔ تاکہ آپ کے چہرے کے کنول مکمل طور سے کھل جائیں۔ یقین کریں آپ کی پریشانی قبول کر کے مجھے دلی مسرت ہوگی۔" وحید الدین نے کہا۔

"آپ بے حد مخلص انسان ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ ایسے وقت میں آپ سے ملاقات ہو گئی جبکہ مجھے ایک ہمدرد کی سخت ضرورت ہے۔"

"حسینوں کے بارے میں کسی ذی ہوش کو کوئی تجسس نہیں ہونا چاہیے لیکن آپ کی پریشانی معلوم کرنے کے بعد اسے دور کر کے مجھے دلی مسرت ہوگی۔ کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کس سے خوفزدہ ہیں۔؟"

لڑکی کے چہرے پر ایکبار پھر خوف کے آثار ابھر آئے۔ لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ پرسکون ہو گئی۔ "میں اس قدر بزدل نہیں ہوں۔ لیکن جہاز پر جس غیر متوقع انداز میں وہ میرے سامنے آیا۔ اس نے مجھ پر اثر کیا ہے۔ عام حالات میں شاید میں اس سے آنکھ ملا کر گفتگو کر سکتی تھی۔!"

"شراب اور لو۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ مگر تم جہاز کے کس حصے میں تھیں۔ میں نے اس سے قبل تمھیں نہیں دیکھا۔"

"کیبن نمبر ایک سو پانچ۔ لیکن میں زیادہ تر اپنے کیبن میں ہی رہتی ہوں۔"

"وہ کون ہے تمھارے ساتھ۔؟"

"یہی تو بدقسمتی ہے۔ وہ کوئی نہیں ہے۔"

"تنہا۔" وحید الدین نے خوشی کا نعرہ لگایا۔

"ہاں۔ تنہا ہوں۔" لڑکی کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھر آئے۔

"تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں حسین لڑکی۔؟"

"جوزین گرے۔"

"واہ۔ جوزین ڈارلنگ۔ مجھے وحید الدین کہتے ہیں۔ تمھارا مخلص دوست ثابت ہوں گا۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ جو تمھارا دشمن ہے۔ کیا اس وقت وہ تمھارا تعاقب کر رہا تھا۔؟"

"ہاں۔ سر شام ہی مجھے اس کی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن میں نے سوچا یہ میرا وہم ہے۔ تاہم اس وقت سے میں الجھی ہوئی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ اگر وہی تھا تو اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ دیکھ لیا کیا معنی۔ وہ میرے ہر پروگرام سے واقف ہے اور کامیابی سے میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ تبھی میں سکون کی نیند نہ سو سکی۔ جونہی میری آنکھ بند ہوتی میرے ذہن میں اس کی تصویر ابھر آتی۔ لیکن اس بار میں عالم ہوش میں تھی، جب مجھے کیبن کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مسٹر وحید الدین۔ دروازہ کھل گیا۔ لیکن میں خوف کی وجہ سے مسہری سے اتر آئی تھی۔ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔ آہ۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا مسٹر وحید الدین وہ ظالم جھنجھلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ مجھے قتل کر دینا چاہتا ہے۔ بمشکل تمام میں دروازے سے باہر نکل سکی۔ وہ مجھے کیبن کی مسہری کے نیچے تلاش کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ پلٹا اور میرا پیچھا کرنے لگا۔ آہ۔ نہ جانے کس طرح میں اسے فریب دے کر یہاں تک آنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔"

لڑکی کا حسین چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا اور وحید الدین اس بدلے ہوئے رنگ میں بھی حسن تلاش کر رہے تھے۔ لڑکی نوعمر تھی، حسین تھی اور سر وحید الدین نے ایک خاص بات محسوس کی تھی، وہ یہ کہ لڑکی نے ایکبار بھی ان کا نام کسی بیگانہ انداز کے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے عمر پر کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ تو یہ تو بڑی مسرت کی بات تھی۔ گویا وہ انھیں بحیثیت دوست۔ بحیثیت عاشق بھی قبول کر سکتی ہے۔ ویسے غیر ملکی لڑکیوں کے بارے میں سر وحید الدین کا تجربہ تھا کہ وہ نوجوان لڑکوں کی بہ نسبت پختہ عمر کے عاشقوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق زیادہ عمر کا عاشق زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ اور یہ لڑکی۔ سر وحید الدین نے گہری نگاہوں سے لڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹکی ہوئی تھی۔ گلاس اس کی نازک انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ اور اس کی نگاہیں کیبن کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کا ابھار بے حد دلکش تھا۔ بے حد بھیگا ہوا سا ابھار جو بوسہ لینے کے لیے نہایت موزوں ہوتا ہے۔ سر وحید الدین کا دل چاہا کہ فوراً اس سے ایک بوسے کی فرمائش کر دیں۔ لیکن۔ وہ خود پرتی بوپ خوب جانتے تھے۔ ابھی اگر کسی نے کوئی ایسی فرمائش کر دی تو وہ انھیں ایک بوالہوس انسان سمجھے گی۔ جو کسی ضرورت مند اور پریشان حال لڑکی کی پریشانی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور وہ ان کی طرف سے یقیناً بددل ہو جائے گی اور پھر اس کے بعد ممکن ہے وہ ان کے کیبن سے چلی جائے۔ اور۔ کوئی اور سہارا تلاش کرے۔! نہیں نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے وہ لڑکی کا دل ہاتھ میں لیں۔ اس کا دکھ معلوم کریں۔ اس پر اپنی شرافت کا خوب سکہ جمائیں

اور لڑکی کو اس حد تک متاثر کردیں کہ وہ خود ہی ان پر عاشق ہوجائے۔

بالکل۔ بالکل یہی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے شراب کا گلاس رکھ دیا۔ شراب جس قدر معدے میں جائے گی، اسی قدر حواس باختہ کرے گی اور وہ یہ اہم کام نہ کرسکیں گے، جو کرنا چاہتے ہیں۔

"مس جوزین۔" انھوں نے بڑی ملائمت سے اسے پکارا۔ اور جوزین سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "مجھے آپ کی پریشانی سے دکھ ہے۔ مجھے بتایئے۔ میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔"

جوزین ویران ویران سی نگاہوں سے انھیں گھورتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں کی کوریں بھیگ گئیں۔ ہونٹ کپکپانے لگے اور پھر آنسو آنکھوں کے گوشوں سے ڈھلک کر گالوں پر بہنے لگے!

"میں۔ میں بے حد بدنصیب ہوں مسٹر وحیدالدین۔ میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔ زندگی کے بوجھ کو سنبھالے سنبھالے پھر رہی ہوں۔ زندگی قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن۔ لیکن۔ آہ۔ والدین اولاد کے لئے خوشیاں مہیا کرتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کے لئے وہ کچھ چھوڑ جاتے ہیں جو اس کے مستقبل کا سہارا بنے۔ لیکن میرے ڈیڈی۔ آہ ڈیڈی۔ تم میرے لئے موت کا خوف چھوڑ گئے ہو۔ صرف موت کا خوف۔" وہ سسکنے لگی۔

سر وحیدالدین اپنی جگہ سے اٹھے۔ پھر بوکھلا کر بیٹھ گئے۔ وہ جوزین کے آنسو خشک کرنا چاہتے تھے۔ اسے سینے سے لپٹا کر دلاسا دینا چاہتے تھے۔ لیکن پھر انھوں نے سوچا کہ یہ بات لڑکی کی توقع کے خلاف نہ ہو۔

چند منٹ وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر ان کے ذہن میں خیال آیا کہ روتی ہوئی لڑکی اس بات کا برا نہ منائے کہ انھوں نے اسے خاموش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے دلاسا نہیں دیا۔ چنانچہ ہمت کرکے وہ اس کے قریب پہنچ گئے۔

"یہ حقیقت ہے مس جوزین۔ کہ میں ایک کمزور دل انسان ہوں۔ براہ کرم خاموش ہوجایئے۔ میں آپ کی سسکیاں برداشت نہیں کرسکتا! براہ کرم خاموش ہوجایئے۔" انھوں نے ڈرتے ڈرتے جوزین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن پھر دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ اس طرح ہاتھ رکھنا تو معیوب ہے۔ یعنی یہ تو دستِ شفقت کہلاتا ہے!

چنانچہ انھوں نے جلدی سے جوزین کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ نہ جانے۔ نہ جانے جوزین کیا سمجھے۔ لیکن جوزین نے کچھ نہ سمجھا۔ اور اپنا سر ان کے سینے پر ٹکا دیا۔ سر وحیدالدین کا دل سینے میں مچلنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ لڑکی یہ بھی باتوں کا برا نہیں مانے گی۔

"براہ کرم خاموش ہوجایئے۔ مجھے اپنا درد بتایئے۔ دل کا غبار نکال دینے سے دل ہلکا ہوجاتا ہے۔"

"ڈیڈی کے انتقال کو تین سال گزر گئے۔ اور ان پورے تین سالوں میں خوف کا شکار رہی ہوں۔ بتایئے کیا یہ تین سال انسان کو زندگی سے بیزار کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔"

"بہت کافی ہیں۔" وحیدالدین صاحب نے بڑے خلوص سے کہا۔ لڑکی کی ریشمی مرکالس۔ اس کے گداز شانے کا سحر دماغ پر اثر کر رہا تھا۔

"کیا ان حالات میں انسان کو خودکشی نہیں کرلینی چاہیئے۔؟"

"یقیناً۔ یقیناً۔" انھوں نے اسی خلوص سے گردن ہلائی۔ اور پھر ایکدم سنبھل گئے۔ "تم میرا مطلب ہے۔ حالات واقعی تکلیف دہ ہیں اور انسان کو اس حد تک لے جاسکتے ہیں۔ لیکن اسے استقامت سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مجھے بتاؤ حسینہ۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"آپ۔ آپ بے حد مخلص انسان ہیں۔ انسانیت کا پیکر۔ ورنہ آدھی رات گئے میرے لئے پریشان نہ ہوتے۔" لڑکی نے ممنونیت سے انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں۔ میں تو ساری رات تمہارے لئے پریشان ہونے کو تیار ہوں۔" وحیدالدین نے خلوص کا اظہار کیا۔

"کتنے اچھے ہیں آپ۔ آہ۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔ اور وحیدالدین صاحب کا دل چاہا کہ اب تو اسے پیار کر ہی لیا جائے۔ وہ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر جھکے۔ لیکن اسی وقت کیبن کے دروازے پر ایک زوردار دستک سنائی دی۔ اور لڑکی اچھل کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

اڑتالیس سالہ تندرست و توانا وحیدالدین صاحب ایک کاروباری آدمی تھے۔ لڑکیوں کے شکاریوں میں سے تھے لیکن۔ اس شکار کے علاوہ کسی اور قسم کے شکار سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ ان کے دشمنوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ زبانی جنگ خوب کرسکتے تھے۔ لیکن عملی جنگ سے آج تک واسطہ نہیں پڑا تھا۔

ابھی تک انھوں نے سنجیدگی سے لڑکی کے اس دشمن کے بارے میں نہیں سوچا تھا جو اس کے پیچھے پستول لئے پھر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اب تک لڑکی ہی میں الجھے رہے تھے۔

لیکن اس دستک کو سن کر ان کے حواس بھی ٹھکانے آنے لگے۔ لڑکی خوبصورت ضرور ہے۔ لیکن ایک مردِ خطرناک قسم کا دشمن بھی رکھتی ہے۔ اگر وہ ان کی دوست بن گئی۔ تو کیا اس کا دشمن خود وحیدالدین صاحب کا دشمن نہیں ہوگا۔؟ اوہ۔ سوچنا پڑے گا۔ لڑکی کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا جائے یا نہیں۔؟ لیکن دروازے پر موجود دشمن۔!

لڑکی اب بھی اسی انداز میں کھڑی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھی۔ "کیا آپ کے پاس پستول ہے۔؟"

"پ۔ پستول۔ نہیں تو۔" وحیدالدین صاحب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تب براہ کرم۔ مجھے کسی جگہ پوشیدہ کردیں۔"

"میں۔ کہاں۔ کہاں چھپاؤں۔؟" وحیدالدین صاحب ناچتے ہوئے بولے۔ "آپ۔ آپ دیکھیں۔ دروازے پر کون ہے۔"

"ایں۔!" وحیدالدین صاحب کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ ایک طرف حسین لڑکی تھی۔ دوسری طرف۔ دوسری طرف نہ جانے کون ہو۔ ممکن ہے وہی پستول بردار ہو۔ اوہ۔ اگر اس وقت لڑکی کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کیا تو۔ وہ مستقبل میں کیا توقع رکھے گی۔ ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ دیکھا جائے۔ اگر۔ اگر بات بن گئی تو یہ حسین لڑکی۔!

وحیدالدین صاحب نے سوکھے حلق میں۔ حق کا دل چاہ رہا تھا کہ شراب کے چند گھونٹ لے کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ لیکن یہ سہارا بھی بزدلی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ اس وقت فوری عمل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آخری لمحات میں انھوں نے فیصلہ کرلیا۔ اور دروازے کی طرف بڑھے۔ لڑکی ایک طرف اوٹ... میں ہوگئی تھی۔ وحیدالدین صاحب نے دروازہ کھولا۔ لیکن آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ کوئی خطرناک اور کریہہ شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ابھی چند ساعت کے بعد ایک گول اور ٹھنڈا سا دائرہ ان کی پیشانی سے چپک جائے گا۔ اس کے بعد ایک کرخت آواز سنائی دے گی "خبردار۔ آواز نکالنے کی کوشش کی تو گولی ماردوں گا۔"

اور پھر۔ اور پھر۔ ایک مضبوط ہاتھ زور سے انھیں دھکا دے گا اس کے بعد۔ اس کے بعد۔ انھوں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن نہ پاسکے۔ ڈر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ لیکن ان کی نگاہوں میں کوئی خاکہ نہ ابھرا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ باہر اسی طرح خاموشی تھی۔ ویسا ہی سناٹا تھا۔

گویا وہم تھا۔ دستک ان کے دروازے پر نہیں ہوئی تھی۔ بیلاقہ دور دور تک کسی کا نشان نہیں تھا۔ اوہ۔ لڑکی ان کی بزدلی تاڑ گئی ہو۔ اسے ان کے خوف کا احساس نہ ہوگیا ہو۔ وہ ایکدم باہر نکل آئے۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے واپس پلٹے۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

"کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی تو نہیں ہے۔"

"لیکن دستک۔؟" لڑکی کی سرگوشی ابھری۔

"ممکن ہے کسی اور دروازے پر ہوئی ہو۔ باہر بالکل سناٹا ہے"

"اوہ میرے خدا۔ اس خوف سے کب نجات ملے گی۔" وہ ایک گہری سانس لیکر وحیدالدین صاحب کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ میری موجودگی میں تمہیں خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے۔"

"آپ۔ آپ۔ کب تک مجھے سہارا دیں گے۔" وہ دردسے گردن جھکا کر بولی۔

"بیگم۔ جب تک تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔" وحیدالدین صاحب اس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ اور لڑکی غمزدہ نگاہیں اٹھا کر انھیں دیکھنے لگی۔

"آپ۔ آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ کس قدر نیک اور کس قدر رحمدل ہیں آپ۔ سنیئے۔ میں اپنے کیبن تک نہ جاسکوں گی۔ تنہا اپنے کیبن میں میں یہ رات نہ گزار سکوں گی۔ کیا آپ مجھے اپنے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دیدیں گے۔ ایک رات۔ صرف ایک رات۔؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو ڈارلنگ۔ تم شوق سے یہاں رہو۔ بس میری خواہش ہے کہ مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتادو۔ تاکہ میں تمہارے لئے کوئی بہتر بات سوچ سکوں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم جہاز کے کپتان سے گفتگو کریں گے ان تمام لوگوں کی شناختی پریڈ کرائیں گے اور پھر تمہارے دشمن کو گرفتار کرلیا جائے گا۔ کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک جہاز سفر کرتا رہے گا۔"

"آہ۔ کاش ایسا ہوسکتا۔ لیکن۔ لیکن۔!" لڑکی نے گردن جھکالی۔

"لیکن کیا۔؟" وحیدالدین نے پوچھا۔

"مجھے۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چھپانا چاہیئے۔ مجھے آپ کو سب کچھ بتادینا چاہیئے۔ آپ فرشتہ صفت انسان ہیں۔ مجھے امید ہے آپ میری مدد کریں گے۔ کم از کم میرا راز۔ راز رکھیں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں ڈارلنگ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ۔ تمہیں مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔"

"مجھے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ اس لئے۔ اب میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ بیٹھ جایئے۔ آپ کھڑے کیوں ہیں۔"

"شکریہ۔" وحیدالدین صاحب اس اپنائیت پر خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ اور پھر وہ لڑکی کے نزدیک ہی بستر پر بیٹھ گئے، ان کی آنکھوں سے محبت کا خمار چھلک رہا تھا۔

لیکن لڑکی کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ معصوم سی لڑکی ہے۔ کیسی پیاری شکل ہے۔ اور کیسے متناسب جسم کی مالک ہے۔ نہ جانے اس حسین لڑکی کا منحوس دشمن کون ہے۔ اسے تو پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا جاسکتا۔ بے وقوف گدھا کہیں کا۔! وحیدالدین سوچ رہے تھے۔

لڑکی کافی دیر تک گردن جھکائے خیالات میں ڈوبی رہی۔ پھر اس نے گہری نگاہوں سے وحیدالدین صاحب کو دیکھا۔

"آپ اتنے ہمدرد انسان ہیں کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاسکتی۔ لیکن کہیں اپنی داستان سنا کر میں آپ کی نگاہوں سے گر نہ جاؤں۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا جوزین۔ جو مقام تم نے میری نگاہوں

یہ حاصل کرلیا ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔" وحید الدین صاحب نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تو سنیئے۔ میرے والد۔ ایک قمار خانے کے پیشہ ور جواری تھے۔ قمار خانے نے انہیں ملازم رکھا ہوا تھا۔ اور وہ تاش کے پتوں کی کاریگری دکھا کر لوگوں کی جیبیں خالی کرانے کا کام کرتے تھے۔ میری ماں کو شادی کے بعد میرے والد کے کرتوت معلوم ہوئے تھے۔ بظاہر وہ عمدہ شخصیت کے مالک تھے اور شریف لوگوں کی مانند زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ان کی حقیقت میری ماں کو شادی کے بعد معلوم ہوئی تھی۔ میری ماں اپنے شوہر کے بارے میں جانے کون کون سے عقیدے رکھتی تھیں۔ لیکن۔۔۔ میرے والد کیا سے کیا نکلے۔

اس بات کا صدمہ میری والدہ کو اس قدر ہوا کہ وہ سخت بیمار پڑ گئیں۔ اور شادی کے ٹھیک آٹھ سال کے بعد انھوں نے دنیا ہی چھوڑ دی۔ اس وقت میری عمر صرف دو سال تھی۔

میرے والد نے میری ماں کی موت کا رسمی سا سوگ منایا۔ اور پھر اپنے دلچسپیوں میں گم ہو گئے۔ انھیں میری بھی پروا نہیں تھی۔ بس نہ جانے کس طرح میری پرورش ہوئی۔ جب میں چودہ سال کی ہوئی۔ تو ایک رات والد صاحب کسی بڑے شاطر سے ٹکرا گئے۔ اس رات وہ قمار خانے کی جانب سے نہیں بلکہ پرائیویٹ طور پر کھیل رہے تھے۔ اس کھیل میں انھوں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ یہاں تک کہ وہ مکان بھی جس میں ہم رہتے تھے۔ لیکن۔۔۔ اس کے باوجود وہ آخری داؤ لگانا چاہتے تھے۔

اور اس آخری داؤ کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ ان کے کسی دوست نے انھیں میرے لئے پیشکش کی۔ والد صاحب کو پہلے تو طیش آیا لیکن آخری داؤ میں وہ سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے دس ہزار پاؤنڈ میں مجھے رہن رکھ دیا۔ اور مجھے رہن رکھنے والا قمار خانے کا مالک سولیٹر تھا۔ مکار اور درندہ صفت سولیٹر۔۔۔! والد صاحب کی بدقسمتی زوروں پر تھی۔۔۔ یہ داؤ بھی ہار گئے۔۔۔ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔!

دوسری صبح انھوں نے اپنی غیرت کا عظیم ثبوت دیا۔ انھوں نے ایک آرا مشین پر اپنے دونوں ہاتھ کاٹ لئے اور ہسپتال جا کر مر گئے۔ اُن کی موت سے مجھے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔۔۔!

سولیٹر مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ مجھے اپنی حقیقت معلوم تھی۔ میں فروخت شدہ مال تھی۔ کیا کہتی۔۔۔ کس سے کہتی۔۔۔! چالاک سولیٹر نے سوچا کہیں میں فرار ہونے کی کوشش نہ کروں۔ چنانچہ اس نے دوسری ترکیب کی۔ اس نے مجھے دلاسے دیئے کہ میں اس کے لئے اس کی بیٹی کی حیثیت رکھتی ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی جائے گی۔۔۔ میں یہاں زندگی بھر عیش و آرام سے رہوں گی۔۔۔!

اور اس وقت میں نے اس شخص کی نیک نیتی پر بھروسہ کر لیا۔

میں نے سوچا میں قسمت کی ماری ہوئی ہوں۔۔۔ اگر اسی طرح زندگی گزر جائے، تو کیا حرج ہے۔!

لیکن۔۔۔ زندگی اتنی آسانی سے نہیں گزرتی۔۔۔ پانچ سال میں نے سکون سے گزارے۔ سولیٹر نے درحقیقت میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ لیکن وہ ایک اچھا سوداگر تھا۔ مال کی قیمت سے بخوبی واقف تھا اور درپردہ کسی عمدہ گاہک کی تلاش میں تھا۔۔۔ اور۔۔۔ پھر اسے ایک گاہک مل گیا۔

آہ۔۔۔ اس کا نام لوئیک گیروز تھا۔ ایک جوان العمر نواب زادہ، کاش وہ مجھ سے شریفانہ انداز میں ملا ہوتا۔ کاش اس نے میرا سودا نہ کیا ہوتا، تو میں اس کا قرب غنیمت جانتی۔۔۔ میں اس کی غلام بن کر رہ سکتی تھی۔ لیکن اس نے بھاری رقم کے عوض میرا سودا کر لیا۔۔۔ اور وحشی صفت نواب زادے نے پہلی ہی رات میں لگائی ہوئی رقم کا منافع حاصل کرنا چاہا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے شریفانہ طور پر اپنا لے۔ لیکن۔۔۔ وہ شخص انسانیت سے عاری تھا۔ اس نے کہا کہ میں خریدی ہوئی چیز ہوں۔ میرے ساتھ شرافت کا سلوک کیسا۔ تب مجھے بھی طیش آ گیا۔ میں نے اُسے زخمی کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گئی۔

لیکن مسٹر وحید الدین آپ خود سوچیں۔ مجھ بے سہارا لڑکی کے لئے کونسا سہارا تھا۔ میں کہاں جاتی۔ ایک ویران مکان میں میں نے رات گزاری۔ اور پھر دوسرے دن میں سولیٹر کے پاس پہنچ گئی۔ قمار خانے کا مالک میری روداد سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ اس نواب زادے سے وہ میری رقم وصول کر چکا تھا اس کے دل میں لالچ آ گیا۔ اور اس نے مجھے ایک مکان میں پوشیدہ کر دیا۔

دنیا اب مجھے بہت کچھ سکھاتی جا رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ سولیٹر اب کیا سوچ رہا ہے۔ وہ دوبارہ میری قیمت وصول کرنے کے چکر میں تھا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے میں دوسرے آدمی کے چنگل سے نہ نکل سکوں۔ اس لئے مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں جس مکان میں تھی اس کی قیمتی چیزیں فروخت کر کے میں نے کچھ رقم اکٹھی کی اور پھر ایک رات کو اس شہر سے ہی نکل آئی۔

ایک دوسرے شہر پہنچ کر میں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں صبح کا ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اخبار دیکھا اور اس میں ایک خوفناک خبر پڑھ کر میں اچھل پڑی۔ یہ سولیٹر کے قتل کی خبر تھی۔ قاتل کی تصویر بھی اخبارات میں چھپی تھی۔ اور قاتل اس نواب زادے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وجۂ قتل نامعلوم تھی کیونکہ قاتل کامیابی سے فرار ہو گیا تھا۔ بہرحال پولیس اس کی تلاش میں تھی۔

وجۂ قتل مجھے معلوم تھی مسٹر وحید الدین۔ نواب زادے نے سولیٹر کو بے ایمان سمجھ کر قتل کر دیا تھا۔ وہ اتنا خطرناک آدمی ہو گا میرے۔۔۔ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔۔۔ میں بے حد خوفزدہ ہو گئی۔۔۔ میں نے ہوٹل سے نکلنا چھوڑ دیا۔

لیکن آخر کب۔۔۔ رقم ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہوٹل کے مالکان کب تک مجھے یہاں رہنے دیتے۔۔۔ چنانچہ ناچار میں باہر نکلی اور کوئی ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب ایک جنرل سٹور میں مجھے ملازمت مل گئی۔ لیکن میری بُری حالت تھی۔۔۔ مجھے ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں وہ نواب زادہ نکل آئے اور مجھے نہ دیکھ لے۔

اور مسٹر وحید الدین۔ قسمت جب خراب ہوتی ہے تو وہی خدشات عملی شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔۔۔ آ ہی گیا وہ۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں تحیر اتر آیا۔ وہ ایک گاہک کی حیثیت سے اندر آیا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میرے بدن کا سارا خون خشک ہو گیا تھا۔

"مس جوزین۔" اس نے سفاکانہ مسکراہٹ سے کہا۔ میرے حلق سے آواز کہاں نکلتی۔ "میں آپ سے دوستانہ ماحول میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے سہمے سہمے انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ سب اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔ ایسے میں اگر وہ سائلنسر لگے ریوالور سے میرے سینے میں سوراخ کر دے۔۔۔ اور خاموشی سے نکل جائے تو۔۔۔!

"آپ کی چھٹی کس وقت ہوتی ہے۔۔؟"

"چار بجے۔۔۔" نہ جانے یہ لفظ میرے منہ سے کیسے نکلے۔

"تب میں آپ کا انتظار کروں گا۔" میں نے جواب نہ دیا۔ "آئیں گی آپ۔۔؟"

اور بے ساختہ میری گردن ہل گئی۔ اُس نے کچھ چیزیں خریدیں۔ بل ادا کیا اور باہر نکل گیا۔ لیکن میرے حواس جواب دے گئے تھے۔ چار بجنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ لیکن۔۔۔ آہ۔۔۔ یہ ڈیڑھ گھنٹہ میرے اوپر بہت سخت گزرا۔۔۔ میں خوف و دہشت کے عالم میں سوچتی رہی۔ یہی شکر تھا کہ میرے کاؤنٹر پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی میری حالت سے واقف ہو جاتے اور پھر بات نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتی۔ میں سخت کشمکش کے عالم میں تھی۔۔۔ میں جانتی تھی کہ وہ قاتل ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ اگر میں پولیس کو اطلاع دے دوں تو ایک اخلاقی فرض بھی ادا ہو جائے گا اور میری اس سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔!

لیکن میری ہمت نہ پڑی۔ چالاک قاتل آج تک پولیس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا ہے۔ اب بھی بچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ مجھے ایک پل زندہ نہیں چھوڑے گا۔

چار بج گئے۔۔۔ میری پارٹنر نے مجھ سے ڈیوٹی بدل لی۔ میں اس کے خلاف کچھ نہ کر سکی اور پھر میں اسٹورز سے نکل کر لڑکھڑاتے قدموں سے چلی اپنے ہوٹل جانے کے لئے۔۔۔ تو۔۔۔ اسٹورز سے تھوڑے فاصلے پر وہ مجھے مل گیا۔

آہ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ تھی۔ نیلے رنگ کی ایک خوبصورت گاڑی کا دروازہ کھول کر اُس نے مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا اور میں بیٹھ گئی۔

میری حیثیت سہمی ہوئی چڑیا کی مانند تھی۔ دماغ میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت سے مکان میں داخل ہو کر اس نے کار روکی اور مجھ سے اترنے کیلئے کہا۔ میں اتر گئی۔ وہ میرے بازو کو سہارا دے کر اندر لے گیا۔ اور پھر اس نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔!

تب اچانک میرے دل میں حوصلہ ابھرا۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میرے اوپر کیوں ظلم کیا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی حفاظت کرنی چاہیئے۔ نواب کی قہر آلود نگاہوں کے جواب میں میں نے بھی اسے ایسی ہی نگاہوں سے گھورا۔ اس کے ہونٹوں پر تنفر آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا خیال ہے جوزین۔" اس نے کہا۔

"کس بارے میں۔۔؟" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تمہارا خیال تھا کہ تم ہمیشہ میری نگاہوں میں دھول جھونکتی رہو گی۔"

"میں نے تمہاری آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی۔"

"خوب۔ میرے سر کا زخم آج بھی دکھ رہا ہے۔"

"تم اسی قابل تھے۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"کیوں۔۔؟" وہ غرایا۔

"تمہیں کیا حق ہے کہ تم مجھے میری مرضی کے خلاف مجبور کرو۔ بے سہارا ہونے کا یہ مقصد تو نہیں ہے کہ انسان کو جس طرح چاہو پریشان کرو۔"

"کیا بکواس ہے۔ میں نے تمہاری قیمت ادا کی ہے۔"

"تم۔۔۔ ذلیل انسان۔ کسی انسان کی قیمت کیا ادا کر سکو گے۔"

"سولیٹر نے تمہیں میرے ہاتھ فروخت کیا تھا۔"

"وہ کون ہوتا ہے مجھے فروخت کرنے والا۔۔؟"

"کیوں۔ کیا وہ تمہارا مالک نہیں تھا۔۔؟"

"تم بھی تو زبردستی میرے مالک بن بیٹھے ہو۔ لیکن کان کھول کر سن لو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سولیٹر مجھے بیٹی بنانے کے بعد ایسی کوئی حرکت کر رہا ہے تو اس کا خون تمہارے ہاتھوں نہیں میرے ہاتھوں سے ہوتا۔ اور یہ بھی کان کھول کر سن لو۔ تم بالکل گدھے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم نے میری قیمت ادا کر دی ہے اور اب میں تمہاری ملکیت ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے میں ایک آزاد اور شریف لڑکی ہوں جس کے ساتھ چاہوں گی زندگی گزاروں گی کوئی مجھے میری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تیری قیمت ادا کی ہے۔ میں تیرے اوپر حق رکھتا ہوں۔"

"اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔ میں کسی شریف انسان کی بیوی تو بن سکتی ہوں۔ کسی کی داشتہ نہیں۔"

"او۔ کمینی۔ میں تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔ سن۔ اب نہ صرف میں۔ بلکہ میرے دوست بھی تیرے حسن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ یہ میری آن کا سوال ہے۔ میں تیرے غرور کو پاش پاش کر دوں گا۔"

اور اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میں نے نہایت جرأت سے کام لیا تھا۔ لیکن مجھے اپنی حیثیت معلوم تھی۔ میں کمزور عورت اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ کہیں چلا گیا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس سفاک انسان نے جو کچھ کہا ہے وہی کرے گا۔ میں کیا مدافعت کر سکوں گی۔ ایک کمزور لڑکی ہوں۔ سوائے اس کے کہ جان دے دوں۔!

لیکن جان دے دینا اس قدر آسان نہیں ہے مسٹر وحید الدین۔ انسان جان دینے کے بارے میں آسانی سے سوچ لیتا ہے۔ لیکن۔! کافی دیر تک میں پریشان بیٹھی رہی اور پھر میری نگاہ روشندان پر جا پڑی جو چھت کے نزدیک تھا۔ روشندان اتنا بڑا تھا کہ مجھ جیسی دبلی پتلی لڑکی اس سے نکل سکتی تھی۔

لیکن۔ اس تک پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو اس تک پہنچنے میں مدد دیتی۔ لیکن جب مسئلہ زندگی کا ہو تو انسان آخری کوشش بھی کر ڈالتا ہے۔ اور میں نے وہ کچھ کیا جس کے بارے میں عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ صوفہ بہت وزنی تھا اور دیوار کا سہارا نا پائیدار۔ لیکن میں نے جسم کی ساری قوت مجتمع کر کے صوفے کو اٹھایا اور لمبا لمبا دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اب روشندان زیادہ اونچا نہیں رہ گیا تھا۔ تب میں نے جوتے اتارے اور صوفے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کس طرح میں صوفے کے اوپری حصے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ پھر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر میں نے روشندان پکڑ لیا اور اس کے بعد جو میں نے روشندان تک پہنچنے کی جدوجہد کی، آپ یقین کریں مسٹر وحید الدین۔ ہوش و حواس کے عالم میں نہیں کی تھی۔ مجھے تو اس وقت ہوش آیا۔ جب میں روشندان سے گزر کر کمرے کی چھت پر پہنچ چکی تھی۔!

چھت سے اتر کر میں اس طرح بھاگی کہ مجھے ہوش نہ رہا۔ میری عجیب حالت تھی۔ ننگے پاؤں، بکھرے بال، پسینے میں شرابور۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے مجھے اس حال میں دیکھا ہوگا۔ اور پھر مسٹر وحید الدین۔ نہ جانے کس طرح میں اپنی رہائش گاہ پہنچی۔ اس کا خوف میرے ذہن پر مسلط تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ واپس آئے گا اور مجھے نہ پا کر کس قدر چراغ پا ہوگا۔ پھر وہ کسی نہ کسی طرح جنرل اسٹورز سے میری رہائش کا پتا معلوم کر لے گا اور ایک بار پھر میں اس کے چنگل میں ہوں گی۔

نہیں۔ نہیں۔ اس کے قبضے میں جانے سے اب موت بہتر ہے۔ میرے پاس جو کچھ رقم تھی اسے لے کر اور ایک سوٹ کیس میں تھوڑے سے کپڑے رکھ کر میں نے اپنے پرانے جوتے پہنے اور باہر نکل آئی۔ ایک ٹیکسی کر کے ریلوے اسٹیشن پہنچی اور پھر جو ٹرین ملی اس پر سوار ہو گئی۔!

آہ۔ میری کیا کیفیت تھی، میں بتا نہیں سکتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا میں کہاں جا رہی ہوں۔ بس ایک خوف میرے ذہن پر مسلط تھا۔ اور پھر میں ایک دوسرے شہر پہنچ گئی۔ ایک نوجوان اور لاوارث لڑکی، جس کے پاس بڑی رقم بھی نہیں تھی۔ کیا کرتی۔ میں کیا کرتی۔! میں نے حواس بحال کیے۔ اور ایک معمولی سے ہوٹل میں قیام کیا۔ بری حالت تھی میری۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا میں خودکشی کر لوں۔ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔ کون میرا پرسان حال تھا۔ جس کمرے میں میرا قیام تھا وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ زیادہ صاف ستھرا بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنا سامان کھولا اور کمرے کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ الماری کھولی۔ بہت سے پرانے اخبار الماری میں پڑے تھے۔ ہوٹل بہت ہی گھٹیا تھا۔ اس کے کمروں کی ٹھیک سے صفائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اخبار نکالے۔!

لیکن۔ اخباروں کے نیچے مجھے ایک سیاہ سی چیز نظر آئی۔ یہ ایک چرمی بیگ تھا۔ شاید کوئی مسافر بھول گیا تھا۔ وحید الدین صاحب میں نے وہ بیگ اٹھایا۔ اسے کھولا۔ اس میں بہت سے کاغذات، ایک پاسپورٹ جس کی تصویر اکھڑی ہوئی تھی، اور ان کاغذات کے نیچے ایک اچھی خاصی رقم موجود تھی۔!

میرے ہاتھوں اور پیروں میں سنسنی دوڑ گئی۔ کیا کروں۔ کیا اس بیگ کی اطلاع ہوٹل کے عملے کو دوں۔ لیکن۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا کیوں نہ یہ چیزیں ان کے مالک کو دے کر اس کی ہمدردیاں حاصل کروں۔ میں نے پاسپورٹ پر نام پڑھا۔ مس ڈریلا مورگن لکھا ہوا تھا۔ عمر بیس سال۔ اور دیگر تفصیلات۔ پاسپورٹ کے ساتھ آپ کے ملک کا ویزا بھی تھا۔ جو ابھی کافی دنوں تک کارآمد تھا۔! رقم بھی تھی۔! تب میں نے سوچا کہ شاید یہ میرے لیے کوئی غیبی امداد ہے۔ اکھڑی ہوئی تصویر کی جگہ اپنی تصویر لگا لوں۔ تھوڑی سی رشوت دے کر مہر لگوائی جا سکتی ہے۔ باقی عمر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ رقم بھی موجود تھی۔

آہ۔ میں نے خوشی سے سوچا۔ شاید میری بدنصیبی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ قدرت نے مجھے ایک راستہ دکھا دیا ہے۔ مجھے آنکھیں بند کر کے اسی راستے پر چل پڑنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے فوری عمل کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایک اسٹوڈیو جا کر تصویر اتروائی۔ اور پھر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ لیکن بدنصیبی کے کچھ دھبے ابھی صاف نہیں ہوئے تھے۔

میرا پاسپورٹ وغیرہ بالکل مکمل ہو گیا تھا۔ بحری جہاز کے ٹکٹ میں نے حاصل کر لیے تھے اور اس شام میں ایک ٹیکسی میں اپنے ہوٹل واپس جا رہی تھی کہ ایک ٹریفک سگنل پر ٹیکسی رک گئی اور اس کے برابر ہی ایک سرخ رنگ کی کار آ کر رکی۔ اور۔ اس کار میں وہ بھی چند دوسرے لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ میری نگاہیں اس سے ملیں اور وہ اچھل پڑا۔ مجھے اپنا ذہن تاریک ہوتا محسوس ہوا۔ لیکن اچانک ٹیکسی چل پڑی۔ اور۔ خدا کی قدرت۔ سرخ رنگ کی کار میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ وہ اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ میں نے اسے جھنجھلاتے ہوئے کار سے اترتے دیکھا۔ وہ خالی ٹیکسی کی تلاش میں لپکا۔ لیکن اسے ٹیکسی نہ مل سکی۔

میرے دل کی بری حالت تھی۔ گرتی پڑتی نہ جانے کس طرح ہوٹل پہنچی۔ سامان اکٹھا کیا۔ کلیجہ حلق سے باہر نکلا آ رہا تھا۔ اس نے یہاں بھی مجھے دیکھ لیا۔ اب کیا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کر کے معلوم کرے گا کہ اس نے مجھے کہاں اتارا۔ جہاز کی روانگی میں ابھی بہت وقت باقی ہے۔ اب کیا کروں۔؟

آخری جدوجہد کے طور پر میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور بندرگاہ پہنچ گئی۔ اس رات میں نے بندرگاہ کے مسافر خانے میں قیام کیا۔ اور دوسرے دن اس وقت تک ہولتی رہی جب تک جہاز میں سوار نہ ہو گئی۔! آہ مسٹر وحید الدین جب جہاز نے ساحل چھوڑ دیا۔ تب میری جان میں جان آئی۔ میں نے سوچا اب میں اس موذی کے چنگل سے نکل آئی۔!

میں اپنے کیبن میں بند رہتی تھی۔! پھر جب میرا خوف ختم ہو گیا تو میں کیبن سے نکل آئی۔ لیکن آہ۔ وہ یہاں بھی موجود ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اب۔ اب وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اب وہ مجھے ضرور قتل کر دے گا۔! اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سر وحید الدین کاروباری آدمی تھے۔ سر کا خطاب انھیں جانے کیا سے مل گیا تھا۔ نہ جانے انھوں نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا۔ لیکن ذہنی طور پر وہ کاروباری ہی تھے۔ انھوں نے سوچا۔ لڑکی حسین ہے۔ بے حد حسین ہے لیکن ٹیڑھی کھیر ہے۔ یا تو اس کے حسن سے متاثر ہو کر ایک خطرناک آدمی کی دشمنی مول لی جائے۔

یا پھر۔ لڑکی سے معذرت کر لی جائے۔ دونوں میں سے کون سا کام مناسب ہے۔ لڑکی روتی رہی۔ اور وہ سوچتے رہے۔ لیکن یہ تنہائی اور یہ حسین لڑکی۔ اگر وہ اس کی مدد کریں تو حواس باختہ لڑکی ان سے بے حد متاثر ہوگی اور۔ شاید وہ ان کی عمر بھی نظر انداز کر دے۔ کیوں نہ ہمت کی جائے۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک کشمکش میں رہے۔ پھر انھوں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اور رحم طلب نگاہوں سے وحید الدین کو دیکھ رہی تھی۔ یہ نگاہیں۔! سر وحید الدین بوڑھے ضرور ہو گئے۔ لیکن دل ابھی بالکل ہی مردہ نہیں ہوا تھا۔ زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تو کیا حرج ہے۔ لڑکی کو پناہ دینی چاہیے۔ اور پھر اس عمر میں اگر کوئی لڑکی متاثر ہو جائے تو۔ تو۔!

نہ جانے کس طرح انھوں نے دل مضبوط کیا اور پھر وہ لڑکی کے نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے چہرے کو مقابل کرتے ہوئے بولے۔ "آنکھیں خشک کر لو مس جوزین۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ کس کی مجال ہے کہ تمھیں ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔ کل دن میں تم مجھے اس کی شکل دکھا دینا۔ میں جہاز کے کپتان سے بات کروں گا۔ اسے بتا دوں گا کہ اس شخص کی وجہ سے تمھاری زندگی خطرے میں ہے۔ اسے گرفتار کر لیا جائے اس وقت تک کے لیے جب تک جہاز منزل پر نہ پہنچ جائے۔"

"نہیں نہیں۔ یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس طرح کپتان تحقیقات کرے گا اس سے بھی معلومات حاصل کرے گا اور پھر میرا راز کھل جائے گا۔ علم ہو جائے گا کہ میں ڈریلا مورگن نہیں۔ جوزین ہوں۔ اور مجھے واپس بھیج دیا جائے گا۔ اسے بھی واپس بھیج دیا جائے گا اور اس بار وہ اپنے پورے وسائل سے کام لے کر مجھ سے انتقام لے گا۔ آہ۔ میں ایسا نہیں چاہتی۔"

"پھر مجھے بتاؤ۔ میں تمھارے لیے کیا کروں۔؟"

"اگر۔ مناسب سمجھیں۔ تو دوران سفر مجھے اپنے ساتھ ہی رکھیں۔ منزل پر پہنچ کر میں کہیں گم ہو جاؤں گی۔ میرے اوپر یہ احسان کر دیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔"

"اوہ۔ نہیں جوزین۔ نہیں ڈارلنگ۔ احسان کیسا۔ مجھے۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ میں۔ میں۔ تمھیں بے حد پسند کرنے لگا ہوں۔" سر وحید الدین نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"آہ۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔ آپ۔ آپ۔" اور سر وحید الدین کے ہونٹ جوزین کے ہونٹوں کی طرف بڑھے۔ وہ اس کے ہونٹوں کے قریب ہی پہنچے تھے کہ دروازے پر بھونچال آ گیا۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے دروازہ اکھاڑنے کی کوشش کی ہو۔

جوزین کے حلق سے چیخ نکل گئی اور وحید الدین اچھل کر ایک طرف جا گرے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھلے۔ وہ حواس باختہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باہر آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ نہ جانے کس طرح انھوں نے ہمت پیدا کی اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ باہر دن کی روشنی دیکھ کر وہ حیران رہ گئے تھے۔

دروازے کے عین سامنے ایک خوبصورت گری ہوئی ٹرالی سیدھی کر رہا تھا۔ اس نے معذرت آمیز انداز میں سر وحید الدین کی طرف دیکھا۔ "میں شرمندہ ہوں جناب۔ آپ کی نیند خراب ہوئی۔ ٹرالی اچانک الٹ کر دروازے سے ٹکرا گئی تھی۔ میں از حد شرمندہ ہوں۔" خلاصی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔" سر وحید الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر دانت پیستے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔! جوزین اب بھی خوفزدہ نگاہوں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں ڈارلنگ۔ خلاصی تھا۔"

"اوہ۔! اور روشنی۔؟" جوزین نے پوچھا۔

"صبح ہو گئی ہے۔!"

"میرے خدا۔ میں نے آپ کو کس قدر پریشان کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ مجھے سخت افسوس ہے۔"

"اوہ۔۔ نہیں بیبی۔۔ نو نہیں ڈارلنگ۔۔ تم باتھ روم جا کر ہاتھ منہ دھولو۔۔ یا غسل کرلو۔۔ اس کے بعد ناشتہ کریں گے۔۔ پھر اگر نیند آئی تو سونے کی کوشش کریں گے۔"

ناشتہ کرنے کے بعد وحیدالدین نے بڑے پیار سے جوزین کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ خود انھیں نیند نہیں آرہی تھی۔ نہ جانے خوف سے۔۔ یا۔۔ بس یونہی۔۔ وہ جاگتے رہے۔۔ سوتے میں انھوں نے جوزین کے حسن کا بھرپور جائزہ لیا۔۔ بے حد حسین تھی۔۔ بلاشبہ ایک منتخب حسن۔۔ جس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ جواہر کے پرانے شکاری تھے۔ ہیرے کی قیمت سے واقف تھے۔

اس انمول موتی کے لئے تو زیادہ سے زیادہ جدوجہد کی جاسکتی ہے اس کے لئے تو جو کچھ بھی کیا جائے کم ہے۔۔ جلدبازی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے نوواک کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ اپنے ساتھ ہی رکھا جائے اور بڑے سکون سے اس پری کو شیشے میں اتارا جائے۔۔ جلدبازی کام بھی بگاڑ سکتی ہے۔ وہ دکھی ہے، انھیں بھی غلط نہ سمجھ لے۔

نہ جانے کب وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔۔!

اور پھر جوزین نے ہی انھیں جگایا تھا۔ اس نے شاید غسل کیا تھا نکھرا نکھرا چہرہ۔۔ بالوں سے ٹپکتی ہوئی شبنم۔۔ غلافی آنکھیں۔۔ جن میں وقت سونے کی وجہ سے گلابی ڈورے ابھر آئے تھے۔۔ بے حد حسین لگ رہی تھی وہ۔۔ سروحیدالدین اسے دیکھتے رہ گئے۔۔!

"تمہارا لباس تمہارے کیبن میں ہوگا؟"

"ہاں۔۔!"

"چابی تمہارے پاس ہے۔۔؟"

"نہیں۔۔ کیبن کھلا ہوا ہے۔۔ مجھے اسے بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔"

"میں تمہارا لباس لاتا ہوں۔۔ خوفزدہ مت ہونا۔۔!" وحیدالدین نے کہا۔ اور اس نے گردن ہلا دی۔ کیبن نمبر ایک سو پانچ سے انھوں نے جوزین کا سوٹ کیس لیا اور اپنے کیبن میں آگئے۔۔ جوزین پُرسکون تھی۔

اس نے لباس تبدیل کرلیا۔ اور سروحیدالدین نے کھانا طلب کرلیا کھانا کھا کر انھوں نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ اور پھر شام ہوگئی۔ "کیا خیال ہے جوزین۔۔ کیا باہر نکلو گی۔۔؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" جوزین نے کہا۔

"اوہ۔۔ ڈارلنگ۔۔ میں موجود ہوں۔۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر تم مجھے اس کی شکل بھی تو دکھاؤ۔۔!"

"میری ہمت نہیں پڑتی۔"

"لیکن ابھی دو دن کا سفر باقی ہے۔۔ کیا تم یہ وقت کیبن میں ہی گزارو گی۔۔؟"

"براہ کرم۔۔ مجھے یہیں رہنے دیں۔"

یہ شام جوزین باہر نہ نکلی۔ سروحیدالدین بھی اس کی وجہ سے کیبن میں بند رہے۔۔ وہ جوزین کی دلجوئی کررہے تھے۔۔ اپنے بارے میں بتا رہے تھے اور محسوس کررہے تھے کہ جوزین ان سے متاثر ہے۔۔ ایک حسین لڑکی۔۔ آج بھی ان سے متاثر ہوسکتی ہے۔۔ یہ سوچ کر وحیدالدین خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔۔ یہاں تک کہ انھوں نے جوزین کو خود سے کافی بے تکلف کرلیا۔

"رات کو کیا ہوگا۔۔؟" جوزین نے پوچھا۔

"کیا مطلب۔۔؟"

"یہاں ایک ہی بستر ہے۔۔؟"

"اوہ۔۔ ڈارلنگ۔۔ صرف آج کی بات ہے۔۔ ایک رات میں کرسی پر سو جاؤں گا۔۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"کتنے عظیم انسان ہیں آپ۔۔ میں آپ کے اس احسان کو کیسے اتاروں گی؟" جوزین نے کہا۔

"تمہارے لئے کچھ کرکے مجھے لذت حاصل ہوتی ہے جوزین۔۔ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔" سروحیدالدین نے کہا۔ چنانچہ اس رات سروحیدالدین اور جوزین دیر تک گفتگو کرتے رہے۔۔ وحیدالدین نے جوزین سے اجازت لے کر شراب منگوائی تھی۔۔ جوزین نے بھی معمولی حد تک ان کا ساتھ دیا۔ خود سروحیدالدین نے پینے میں احتیاط رکھی تھی۔۔ زیادہ پی کر وہ بہکنا نہیں چاہتے تھے ممکن ہے نشے کے عالم میں جوزین کے بارے میں ان کے جذبات ابھر آئیں۔۔ وہ کیبن میں ان کے ساتھ سو رہی تھی اور رات اور تنہائی شراب کے خمار میں زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے۔۔ وہ ٹھنڈا کرکے کھانے کے عادی تھے۔۔ جوزین ابھی خوفزدہ ہرنی تھی جو اپنے سائے سے بھی بھڑک اٹھتی ہے۔

جب وہ پُرسکون ہوجائے گی تب۔۔

اور سروحیدالدین اس وقت کے تصور سے شہد نچوڑنے لگے۔۔ جوزین کی آنکھوں میں نیند انگڑائیاں لے رہی تھی۔۔ اس کی آنکھیں بے حد خوبصورت ہوگئی تھیں۔۔ وحیدالدین نے ان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خود کو بمشکل سنبھالا۔

"نیند آرہی ہے۔۔؟" انھوں نے پوچھا۔ اور جوزین نے معصومیت سے گردن ہلا دی۔

"سو جاؤ۔۔ بےفکری سے۔۔ آرام کی نیند۔۔ میں تمہارے لئے جاگوں گا!"

سروحیدالدین نے کہا۔ جوزین نے مشکرانہ نگاہوں سے انھیں دیکھا اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔۔! درحقیقت وہ بڑی گہری نیند سو گئی تھی۔۔ سوتے میں سروحیدالدین اس کے سینے کے زیروبم دیکھتے رہے۔۔ کیا لوخیزیت تھی۔۔ کیا قیامت تھی لیکن حواس پر قابو رکھنا ضروری ہے۔۔ ورنہ سب کا بھرم ٹوٹ جائیگا۔۔ وہ بے سہارا ہے۔۔ خطرے میں گھری ہوئی ہے۔۔ ایسی حالت میں وہ کیا سوچے گی۔۔ صرف یہی کہ آخر وہ بھی ایک عام انسان نکلے۔۔ بوالہوس۔۔ مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے۔۔!

نہ جانے کب تک سروحیدالدین جاگتے رہے۔۔ سوچتے رہے۔۔ سوچتے رہے جاگتے رہے۔۔ لیکن اب انھوں نے جوزین کے خوابیدہ بدن کی جانب نگاہ ڈالنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

اور پھر انھیں بھی نیند آگئی۔۔ صبح کو آنکھ کھلی تو گھبرا گئے۔۔ جوزین کے بستر پر نگاہ ڈالی۔۔ وہ سکون کی نیند سو رہی تھی۔۔ پھر دروازے کی طرف دیکھا۔۔ اندر سے بند تھا۔۔ انھوں نے سکون کی گہری گہری سانسیں لیں۔۔ بڑی خیریت ہوئی۔۔ شاید وہ دیوانہ بھی اس رات مایوس ہوگیا تھا۔ ورنہ اسکے لئے بڑا اچھا موقع تھا۔

غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے تو جوزین جاگ اٹھی تھی اور اپنے بستر پر انگڑائیاں لے رہی تھی۔۔ سروحیدالدین کو دیکھ کر بڑے دلربایانہ انداز میں مسکرائی۔۔ اور سروحیدالدین اس مسکراہٹ میں کھو گئے۔۔ اس مسکراہٹ میں ممنونیت نہیں تھی۔۔ اس میں ایک عجیب سا پیار تھا۔۔ اور وہ اس پیار میں کھو گئے۔۔! جوزین اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

"بڑی گہری نیند سوئی میں تو۔۔!"

"ہاں۔۔!" سروحیدالدین نے بھی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"بالکل بے خبر!"

"بہت عرصے کے بعد اتنی سکون کی نیند آئی۔"

"اب تمہاری ہر رات سکون سے گزرے گی۔"

"شاید۔۔!" اس کے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔

"شاید نہیں۔۔ ایسا ہی ہوگا جوزین۔۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔۔ بھروسہ کرو میرے اوپر۔۔ میں بہت جلد تمہیں اس کے چنگل سے نجات دلادوں گا!" جوزین اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔۔ پھر انھوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔۔ اور ناشتے کے دوران سروحیدالدین نے کہا۔ "ابھی ہم باہر چلیں گے۔۔ تم بالکل بےفکری سے میرے ساتھ چہل قدمی کروگی۔۔ ہم جہاز کے چپے چپے پر گھومیں گے۔۔ تم بس ایکبار مجھے اس کی شکل دکھادو۔۔ باقی کام میں خود کروں گا۔"

"مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔" جوزین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"خوف سے کام نہیں چلے گا جوزین۔۔ تم یوں سوچو۔۔ مجھے اس کا صورت آشنا ہونا ہی چاہیے۔۔ ورنہ میں اس سے کیسے نمٹوں گا۔"

"لیکن۔۔ اگر اس نے مجھے دور سے، خاموشی سے نشانہ بنا دیا تو؟"

"دن کی روشنی میں وہ یہ جرأت نہیں کرسکے گا۔۔ یہ سمندری جہاز ہے اگر اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو اسے دیکھنے والے بہت سے ہوں گے اور وہ کہیں بھاگ کر بھی نہ جاسکے گا۔۔!"

بمشکل تمام سروحیدالدین، جوزین کو باہر نکلنے پر آمادہ کرسکے۔۔ جوزین نے لباس تبدیل کیا اور پھر وحیدالدین کے ساتھ باہر نکل آئی۔۔ مسافروں کی دنیا دری تھی۔۔ چاروں طرف چہل پہل تھی۔۔ بہت سے مسافروں نے معنی خیز نگاہوں سے، معنی خیز مسکراہٹوں سے، نوجوانوں نے طنزیہ انداز میں، عمر رسیدہ لوگوں نے رشک بھرے انداز سے سروحیدالدین کو دیکھا۔

"کیوں بڑے میاں۔۔ یہ مزے کررہے ہو۔۔؟"

"یہ عمر۔۔! اور یہ لڑکی!"

"لڑکی بالکل بگڑی ہے۔۔ ہونہہ۔۔ ہمیں چھوڑ کر اس بوڑھے کا انتخاب کیا۔"

"مارگیا ہاتھ یار۔۔ اس عمر میں کیا لڑکی ماری ہے۔"

یہ تھا ان نگاہوں کا مفہوم۔۔ قرب و جوار کے لوگوں کو معلوم تھا کہ حسین لڑکی سروحیدالدین کے کیبن میں راتیں بسر کررہی ہے۔۔ سروحیدالدین ان نگاہوں کے عادی تھے۔۔ وہ ان کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ انھوں نے جوزین کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔۔ اور مسکراتے ہوئے اس سے باتیں کرتے چل رہے تھے۔

"تم جونہی اس کی شکل دیکھو۔۔ میرا ہاتھ دبا دینا۔" انھوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"اچھا۔۔!" جوزین نے بھی ویسی ہی سرگوشی کی۔

ٹہلتے ہوئے وہ جہاز کے عرشے پر گئے۔۔ پورے عرشے پر گھومنے کے بعد وہ دوسرے حصے میں آگئے اور پھر گھومتے گھومتے وہ تھک گئے۔

"کمال ہے۔۔ کہاں جا چھپا۔۔!" انھوں نے کہا۔

"وہ۔۔ وہ بے حد چالاک انسان ہے۔" جوزین آہستہ سے بولی۔

"کتنا ہی چالاک ہو۔۔ سروحیدالدین سے ٹکر نہ لے سکے گا۔۔ آؤ، ریستوران میں چائے پئیں گے۔۔!" انھوں نے ریستوران میں چائے پی۔۔ مسافروں میں ایک جولانی سی تھی۔۔ منزل کے قریب تر آرہی تھی۔ جدائیوں کے آثار شروع ہوچکے تھے۔۔ لوگوں نے اپنے سامان سنبھال لئے تھے۔۔ پھر جب جہاز بندرگاہ کے علاقے میں داخل ہوا تب وہ اپنی جگہ سے اٹھے۔

"لو بھئی سفر ختم ہوا۔۔ تمہارے چالاک دشمن صاحب ناکام رہے۔ اب وہ نئی گھاتیں لگائیں گے اور میں انھیں وہ چکر دوں گا کہ انھیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا! لیکن ہاں۔۔ تم اس کی ایک جھلک بھی دیکھو تو مجھے ضرور آگاہ کردینا۔"

سروحیدالدین کی عالیشان کوٹھی دیکھ کر جوزین خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ "آہ۔۔ کیسی حسین کوٹھی ہے۔۔ میں نے خواب میں بھی ایسی عمارت کا تصور نہیں کیا تھا۔۔" وہ کوٹھی کے حسین لان پر ناچتی ہوئی بولی۔

"اب تم خوابوں کی دنیا سے نکل آؤ۔۔ ویسے تمہارے آنے سے اس کوٹھی کا حسن اور بڑھ گیا ہے۔"

"سچ۔۔!" جوزین نے سرشار ہوکر کہا۔

"ہاں جوزین۔۔ میری خواہش ہے کہ زمانے بھر کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈال دوں۔۔ ہماری ملاقات کو زیادہ طویل نہیں ہے جوزین۔ لیکن

میں محسوس کر رہا ہوں، جیسے ۔۔۔ جیسے جوزین۔ میں ہمیشہ تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ ہمیشہ تمہیں دیکھتا رہا ہوں۔"

اور جوزین محبت پاش نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگی۔ سادہ دل اور معصوم سی لڑکی نے ان کی عمر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اُسے تو ایک محسن کی ضرورت تھی، بے سہارا لڑکی پہلے ہی سہارے کو سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔

سر وحید الدین صاحب کو اس کی آنکھوں سے جواب مل گیا اور وہ دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ بڑھاپے کی یہ کمائی ان کے لیے بہت بڑی حیثیت رکھتی تھی۔ بڑے بڑے جوانوں کے درمیان وہ فخر سے سر اٹھا کر چل سکتے تھے۔

جوزین یہاں آکر بے حد خوش تھی۔ وہ شاید اس خطرناک انسان کو بھول گئی تھی۔ اس نے ایکبار بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور سر وحید الدین کے ساتھ دن بھر مصروف رہی۔ سر وحید الدین نے اپنی خوابگاہ سے ملحق ایک کمرہ اس کے لئے تیار کرا دیا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ بھی موجود تھا۔ یہ دروازہ سر وحید الدین نے خاص طور سے تیار کرایا تھا۔!

رات کے کھانے کے بعد سر وحید الدین اس سے کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے دوسرے دن کی سیر کے پروگرام بنائے۔ اپنے کاروبار کے بارے میں بتاتے رہے اور انھوں نے جوزین کے چہرے پر مرعوب ہونے کے آثار دیکھے۔ وہ ان کی امارت سے بہت مرعوب ہوئی تھی۔

"مسٹر وحید الدین ۔۔۔ آپ ۔۔۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود کس قدر ہمدرد ۔۔۔ کس قدر سادہ دل انسان ہیں۔"

"یہ بات نہیں جوزین ۔۔۔ شاید دوسروں کے ساتھ میں ایسا نہ ہوں۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"تمہاری بات اور ہے جوزین ۔۔۔ میں تو ۔۔۔ تمہیں دیکھتے ہی بیخود ہو گیا تھا ۔۔۔ آہ ۔۔۔ جوزین۔ میں ۔۔۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا تم نے میرے دل کی کیا حالت کر دی ہے۔ میں ۔۔۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں جوزین۔ سب کچھ . . ."

"وحید الدین۔" جوزین کے چہرے پر بھی بے خودی طاری ہونے لگی اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

"تم نے میری زندگی میں خوشیاں بکھیر دی ہیں جوزین۔ بتاؤ۔ بتاؤ کیا تم میری محبت قبول کر لوگی۔" انھوں نے آگے بڑھ کر جوزین کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔ جوزین ان کے سینے سے آلگی۔ اس نے مخمور آنکھیں اٹھائیں۔ ان آنکھوں میں جذبات سلگ رہے تھے اور پھر اس کی باہنیں وحید الدین کی گردن میں پہنچ گئیں۔ ۔ سر وحید الدین نے اپنے پیاسے ہونٹ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھائے ۔۔۔ اور جوزین کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ اور اسی وقت اچانک چھت میں لگے ہوئے خوبصورت الیکٹرک شیڈ میں چھناکا ہوا اور اس کے ٹکڑے اچھل کر دور دور تک گر پڑے ۔۔۔ چند جلتے ہوئے ٹکڑے ان کے جسم کے کھلے حصوں سے بھی ٹکرائے تھے۔

جوزین حلق پھاڑ کر چیخی۔ سر وحید الدین کے حلق سے بھی ایک بے ساختہ آواز نکل گئی تھی۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ دوسرے لمحے وحید الدین جھپٹ کر ایک کونے میں ہو گئے۔ انھوں نے جوزین کو بھی کھینچ لیا تھا۔ پھر باہر سے دروازے پر دستک سنائی دی۔ اور اسکے بعد ملازم کی آواز آئی۔

"صاب ۔۔۔ صاب ۔۔۔ کیا میں اندر آجاؤں ۔۔۔؟"

ملازم کی آواز سنکر سر وحید الدین کی جان میں جان آئی اور پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔!

"کیا ہوا صاب ۔۔۔؟" ملازم نے بے ساختہ پوچھا۔

"باہر کون تھا ۔۔۔ کیا ۔۔۔ کیا تم نے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا؟" سر وحید الدین نے پوچھا۔

"کک ۔۔۔ کہاں سے؟" ملازم نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"دروازے کے سامنے سے۔"

"نہیں تو صاب ۔۔۔ میں تو خود راہداری میں بیٹھا تھا۔" ملازم نے حیرت سے جواب دیا۔

"جاؤ ۔۔۔ دوسرے لوگوں کو بلا لاؤ۔" سر وحید الدین نے کہا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد سارے ملازموں نے کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا ۔ لیکن کسی ذی روح کا وجود نہیں ملا تھا۔

سر وحید الدین خود بھی چھان بین میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن الیکٹرک شیڈ کے ٹوٹنے کا عقدہ نہ کھلا۔ جوزین البتہ پھر سے خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بعد بقیہ رات خوشگوار نہ گزری۔ سر وحید الدین خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ الیکٹرک شیڈ اتفاقاً تو نہیں ٹوٹ سکتا ۔ لیکن کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا' باہر بھی کوئی نہ تھا۔!

پھر ۔۔۔؟

اور دوسری صبح انھوں نے ناشتے کی میز پر فیصلہ کیا کہ چونکہ ان کے ذہنوں میں چور ہے ۔ وہ اپنے درمیان بدمعاش نووک کا وجود سمجھتے ہیں' اسلئے ہر بات پر سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ الیکٹرک شیڈ گیس بھر جانے سے بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ زیادہ گرم ہو کر ٹوٹ گیا ہو ۔۔۔؟

"میرا خیال ہے جوزین ڈارلنگ ۔ ہم انتہائی خاموشی سے ایک پیاری مقام پر چلیں ۔۔۔ وہاں میرا بنگلہ ہے ۔ پُر فضا مقام ہے اور ماحول بھی بے حد حسین ہے ۔۔۔ اس موسم میں لوگ وہاں کم جاتے ہیں اس لئے بھیڑ بھاڑ بھی نہ ہو گی۔ تم یقیناً اس جگہ کو پسند کرو گی ۔ اور پھر وہاں ہم اس کے خیال سے بھی دور رہیں گے۔"

"میں تو ہر طرح خوش ہوں مسٹر وحید الدین ۔۔۔ جیسا آپ پسند کریں؟" جوزین نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں تمہارے چہرے سے اُداسی کی ایک ایک لکیر دھونا چاہتا ہوں ہم تھوڑی دیر کے بعد روانہ ہو جائیں گے ۔ وہاں سے تمہارے لئے نئے نئے لباس وغیرہ خریدے جائیں گے اور پھر تیاریاں مکمل کر کے ہم چل دیں گے۔"

جوزین نے گردن ہلا دی۔۔۔!

یہ تیاریاں تین دن تک ہوتی رہیں ۔۔۔ جوزین کے لباس سلنے کی وجہ سے اتنا وقت لگا تھا ۔۔۔ اس کے علاوہ سر وحید الدین کو کاروباری معاملات کے لئے بھی کچھ وقت کی ضرورت تھی ۔۔۔ یہ تین دن بہت پُر سکون گزرے تھے۔ کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی ۔۔۔ اور اب تو جوزین کے دل سے بھی نووک کا خیال نکلتا جا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ۔ نووک ہمیں بھول گیا ہے۔" اس نے وحید الدین سے کہا۔

"اس بدمعاش کی کیا مجال ہے کہ سر وحید الدین کے سامنے آئے۔" سر وحید الدین نے اکڑ کر کہا۔

"لیکن اس رات ۔۔۔!"

"وہم تھا ۔ صرف وہم ۔۔۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔" اور جوزین خاموش ہو گئی ۔۔۔ اور پھر چوتھی رات وہ ایک ٹرین کے اسپیشل کمپارٹمنٹ میں چل پڑے ۔۔۔ جوزین خوبصورت لباس میں بے حد حسین نظر آ رہی تھی ۔۔۔ اور سر وحید الدین سوچ رہے تھے کہ اس سے قبل کسی لڑکی نے انھیں اس قدر متاثر نہیں کیا۔ کیا وہ سچ مچ اس سے محبت کرنے لگے ہیں۔

اونہہ ۔۔۔ محبت جوانی میں نہیں کی تو اس بڑھاپے میں کون کرے' جوزین ایک حسین لڑکی ہے' اور حسین لڑکیوں پر پہلے بھی بہت کچھ خرچ کر چکے تھے ۔۔۔ جوزین پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے ۔۔۔ وہ سب کچھ اُس کے حسن سے وصول ہو جائے گا ۔۔۔ اور جب ان کا دل بھر جائے گا تو اس کے بعد وہ دوسری لڑکیوں کی طرح جوزین سے بھی اجنبی ہو جائیں گے ۔۔۔!

آنکھیں بدل لینے میں سر وحید الدین کو کمال حاصل تھا۔ نوجوانی کی عمر میں تو بہت سی لڑکیاں ان کی بے اعتنائی سے پاگل ہو چکی تھیں۔ لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں ۔۔۔ فی الحال جوزین ان کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتی تھی۔

ٹرین کا خوشگوار سفر ختم ہو گیا اور وحید الدین جھریالی کی خوبصورت عمارت میں پہنچ گئے ۔۔۔ یہ خوشنما بنگلہ بھی انھوں نے عیاشی کے لئے بنوایا تھا۔ اس بنگلے کے در و دیوار پر ان کی زندگی کی بہت سی رنگین داستانیں لکھی ہوئی تھیں اکثر وہ اپنے شکار یہاں لاتے تھے اور خوب داد عیش دیتے تھے۔

جوزین نے بنگلے سے باہر کا ماحول دیکھا ۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں پسندیدگی اُمڈ آئی۔ "کتنی خوبصورت جگہ ہے ۔ یہاں آنے کے بعد واپس جانے کو کس کا دل چاہتا ہو گا۔"

"تمہیں پسند ہے ۔۔۔؟"

"بے حد ۔"

"ٹھیک ہے ۔۔۔ جب تک دل چاہے یہاں رہو ۔ تمہیں یہاں سے جانے کو کون کہے گا۔!"

"سچ ۔۔۔؟" جوزین نے مسرت سے کہا۔

"اس میں کیا جھوٹ ہے میری زندگی۔" وحید الدین نے اس کا نفیس نازک ہاتھ چوم لیا ۔۔۔ اور جوزین کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ "کیوں ۔ کیا سوچنے لگیں جوزین؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔" جوزین نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"پھر بھی ۔ کچھ تو ۔۔۔؟" سر وحید الدین نے اصرار کیا۔

"میں ۔" جوزین نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ۔ "میں نووک کے بارے میں سوچ رہی تھی!"

"ارے اس کے فرشتے بھی یہاں تک نہ پہنچ سکیں گے ۔ میری جان جوزین اس کا خیال ذہن سے نکال دو ۔۔۔ وہ تمہاری تلاش میں بھٹکتا رہے گا ۔ بالآخر تھک ہار کر واپس چلا جائے گا ۔ میرا دعویٰ ہے وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

جوزین گردن ہلانے لگی ۔ پھر اس نے شاید نووک کا تصور جھٹک دیا ۔۔۔ وہ اس خوبصورت بنگلے کی سیر کرنے لگے ۔ سر وحید الدین کا ایک ملازم مستقل یہاں رہتا تھا ۔ جوزین نے اس کے بیوی بچوں سے ملاقات کی ۔۔۔ وہ خود کو اس ماحول میں ضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ پورا دن ہنسی خوشی گزر گیا ۔ اور پھر رات آگئی ۔۔۔ آج سر وحید الدین کا خیال تھا ۔ کہ ان کی محنت کا ثمر انھیں مل جائے گا۔!

جوزین نے پہلے بھی اُن سے اجتناب نہیں کیا تھا ۔ صرف حالات ہی گڑبڑ کرتے رہے تھے ۔ لیکن ۔۔۔ اب اس حسین ماحول میں' وحید الدین صاحب کے دل کی آرزو ضرور پوری ہو جائے گی۔

رات کے کھانے سے قبل وحید الدین صاحب نے چند پیگ بھی لیے۔ جوزین نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا ۔۔۔ لیکن وہ پینے کے معاملے میں بہت محتاط تھی ۔ ایک مخصوص حد سے وہ آگے نہ بڑھی۔

سر وحید الدین کی خوابگاہ بے حد حسین تھی ۔ یہاں ایک خوبصورت ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا ۔ دیواروں پر حسین مناظر کی تصاویر آراستہ تھیں۔ کیوپڈ کا ایک حسین مجسمہ ایک سمت رکھا ہوا تھا ۔ رات کو روشنی ستاروں کی شکل میں بکھیرنے والی ایک برہنہ عورت شرمائی شرمائی کھڑی تھی ۔ اسکے پھیلے ہوئے ہاتھ سے ٹمٹماتے ستارے اُبل رہے تھے۔

ایسا رومانی منظر تھا کہ دلوں میں خواہ مخواہ ہی جذبات بھڑکنے لگتے ۔ سر وحید الدین نے جوزین کی آنکھوں میں مستیاں اُبلتے دیکھیں۔ شراب کے سرور نے سر وحید الدین کو بھی غیر محتاط کر دیا تھا۔

"جوزین ۔۔۔" انھوں نے بھاری آواز میں اُسے پکارا۔

"جی ۔۔۔" جوزین آہستہ سے بولی۔

"نہیں — تمہیں یہ جگہ پسند آئی — ؟" انھوں نے جوزین کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بے حد — !"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے ؟"

"آپ — آپ بے حد پیارے انسان ہیں — میں — میں آپ کو دل سے پسند کرنے لگی ہوں۔" جوزین نے شرماتے ہوئے کہا۔

"سچ — !" سر وحیدالدین جذبات سے پاگل ہو گئے۔

"ہاں — میں دل سے کہہ رہی ہوں۔"

"اوہ جوزین — میں بھی تمہیں چاہتا ہوں — میں — میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں جوزین — میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔" سر وحیدالدین نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"میں — میں لباس تبدیل کر لوں۔" جوزین نے آہستہ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں — ہاں — ضرور — " سر وحیدالدین نے کہا اور جوزین کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ سر وحیدالدین نے اس کے لئے نہایت خوبصورت لباس تیار کرائے تھے — جوزین نے شب خوابی کا لبادہ نکالا — اور مسکراتے ہوئے سر وحیدالدین کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنے لباس کی زپ کھول اور سر وحیدالدین کی کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگا — جوزین نے اوپر کا لباس جسم سے الگ کر دیا تھا — !

سر وحیدالدین کے قدم اس کی طرف بڑھنے لگے — جوزین نے کسی جھجک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا زیریں لباس بھی جسم سے جدا کر دیا۔ اور سر وحیدالدین پاگل ہو گئے — انھوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر جوزین کے نرم بدن کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا — اور جوزین آہستہ سے کسمسائی۔

"لباس تو پہن لینے دیں — "

"جب — جب ہمارے دل ایک ہو گئے — تو — تو یہ پردے کیسے جوزین — ؟" انھوں نے جوزین کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور اسی وقت دروازے کے قریب ایک خوفناک چیخ ابھری۔ دل ہلا دینے والی چیخ — پھر کوئی زور سے زمین پر گرا — اور جوزین بھی سر وحیدالدین کے بازوؤں سے نکل کر دھپ سے زمین پر آ گری۔

سر وحیدالدین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے — اُن کے سارے جذبات سرد ہو گئے تھے — ایک لمحے کے لئے تو وہ پاگلوں کی طرح کھڑے زمین پر پڑی جوزین کو دیکھتے رہے — پھر دوسرے لمحے دروازے کی طرف دوڑے — یہ چیخ نک ہی تھی ورنہ وہ دروازہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے — !

دروازے کے سامنے ہی انھیں ایک جسم زمین پر پڑا نظر آیا اور وہ خوف سے گنگنانے لگے — ! اب ان کی ہمت جواب دے گئی تھی — زمین پر گرا ہوا آدمی کراہ رہا تھا — اور کئی منٹ کے بعد وہ اس کی آواز پہچان سکے۔

"کون ہے — ؟ رمضان — رمضان !"

"مر گیا سرکار — ہائے مر گیا — چلا سرکار — "

"کیا ہوا رمضان — ؟" وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"بس مر گیا سرکار — آپ پر سے قربان ہو گیا — میرے بیوی بچوں کا خیال رکھیں !"

"ابے بیوی کے بچے ہوا کیا — ؟" سر وحیدالدین نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا لیکن رمضان کا خون آلود بازو دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ رمضان کے بازو سے خون رس رہا تھا۔ "ارے یہ کیا ہوا — ؟"

"چاقو — چاقو مار گیا سرکار — ہائے میری آنکھوں میں اندھیرا پھیل رہا ہے۔"

"کون تھا — ؟ کہاں گیا — ؟"

"کوئی چور تھا سرکار — بھاگ گیا — میں نے اسے چہار دیواری سے کود کر اندر آتے دیکھا تھا — میں نے خاموشی سے اس کا پیچھا کیا۔ وہ آپ کے کمرے کی طرف آ رہا تھا اور پھر نہ جانے وہ کہاں چھپ گیا — میں نے سوچا شاید آپ کے کمرے میں گھس گیا ہو گا — میں دروازے تک آیا ہی تھا کہ اس نے میرے اوپر حملہ کر دیا — ہائے — ہائے — میں مرا سرکار — میں مرا — "

"اوہ — !" سر وحیدالدین خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔ کیا وہ چور تھا — ؟ ان کے ذہن نے سوال کیا — یا — یا — نو — اوہ — تو وہ یہاں پہنچ گیا — ؟

سر وحیدالدین کی حالت خراب ہونے لگی — اگر وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے تو — تو پھر وہ خطرے میں ہیں — یہاں وہ تنہا ہیں — بڑی حماقت ہو گئی — انھیں تنہا یہاں نہیں آنا چاہیے تھا — شہر کی کوٹھی میں بہت سے ملازم تھے — وہ ان کے ہاتھوں نہیں بچ سکتا تھا۔

سر وحیدالدین نے رمضان کی طرف دیکھا۔ رمضان شاید بے ہوش ہو گیا تھا — وہ سخت پریشان ہوئے — کیا کریں — ؟ رمضان کو اسی جگہ چھوڑ کر وہ واپس کمرے میں آ گئے — یہاں ایک اور دشواری سے دوچار ہونا پڑا۔ جوزین بھی بے ہوش ہو گئی تھی — !

یہ رات سر وحیدالدین پر بہت کٹھن گزری — رمضان کے بازو پر بہت معمولی زخم تھا — چاقو کا صرف ایک ہلکا سا لگا تھا۔ لیکن وہ کمزور دل تھا اس لئے اسے ہی بہت اہمیت دے رہا تھا — جوزین بھی صبح تک ہوش میں نہیں آئی — بہرحال پہلے سر وحیدالدین نے جوزین کو لباس پہنا کر بستر پر لٹایا۔ پھر رمضان کے بازو پر پٹی کی اور اسے اس کے کوارٹر میں پہنچایا۔ اس کے بعد وہ رات بھر جوزین کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے — صبح کے وقت جوزین کو ہوش آیا تھا ! لیکن وہ سخت دہشت زدہ تھی۔

"نکل چلئے — خدا کے لئے یہاں سے نکل چلئے — وہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔"

"لیکن جوزین — "

"وہ ہم دونوں کو قتل کر دے گا — بس یہاں سے نکل چلئے — "

اور بادل نخواستہ سر وحیدالدین کو واپسی کی تیاریاں کرنا پڑیں۔ ان کے سارے ارمان دل میں رہ گئے تھے — ایسے حالات میں وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ لیکن واپسی کے سفر میں وہ سوچ رہے تھے — کہ — یہ لڑکی بے حد حسین ہے۔ انھیں پسند بھی کرتی ہے — لیکن — اس کا دشمن — اس کا دشمن ایک ٹیڑھی چیز ہے۔ اس کا کیا کیا جائے — ؟

اور پھر اُن کے ذہن میں یہ بھی خیال آیا — کیوں نہ اس لڑکی سے معذرت کر لی جائے — کیوں نہ اس سے نجات حاصل کر لی جائے — لیکن بڑھاپے میں ایک حسین چاہنے والی ملی تھی — کیا سوچے گی اپنے دل میں — !

وہ واپس کوٹھی پہنچ گئے — لیکن اب وہ سخت کشمکش کا شکار تھے — کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی — یہ بھی سوچ رہے تھے کہ جھنجلا یا ہوا وحشی کہیں اُن پر بھی حملہ نہ کر دے۔

انہی حالات وہ سخت پریشان تھے — کھانے کے بعد اپنی خوابگاہ میں آ گئے تھے اور جوزین اپنی خوابگاہ میں تھی — آج وحیدالدین صاحب کے جذبات بھی سرد تھے — کل رات کا تجربہ کافی خوفناک تھا — انھوں نے شراب کی بوتل الماری سے نکالی — شراب گلاس میں انڈیلی اور اس کے گھونٹ لینے لگے۔ کیا کیا جائے — ؟ جوزین کے سلسلے میں کیا کیا جائے — ؟

کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی — دفعتاً انھوں نے جوزین کے دروازے پر آہٹ سنی اور وہ چونک پڑے — شاید جوزین ان کے پاس آ رہی ہے — ! لیکن کیا گفتگو کریں — کیا کہیں اس سے — ؟ وہ انتظار کرتے رہے، لیکن انھیں اپنے دروازے پر کوئی آہٹ نہ سنائی دی — تب جانے کس خیال سے وہ چونک پڑے — دوسرے لمحے وہ اپنے کمرے سے نکل آئے — !

جوزین کی خوابگاہ میں تاریکی تھی — کیا مطلب — ؟ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے سامنے نائٹ بلب روشن کیا تھا — کیا اس کے کمرے کا بلب فیوز ہو گیا۔ کیا — کیا — ؟ انھوں نے جوزین کی خوابگاہ کے دروازے کو دھکیلا — اور دروازہ کھل گیا — تب انھوں نے دروازے کے قریب دیوار پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر انگلی رکھی اور کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔

لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر خوف سے ان کا جسم ساکت ہو گیا — ان کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی — نوجوان اجنبی خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوفناک تاثرات تھے — اس نے جوزین کو ایک ہاتھ سے جکڑا ہوا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال اس نے جوزین کی ٹھوڑی پر رکھی ہوئی تھی — جوزین کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

پنڈت نہرو کی تلوار بازی

ایک مرتبہ مصر کے سفیر مقیم ہندوستان نے پنڈت نہرو سے یونہی تذکرہ کیا۔

"بھلا قدیم زمانے میں تلواروں سے کیسے لڑا جاتا ہو گا ؟"

پنڈت جی فوراً اٹھے — ایک چھڑی اپنے ہاتھ میں لی اور دوسری مصر کے سفیر کو دیتے ہوئے پینترے بدل بدل کر ان کی چھڑی پر وار کرنے لگے۔ سفیر موصوف ان کی اس غیر متوقع حرکت پر سخت حیران ہوئے۔ آخر پنڈت نہرو نے کہا :

"جب آپ کو چھڑی گھمانی نہیں آتی تو تلوار کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔"

"اگر منہ سے آواز نکالی تو لڑکی کے حلق میں سوراخ ہو جائے گا !" نوجوان نے کرخت لہجے میں کہا۔ اور وحیدالدین تھر تھر کانپنے لگے۔ "تم — اس لڑکی کے کون ہو — ؟" وحیدالدین کے ہونٹ ہلے — لیکن ان کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔

"جواب دو — " اجنبی دہاڑا۔

"کوئی — کوئی نہیں — میں اس سے ہمدردی رکھتا ہوں۔" وحیدالدین جلدی سے بول پڑے۔

"ہمدردی — ؟" نوجوان کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اس سے ہمدردی رکھتے ہو — یا اس کی جوانی سے — کیوں — ؟"

"تم — میں اسے پسند کرتا ہوں — "

"تمہیں یہ حق کس نے دیا — کیا اس نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا ؟"

"مجھے معلوم ہے — " وحیدالدین سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

"اس کے باوجود — ؟" اجنبی غرایا۔

"ہاں — اس کے باوجود — کیونکہ — کیونکہ یہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔"

"لیکن — یہ میری زر خرید ہے — اسے پسند کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تم اسے مجبور نہیں کر سکتے — چند غلط لوگوں نے اسے فروخت کیا ہے — اس میں اس کا کیا قصور — "

"اسے اس کے باپ نے فروخت کیا تھا مسٹر — اور میں نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔"

"اس کے باوجود تم اسے کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتے۔" وحیدالدین اس وقت سچے عاشق بن گئے تھے — نہ جانے ان کا خوف کیوں دور ہو گیا تھا

وہ بکہ اس سے قبل انھوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی بہادری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ "میں مجبور کرسکتا ہوں۔ اگر یہ مجھے نہیں ملی تو میں اسے قتل کرسکتا ہوں۔ کیونکہ یہ میری ملکیت ہے۔"

"تم اپنی ملکیت فروخت کرسکتے ہو۔" سر وحید الدین بولے۔

"میں یہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ مجھے بھی پسند ہے۔ کیا تم میری منہ مانگی قیمت ادا کرسکتے ہو۔؟" نوجوان نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور سر وحید الدین کا فرد ابھر آیا۔ وہ گرے پڑے انسان نہیں تھے۔ بات کے لئے بہت کچھ کرسکتے تھے۔

"ہاں ہاں۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔ لیکن اس کے بعد تمہیں اسکا پیچھا چھوڑنا ہوگا۔"

"پانچ لاکھ پاؤنڈ نقد۔" نوجوان نے اس انداز میں کہا جیسے انھیں سر وحید الدین کو دیوالیہ کردیا ہو۔

سر وحید الدین کی عقل نے ٹھوکا دیا۔ اتنی رقم میں تو وہ کئی ایسی لڑکیاں حاصل کرسکتے ہیں۔ کاروباری آدمی تھے۔ جلد بازی میں کوئی حماقت کیونکر کرتے۔ انھوں نے جوزین کی جانب دیکھا۔!

اور۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا۔ ایک حسرت جھلک رہی تھی۔ اس بڑھاپے میں۔ ایک حسین لڑکی انھیں پسند کرتی ہے۔ قیمتاً بہت سی لڑکیاں مل سکتی ہیں لیکن وہ صرف ان کی دولت سے محبت کرسکتی ہیں جبکہ جوزین نے انھیں چاہا تھا۔ اس نے کسی موقع پر ان سے اجتناب نہیں کیا تھا۔ وہ ان کے لئے ہر وقت آغوش وا کئے ہوئے تھی۔ پوری زندگی دولت کمائی۔ عیش کئے۔ کیا ایک بھاری رقم کے عوض۔ ایک محبت بھری لڑکی کا حصول ناممکن نہیں!

"عقل کے ناخن لو بڈھے احمق۔ تم اس لڑکی کے قابل نہیں ہو۔ درنہ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ یہ میری ملکیت ہے۔ میں اسے لئے جارہا ہوں۔ شور مچانے کی کوشش کی۔ تو۔ میں اسے قتل کرکے پھینک دوں گا۔ میں جوان ہوں۔ مضبوط ہوں۔ بے پناہ دولت کما سکتا ہوں۔ اتنے سے نقصان کی مجھے کیا پروا ہوسکتی ہے۔"

"میں تمہاری طلب کردہ رقم تمہیں دے سکتا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟" سر وحید الدین طیش کے انداز میں بولے۔

"خوب۔ خوب۔ تو نہ میری اپنی محبوبہ کو بوڑھے عاشق۔ میں اسے فروخت کرنے کو تیار ہوں۔"

"بولو۔ تمہیں رقم کس طرح چاہیئے۔ جواب دو۔"

"کسی بھی غیر ملکی بینک کے تحت۔ تم مجھے ادائیگی کرسکتے ہو۔ لیکن میں تم سے زیادہ چالاک ہوں۔ تمہاری ہر کوشش ناکام بنا سکتا ہوں۔ کیا سمجھے؟"

"میں اتنی رقم دریا میں پھینک سکتا ہوں۔ کیا سمجھتے ہو۔"

"تو سنو۔ میں اسے لئے جارہا ہوں۔ تم کل شام تک یہ کام کردو میں اسے تمہارے حوالے کردوں گا۔"

"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟"

"ہم اچھے بیوپاریوں کی طرح کاروبار کریں گے۔ سنو۔ تم یہ رقم سوئٹزرلینڈ کے کسی بھی بینک سے میرے بینک کو ٹرانسفر کردو۔ میرا آدمی کاغذات وصول کرنے کے بعد مجھے اطلاع دے دیگا اور اسکے بعد۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"لیکن اگر تم نے بدعہدی کی۔ تو۔؟"

"تمہیں میرا اور میرا اعتبار کرنا پڑے گا۔"

"تو سنو۔ لڑکی کو یہاں چھوڑ دو۔ کل شام تک۔"

"غلط۔ میں کچے بیوپار کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ لڑکی تمہیں مل جائے گی بشرطیکہ۔" نوجوان نے ان کی بات کاٹ دی۔

"میں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں مرجانا پسند کروں گی۔ لیکن۔ لیکن۔" جوزین بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔ اور نوجوان خونخوار نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ پھر اس نے جوزین کو ایک طرف دھکیل دیا اور دلیری سے سینہ تان کر بولا۔ "میرا نام نوڈک ہے جوزین۔ سنو۔ تم دنیا کے کسی گوشے میں چلی جاؤ۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ٹھیک ہے۔ تم یہاں رہو۔ لیکن اگر مجھے میری مطلوبہ رقم نہ ملی۔ اور دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی تو۔ اس بار میں صرف گولی کی زبان سے بات کروں گا۔"

"تم اپنے بینک کا نام بتاؤ۔ میں کل ہی رقم ٹرانسفر کرادوں گا!" سر وحید الدین نے کہا اور نوجوان طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا! پھر اس نے سر وحید الدین کو بینک کا نام بتایا اور پھر وہ انھیں دھمکیاں دیتا ہوا ان کے کمرے سے نکل گیا۔ جوزین دوڑ کر سر وحید الدین سے لپٹ گئی۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

وحید الدین کی عجیب کیفیت تھی۔ عورتوں کے پرانے شکاری نے اس قدر گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک عورت کی قیمت پانچ لاکھ پاؤنڈ۔ پورے پانچ لاکھ پاؤنڈ۔ یہ حقیقت تھی اگر جوزین ان کے پاس نہ رہ جاتی۔ اگر وہ خونخوار نوجوان اسے اپنے ساتھ لے جاتا تو انھیں سوچنے کا موقع مل جاتا۔ اور اس وقت شاید وہ یہی فیصلہ کرتے کہ جوزین سے ہاتھ دھو لینا زیادہ منافع بخش ہے؟ خاموشی سے چند روز کے لئے غم برداشت کرلینا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن سینے سے لگی بلک بلک کر روتی والی یہ لڑکی انھیں متاثر کررہی تھی۔ واقعی وہ مظلوم ہے۔ کیا اسے موت کے شکنجے سے آزاد کرانا مناسب ہے۔ وحید الدین کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ نہ سہی پانچ لاکھ پاؤنڈ۔

اور انھوں نے یہ کڑوی گولی نگل لینے کا فیصلہ کرلیا۔ بہرحال ایک قیمتی محبوبہ بھی سہی۔ انھوں نے جوزین کو تسلی دی۔

"مجھے۔ مجھے اس کے چنگل سے نکال لیں۔ میں اس کے پاس جانے سے مرجانا بہتر سمجھتی ہوں۔"

"کل تمہیں اس سے آزادی مل جائے گی جوزین۔ بےفکر رہو۔" سر وحید الدین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اور درحقیقت دوسرے دن انھوں نے جو کچھ کہا تھا کر دکھایا۔ پورے دن بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ بہرحال۔ رات کو آٹھ بجے انھیں پیغام مل گیا کہ رقم منتقل ہوچکی ہے۔ یہ سارے کام ان کی ساکھ پر ہوئے تھے۔ متضاد کیفیات لئے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ جوزین ان کی منتظر تھی۔ "وہ تین بار فون کرچکا ہے۔ کیا اس کا کام ہوگیا؟"

"ہاں۔ اب ہمیں اس کے چوتھے فون کا انتظار ہے۔" اور یہ انتظار طویل نہ ثابت ہوا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اور سر وحید الدین نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو۔ سر وحید الدین۔"

"بول رہا ہوں۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سودا ایمانداری سے طے ہوگیا ہے۔"

"اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔؟"

"ہرگز نہیں سر وحید الدین۔ میں تصدیق کرچکا ہوں۔ جوزین کو بھی خوشخبری سنادیں۔"

"وہ میرے پاس موجود ہے۔ اور یہ خوشخبری سن رہی ہے۔" سر وحید الدین نے کہا۔ اور منہ بنا کر ٹیلیفون رکھ دیا۔ پانچ لاکھ پاؤنڈ کا گھاؤ بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن جوزین کی پرمسرت مسکراہٹ اس تکلیف کو کم کررہی تھی۔ اور پھر خوابگاہ میں جب وہ جوزین کے مقابل آئے۔ تو اس وقت وہ تکلیف معدوم ہوچکی تھی۔ "جوزین۔!" انھوں نے جوزین کو آغوش میں لیتے ہوئے کہا اور جوزین شرما گئی۔ "اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولے۔

"ہے۔!" جوزین نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔؟"

"انتظار۔ آپ کو چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کیوں۔ کیوں۔؟" سر وحید الدین نے تعجب سے پوچھا۔

"بس۔ ہم کہہ رہے ہیں۔" جوزین نے کہا۔ اور کئی منٹ کے بعد اس انکار کی وجہ سر وحید الدین کی سمجھ میں آئی۔

لاحول ولاقوۃ۔ انھوں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ عورت بھی عجیب مصیبت ہے۔ کم از کم اس بھاری رقم کی کسک تو فوری طور پر مٹنی چاہیئے تھی لیکن مجبوری۔ اور وہ تن بہ تقدیر ہوگئے۔

سر وحید الدین ایک ایک دن گن رہے تھے۔ جوزین اب خوش رہنے لگی تھی۔ وہ کھل کر سر وحید الدین سے اظہار الفت کرتی۔ اب اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن سر وحید الدین ابھی تک اس کا قرب نہیں حاصل کرسکے تھے۔ پانچویں دن انھیں دفتری امور سے نپٹنا مشکل ہوگیا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ آج ان کے بھاری سرمائے اور محنت کا بدل انھیں ملنے والا تھا۔ جوزین ان کی منتظر ہوگی۔ تیز رفتاری سے کار دوڑاتے ہوئے وہ گھر پہنچے۔ لیکن حسب معمول جوزین نے برآمدے میں ان کا استقبال نہیں کیا تھا۔ "جوزین؟" انھوں نے اس کی خوابگاہ پر پہنچ کر آواز دی۔ لیکن اندر سے ان کا ملازم فیض برآمد ہوا۔

"مس جوزین کہاں گئیں۔؟"

"چار بجے چلی گئی تھیں صاحب۔ یہ خط دے گئی ہیں۔"

"خط۔؟" سر وحید الدین چونک پڑے۔ انھوں نے فیض کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ لیا اور پھر اس میں سے پرچہ نکال کر پڑھنے لگے۔

ڈیئر سر وحید الدین۔

روئے زمین پر آپ جیسے نیک انسان موجود ہیں۔ ہمیں گمان بھی نہیں تھا۔ اپنے اچھے مستقبل کے لئے کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ دراصل نوڈک میرا منگیتر ہے۔ ہم دونوں بہت غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم جلد از جلد شادی کرلینا چاہتے تھے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ شادی کے بعد پرمسرت زندگی کے لئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق دولت کسی بھی ذریعے سے نہیں حاصل ہوسکتی تھی۔ تب ہم لوگوں نے دولت کے حصول کیلئے آپکے ملک کا رخ کیا۔ ہمارے سامنے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ لیکن خدا آپ کو سلامت رکھے جو آپ ہمیں مل گئے اور ہم نے آپ کو اپنا پہلا شکار منتخب کرلیا۔ میں آپ تک پہنچی۔ آپکو اپنی کہانی سنائی۔ نوڈک بڑا غیرت مند انسان ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کی محبوبہ کا بوسہ بھی لے سکے۔ چنانچہ پنگی کا کی وجہ آپ کو معلوم ہوگئی ہوگی۔ میں نے نوڈک سے کیا ہوا وعدہ ہمیشہ پورا کیا۔ خوابگاہ میں الیکٹرک شیڈ میں نے خود توڑا تھا۔ باقی کام نوڈک خود انجام دیتا رہا اور۔ آج ہم اپنے وطن واپس جارہے ہیں۔ نوڈک کے ساتھی نے آپکا عطیہ وصول کرکے ہمارے نام سے جمع کرلیا ہے۔ اب ہم وطن جاکر شادی کریں گے۔ بہت خوبصورت ہیں۔ آپ کی عطا کی ہوئی دولت سے ہم ایک جنرل اسٹور کھولیں گے۔ اور پرسکون زندگی بسر کریں گے۔ آپ ایک لاثانی انسان ہیں۔ آپکا اوپر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ خدارا ہمارے بارے میں کوئی بری رائے قائم نہ کریں۔!

آپکی نیک تمناؤں کی طالب

جوزین نوڈک

ختم